

جولائی 2012

بہنوں کا اپنا مانتا ہے

شعاع







- |     |             |     |                |                      |
|-----|-------------|-----|----------------|----------------------|
| 281 | خالہ جیلانی | 28  | رضیہ جمیل      | خط آب کے             |
| 288 | خالہ جیلانی | 270 | سائرہ غلام نبی | مسکراہٹیں            |
| 290 | ادارہ       | 282 | تیسیر نشاط     | ایک تینہ خانے میں    |
|     |             | 273 | شگفتہ جاہ      | بالوں سے خوشبو لوانے |
|     |             | 285 | امت الصبور     | تاریخ کے جھروکے      |
|     |             | 17  | امتنہ زرین     | سیر و جہاں           |

جولائی 2012  
جلد 26 شمارہ 11  
قیمت 50 روپے

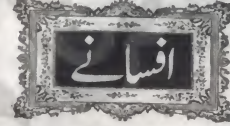
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ان حصوں پر تنقید کی ہے جو کہ شائع کیا - مقالہ: ایڈیٹر ایس۔ سوانحی کرکچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872  
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



- |     |              |                 |
|-----|--------------|-----------------|
| 164 | فائزہ افتخار | سنڈریلا         |
| 184 | صریم عزیز    | زندگی کی رہ گزر |



- |     |           |            |
|-----|-----------|------------|
| 60  | بشری احمد | فیصلہ      |
| 70  | سیمی کرن  | میری الجھن |
| 156 | کنیز نبوی | ممتا       |
| 224 | نعمیہ ناز | بلا عنوان  |



- |     |            |     |
|-----|------------|-----|
| 268 | احمد فراز  | غزل |
| 269 | محسن اسرار | غزل |
| 269 | خالہ معین  | نظم |
| 268 | صغریٰ یوسف | غزل |

ذمہ دار: بک اینڈ ریڈنگ سٹوری  
پاکستان (سلاٹ) - 600 روپے  
ایشیا، افریقہ، یورپ - 5000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا - 6000 روپے

- |    |            |              |
|----|------------|--------------|
| 10 | رضیہ جمیل  | پہلی شعاع    |
| 11 | تنویر بھول | حمد          |
| 11 | سلیم کوثر  | نعت          |
| 12 | ادارہ      | نئی کی باتیں |



- |     |                |       |
|-----|----------------|-------|
| 23  | احسن خان       | بندھن |
| 278 | شاہین رشید     | درستک |
| 276 | نوال افضل گھمن | شاعری |



- |     |             |           |
|-----|-------------|-----------|
| 36  | عالیہ بخاری | دلوار شرب |
| 132 | آمنہ رایان  | سناہ مشام |



- |     |             |              |
|-----|-------------|--------------|
| 228 | نمو احمد    | جنت کچے      |
| 78  | جوبینہ قاضی | اندھیر اجالا |

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹھیکل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



شعاع کا جولانی کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔  
عہد حاضر کی برق رفتاری گنتی دوڑتی زندگی کا ساتھ دینے کی کوشش نے ہماری فطرت سے ہم ہنگام ختم کر دی ہے جبکہ انسان جتنا فطرت سے قریب ہوتا ہے۔ روحانی طور پر اتنا ہی مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ انسان کی روحانی طاقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے قرب سے ہے۔  
اس مہینے ہم پر برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ رمضان المبارک ساری فتن ہورہا ہے۔ اس مہینے میں ہم عبادت کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ گھر وں کی صفائی اور پاکیزگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس ماہ مقدس کی برکتوں سے بھری طرح فیض یاب ہونے کے لیے دل کی صفائی بھی ضروری ہے۔ حمد، کینہ، بغض، نفرت کے جذبات کو دل سے نکال کر انسان اور انسانیت سے محبت کا جذبہ پیدا کر میں تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں۔

### سالگرہ نمبر

اس شمارے کے ساتھ شعاع نے اپنی عمر بزرگ کے 27 سال مکمل کر لیے ہیں سالگت کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریروں کے ساتھ خصوصی سلسلہ بھی شامل ہوں گے۔ مصنفین سے درخواست ہے، اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شعاع میں شامل ہو سکیں۔

### سرورے

- 1- حسب روایت سالگرہ نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے خصوصی سرورے شامل ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔  
آپ سالگرہ کسی طرح منائی ہیں؟ عمر کا ایک سال رخصت ہوتے پر آپ کے احاسات کیا ہوتے ہیں۔ سالگرہ پر پہلنے والا کوئی تحفہ، یا خوبصورت جملہ یا مبارک باد جو آپ کو بہت پسند آئی؟
- 2- شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں کچھ جملے اتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ دل کو چومو لیتے ہیں۔ ایسے دل میں گھر کرنے والے جملے انتخاب کر کے لکھیں۔
- 3- شعاع کب سے پڑھنا شروع کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کیا تبدیلی محسوس کی؟ ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 جولائی تک موصول ہو جالیں۔

### اس شمارے میں

زندگی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہماری نظر صرف ظاہریت تک ہی محدود رہتی ہے۔ ظاہری خوبصورتی سے محروم لوگ ہماری توجہ حاصل نہیں کر پاتے۔ جو یہ قاضی کے اسی حساس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہے۔  
، جو یہ قاضی کا مکمل ناول - اندھیرا آجالا ،  
، مریم عزیز کا ناول - زندگی کی رنگین روشنی ،  
، بشری احمد کینئر نوی، تعمیر ناز اور بی بی کرن کے کھانے ،  
، احسن خان اور فاطمہ احسن کا مستحسن ،  
، بی بی مریم دوجہاں کرنا۔ جیش ایم آر کیانی کی کتاب پر تبصرہ ،  
، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ،  
، ہماری خواہش ہے کہ سالگرہ نمبر میں ہماری زیادہ سے زیادہ قارئین کے نام شامل ہوں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

اے خدا! اے خالق کون مکان!  
تو ہے بے شک بادشاہ دو جہاں!

کس نے ہیں تیرے سوا پیدا کیے؟  
چاند، سورج اور زمین و آسمان

در پہ آئے ہیں ترے، کہتے ہیں اب  
رحم کر ہم پر خدا ئے مہرباں!

سیدھے رستے پر چلا ہادی ہے تو  
ہم کو دکھلا دے تو منزل کا نشان!

بحر و بر کو تو نے ہی پیدا کیا!!  
پھول بوٹوں سے سجایا گلستان!

ہے زباں عاجز تری تعریف سے  
پھول کو بھی اب نہیں تاب بیاں!

تنویر پھول

سارے حرفوں میں اک لفظ پیارا بہت اور یکسا بہت  
سارے ناموں میں اک نام سوہنا بہت اور ہمارا بہت

اس کی شاخوں پہ اگر زمانوں کے موسم بسرا کر ہیں  
اک شجر جس کے دامن کا سایا بہت اور گھنیرا بہت

ایک آہٹ کی تحویل میں ہیں اس زمیں آسمان کی مدیں  
ایک آواز دیتی ہے پہرا بہت اور گہرا بہت

جس دیے کی توانائی ارض و سما کی حرارت دہی  
اس دیے کا ہمیں بھی حوالہ بہت ادا بالابہت

میری پینائی سے اور مرے ذہن سے محو ہوا نہیں  
میں نے روتے محمد کو سوچا بہت ادا چاہا بہت

میرے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں  
میں نے اسم محمد کو لکھا بہت اور بخرا بہت

بے یقین راستوں پر سفر کرنے والے مسافر سوا!  
بے سہاروں کا ہے ایک سہارا بہت اکللی والا بہت

سلیم کوثر



## ظلم کے حرام ہونے اور مظلوم کے دفع کرنے کے حکم کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات مانی جائے۔“  
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔“ اور اب احادیث۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ظلم کرنے سے بچو! اس لیے کہ ظلم قیامت والے دن اندھیروں کا باعث ہوگا اور بخل سے بچو! اس لیے کہ بخل ہی نے ان لوگوں کو ہلاک کیا، جو تم سے پہلے تھے۔ اس بخل نے انہیں اپنوں کا خون بہانے پر اور حرام چیزوں کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔“ (مسلم)

فائدہ : شیخ مال کی شدید محبت کو کہتے ہیں۔ جب انسان کے دل میں دنیا اور دنیا کے مال و اسباب کی محبت حد سے تجاوز کر کے شدید ہو جائے تو پھر انسان حرام حلال کے درمیان تمیز بھی نہیں کرتا اور دوسرے انسانوں کا خون بہانے سے گریز بھی نہیں کرتا۔ جیسے آج ہمارے معاشرے کا حال ہے اور یہ حالت اس بات کی علامت ہوئی ہے کہ اس معاشرے کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ یہ دیر یا سویر ہلاکت سے دوچار ہو کر رہی رہے گا۔

## حق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”تمہیں قیامت والے دن حق والوں کے حق ضرور ادا کرنے ہوں گے حتیٰ کہ سینک والی بکری سے

بغیر سینگوں والی بکری کو بدلہ دلایا جائے گا۔“ (مسلم)  
فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ قیامت والے دن بے لاگ عدل ہو گا حتیٰ کہ جانوروں نے بھی ایک دوسرے پر ظلم کیا ہو گا تو اللہ تعالیٰ مظلوم جانور کی وادری فرمائے گا۔ اس میں انسانوں کے لیے سخت تنبیہ ہے کہ جب بے شعور جانوروں کو معاف نہیں کیا جائے گا تو عقل و شعور سے بہرہ ور ظالم انسانوں کی کس طرح معافی ہو سکتی ہے، اگر انہوں نے دنیا میں ظلم سے توبہ کر کے اس کی تلافی نہ کی ہوگی۔

## زمین پر قبضہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”جس نے ایک باشت کے برابر زمین، تھیا کر کسی پر ظلم کیا تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت والے دن) اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں تھوڑا سا ظلم بھی اور کس کا معمولی سا حق بھی مار لینا قیامت والے دن عذاب شدید کا باعث ہوگا۔

## مہلت

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، لیکن پھر جب اس کی گرفت فرماتا ہے تو اسے نہیں چھوڑتا۔“  
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔  
ترجمہ۔ ”اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ سے جب وہ بستیوں (والوں) کو پکڑتا ہے جب کہ وہ ظالم

ہوتی ہیں۔ یقیناً اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اللہ تعالیٰ اپنی حسب مشیت و مصلحت، ظالم اور گناہ گار کو مہلت دیتا ہے لیکن جب مواخذہ فرماتا ہے تو پھر اس کی گرفت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی، اس لیے ہر شخص کو ظلم و معصیت سے اپنا واسن بچا کر رکھنا چاہیے۔ مہلت سے دھوکے کا شکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پتا نہیں کب اس کی مدت مہلت ختم اور گرفت کا آغاز ہو جائے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے میں بھیجا تو فرمایا:

”تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب سے ہیں۔ چنانچہ تم (سب سے پہلے) انہیں اس بات کی دعوت دینا کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کا اقرار کر لیں۔ اگر وہ یہ بات مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ نے ان پر رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اسے مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال و داروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر تقسیم کر دی جائے گی۔ اگر وہ اسے مان لیں تو (زکوٰۃ وصول کرتے وقت) ان کے عہدہ مال لینے سے اجتناب کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، اس لیے کہ اس کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے اگر جہاد کی نوبت آئے تو قتال سے پہلے انہیں قبول اسلام کی دعوت دی جائے اور پھر انہیں نماز، زکوٰۃ اور دیگر احکام و فرائض کی تعلیم دی جائے۔

زکوٰۃ جس علاقے کے اغنیاء سے وصول کی جائے، اسی علاقے کے فقراء پر تقسیم کی جائے۔ اگر بچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔  
عالمین زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کی وصولی میں ظلم کرنے سے گریز کریں اور لوگوں کی بددعا

کے متفق بن کر اللہ کے غضب و عتاب کے اہل نہ بنیں۔

## سرکاری ملازمین کے تحائف

حضرت ابو حمید عبدالرحمن بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازد قبیلے کے ایک آدمی کو جسے بن تسمیہ کہا جاتا تھا، زکوٰۃ کی وصولی کے لیے عامل مقرر فرمایا۔

چنانچہ جب وہ (زکوٰۃ وصول کر کے واپس) آیا تو کہنے لگا، ”یہ تمہارے لیے ہے (یعنی بیت المال کا حق ہے) اور یہ مجھے بدلے میں ملی ہوئی چیزیں ہیں تو یہ (سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثناء بیان کی، پھر فرمایا۔

”ابا بعد! میں تم میں سے کسی آدمی کو کسی کام کے لیے عامل مقرر کرتا ہوں، جن کا والی و سرپرست اللہ نے مجھے بتایا ہے، تو وہ (واپس) آتا ہے اور کہتا ہے یہ تمہارے لیے ہے اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے لوگوں کی طرف سے دیا گیا ہے۔ یہ اپنے باپ یا مال کے گھر کیوں نہ بیٹھا رہا حتیٰ کہ اس کا ہدیہ اس کے پاس آئے، اگر وہ سچا ہے۔“

(مطلب یہ تھا کہ جس کو یہ ہدیہ کہہ رہا ہے وہ ہدیہ نہیں، یہ اس سرکاری منصب کا نتیجہ ہے جس پر اسے مقرر کیا گیا تھا۔ اگر یہ ہدیہ ہو تا تو اسے گھر بیٹھے بھی لے لے لے) ”اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص کوئی چیز اپنے حق کے بغیر لے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ قیامت والے دن وہ اسے اٹھائے ہوئے ہو گا۔ چنانچہ میں تم میں سے کسی شخص کو نہ دیکھوں کہ وہ اللہ سے ملاقات کے وقت (تاجاڑ طریقے سے حاصل کردہ) اونٹ کو اٹھائے ہوئے ہو، جو بلبلارہا ہو، یا گائے کو جس کی آواز ہو، یا بکری کو جو میاں رہی ہو۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھائے، یہاں تک کہ آپ کی بظلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔



”اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا؟“  
تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔  
(بخاری و مسلم)

فائدہ : اس حدیث میں سرکاری اہل کاروں اور منصب داروں کے لیے بڑی تنبیہ ہے۔ آج کل سرکاری عہدوں سے بڑا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور لوگ ان عہدوں کی وجہ سے ان اہل کاروں اور عہدے داروں کو کثرت سے ہدیے اور تحفے پیش کرتے ہیں۔ اس حدیث کی رو سے یہ تمام مال جو سرکاری عہدوں کی وجہ سے حاصل ہوا یا حاصل کیا جائے، حرام ہے اور رشوت کے زمرے میں آتا ہے، جس کا لیتا اور دیتا دونوں ناجائز امور ہیں۔

### مسلمان کا حق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”جس آدمی پر بھی اپنے (مسلمان) بھائی کا، اس کی عزت و آبرو سے متعلق یا کسی اور چیز سے متعلق کوئی حق ہو یعنی اس کی بے عزتی کر کے یا کوئی اور زیادتی کر کے اس پر ظلم کیا ہو تو اسے چاہیے کہ آج ہی (دنیا میں) اس کا ازالہ کر کے اس حق سے عہدہ بر آہو جائے، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں (ازالے کے لیے) کسی کے پاس دنار و درہم نہیں ہوں گے۔ (اور وہاں ازالے کی صورت یہ ہوگی کہ) اگر اس کے پاس عمل صالح ہوں گے تو وہ اس کے ظلم کے لیے قدرے لے جائیں گے (اور مظلومین میں تقسیم کر دیے جائیں گے) اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی تو اس کے سامنے (صاحب حق) کی برائیاں لے کر اس پر لا دی جائیں گی۔“ (بخاری)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کی گئی سب سے بڑی برائیاں، اگر ان میں دنیا میں معاف نہیں کروایا گیا یا ان کی تلافی نہ کی گئی تو آخرت میں اس کا معاملہ نہایت خطرناک ہو گا جیسا کہ اس کی تفصیل اس حدیث میں ہے۔ اس لیے حقوق العباد میں کوتاہی، جس کی انسان

### پروا نہیں کرتا سخت ہلاکت کا باعث ہے مسلمان کون ہے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کردہ چیزیں چھوڑ دے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : اس سے معلوم ہوا کہ کامل مسلمان وہ ہے جو دوسروں کو (ظاہر یا باطنی) کسی بھی قسم کی اذیت نہ پہنچائے اور حقیقی مہاجر وہ ہے جو اللہ کی نافرمانیوں سے باز رہے۔

اگر کسی نے ہجرت (ترک وطن) کے باوجود اللہ کی معصیت سے اجتناب نہ کیا تو ایسی ہجرت کا کیا فائدہ؟ ہجرت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ اللہ کی رضا کی خاطر ہر چیز کو چھوڑ دیا جائے۔ اب انسان اپنا وطن مالوف، خویش و اقارب اور جائیداد کو کاروبار تو چھوڑ دے لیکن ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب سے وہ باز نہ آئے تو عند اللہ اس کی ہجرت ایک مذاق ہی سمجھی جائے گی۔

### خیانت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان پر ایک آدمی مقرر تھا جسے کرکہ کہا جاتا تھا وہ مر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”وہ جنم میں ہے۔“  
(یہ سن کر لوگ اسے دیکھنے لگے کہ آخر کیا بات ہے) تو صحابہ رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس ایک عبا (سیاہ و ہاریوں والی چادر پائی) جسے اس نے (مالِ عنیت سے) چرایا تھا۔ (بخاری)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ خیانت اور چوری کبیرہ گناہ ہے، جس کی وجہ سے انسان حقیقی جنم فرمایا سکتا ہے۔

### حرمت

حضرت ابو بکرہ نفع بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”بے شک زنا گھوم گیا ہے اپنی اسی حالت پر جس میں اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ (یعنی روزِ آفریش سے جس طرح سال اور مہینے تھے آپ پھر وہی ہیئت قدیمہ لوٹ آئی ہے اور مشرکین عرب اپنی طرف سے جو مہینوں میں تقدیم و تاخیر کر لیا کرتے تھے اور نئے وہ نسب ہی کہا کرتے تھے اب اسے ختم کر دیا گیا ہے۔) سال کے بارہ مہینے ہیں۔ ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ تین پے درپے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور (چوتھا) مضر قبیلے کا رجب جو جمادی (الثانی) اور شعبان کے درمیان ہے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”یہ کون سا مہینہ ہے؟“  
ہم نے کہا۔ ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ اور نام سے اسے پکاریں گے۔  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟“ ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”یہ شہر کون سا ہے؟“  
ہم نے کہا۔ ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے اسے پکاریں گے۔  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا یہ شہر مکہ نہیں ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم (پھر) پوچھا۔ ”یہ دن کون

### سارے؟

ہم نے کہا۔ ”اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے اسے پکاریں گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔  
”کیا یہ قربان کا دن (10 ذوالحجہ) نہیں ہے؟“  
ہم نے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بے شک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں (تمہارے درمیان آئیں) اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن کی حرمت تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینے میں ہے اور غنقریب تم اپنے رب سے ملو گے۔ وہ تم سے تمہارے اعمال کے متعلق باز پرس کرے گا۔ خبردار! تم میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارو! سن لو! جو یہاں حاضر ہے، وہ غائب کو (یہ باتیں) پہنچا دے، اس لیے کہ شاید وہ شخص جسے یہ باتیں پہنچائی جائیں، ان سے زیادہ یاد رکھے والا ہو جنہوں نے (براہ راست مجھ سے) سنا ہے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”خبردار! (میری بات سنو اور بتاؤ) کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟“  
ہم نے کہا۔ ”ہاں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے اللہ! گواہ ہو جا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : سالوں اور مہینوں کا یہ تعین (کہ مہینہ 30 یا 29 دن کا اور سال بارہ مہینوں کا ہو تا ہے وغیرہ) اس دن سے ہے جب آسمان و زمین کی تخلیق کی گئی اور اس کی وضاحت سے مقصد اہل جاہلیت کے طریقہ ”نسبی“ کا بطلان ہے۔

آپس میں ایک دوسرے کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ناید اور ان کی حرمت کا بیان۔



قیامت والے دن بارگاہ الہی میں باز پرس کی یاد دہانی۔

سے افضل ہے۔

ایک آدمی کہتا ہوا اور کہا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ فرمائیے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف کر دیے جائیں گے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔ ”ہاں، اگر تو اس حال میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جائے کہ تو صبر کرنے والا، ثواب کی نیت رکھنے والا اور دشمن کی طرف رخ کر کے لڑنے والا ہو، نہ کہ پیٹھ دکھا کر بھاگنے والا۔“

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تو نے کیسے کہا تھا؟“

اس نے کہا۔ ”یہ بتلائیے! اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہاں، اگر تو قتل کر دیا جائے جب کہ تو صبر کرنے والا، اللہ سے ثواب کی امید رکھنے والا اور دشمن کی طرف رخ کر کے لڑنے والا ہو، پیٹھ دکھا کر بھاگنے والا نہ ہو۔ سوائے قرض کے (کہ وہ معاف نہیں ہو گا) اس لیے کہ جبریل نے مجھ سے یہ کیا ہے۔“ (مسلم)

فائدہ: اس سے بھی حقوق العباد اور قرض کی اہمیت واضح ہے کہ یہ کسی صورت معاف نہیں ہوں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر مسلمان حقوق العباد میں کوتاہی سے اور قرضوں کی ادائیگی میں تساہل سے گریز کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام وحی کا درجہ رکھتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی منشا کے بغیر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی معاملے میں اصلاح کی ضرورت ہو تو جبریل امین تشریف لا کر اصلاح فرمادیتے۔



بیٹھ کر سید و جہان کننا

## تفکر پر کشش

مصنف: جسٹس ایم آر کیاقی  
تبصرہ: آہستہ فزین

اضافہ تو کرتی ہے، مگر جب تک کتاب آپ کے ہاتھ میں رہتی ہے، مختلف آپ کے ساتھ رہتی ہے۔  
بڑی شخصیت ہونے کا مطلب آج کل وی آئی پی ہے۔ لیکن حقیقی طور پر بڑی شخصیت سے متعارف ہونا، ایک دل نواز تجربہ ہے۔ سوچیں! اسادگی سے بیان کیا گیا یہ واقعہ، جو دراصل انہوں نے اردو زبان کے رسم الخط میں تبدیلی کے سوال سے مراد کیا تھا۔ آج آپ ایسے واقعات کی پرچھائیں بھی ڈھونڈنے نکلیں۔ تو نڈھال ہو جائیں۔

”ہمارے خاندان میں پشت در پشت بلکہ ایک ہی پشت میں بھی بزرگوں کے گہڑے پہننے کا رواج تیرکا قائم ہے۔ 1935ء میں میری ایک لڑکی لاہور میں مسیح و مریم کے کانوٹ میں پڑھتی تھی۔ وہاں اس کو پہننے کے لیے شامی نیل کا یونیفارم ملا تھا۔ جب وہ یونیفارم کے سائز سے بڑھ گئی تو اس کے چھوٹے بھائی نے اسے پہننا شروع کر دیا۔ وہ اس کانوٹ میں تو نہیں تھا۔ مگر کپڑا گرم بھی تھا اور نرم بھی۔ ساری سردیوں میں کام آیا۔ جب وہ بھی بڑھ گیا تو قریباً ”سات سال کے بعد اس سے چھوٹے بچے نے پہنا۔ میں بچوں کے نام اس لیے نہیں لے رہا کہ اگر اسکولوں اور کالجوں میں انہیں شرر بننے چھپڑیں تو وہ کہہ سکیں گے کہ یہ میرے دوسرے بھائی کے متعلق لکھا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کا یہ حال ہے کہ جب کبھی میں اپنے والد کے پرانے بوٹ پہنتا تھا تو جماعت کا خود ساختہ لیڈر میری ہنسی اڑاتا تھا کہ اس بے چارے کو نئے بوٹ نہیں ملتے۔ لیکن وہ خود اپنے دادا کے وقت کی مشدیدی لنگی

برجستہ، بر محل اور بستے پانیوں جیسی رواں گفتگو سننے کی بجائے اگر پڑھنے کو ملے تو اس کا نام ”افکار پریشال“ ہی ہو سکتا ہے۔

جسٹس ایم آر کیاقی، جن کا نام اور مقام عدلیہ کی تاریخ میں آج تک وقار کی علامت ہے، جن کے درد دل نے ذہنوں کو بار اور دلوں کو مایوسی کے بجائے حوصلہ اور ہمت عطا کیا۔

وطن عزیز کا گلستان کھلتے ہی صیاد کے زیر عتاب آگیا اور قبضے کی ایسی داغ نیل ڈالی کہ مدتوں سفر طے کرتے رہنے کے بعد بھی ہمیں منزل سے دوری نصیب ہوتی رہی۔

مارشل لاء کا ابتدائی دور امیدوں، امنگوں کو بجھا دینے کا عملی دور تھا۔ ایسے میں جب آواز، اظہار پر پابندی، تحفظ اور مایوسی کا باعث بن رہی تھی، جسٹس صاحب کی تقریر یوں نے لوگوں کی ہمت بندھائی۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

”اور آپ دیکھتے ہیں کہ ذہن بشری پر اگر زیادہ دباؤ پڑے تو وہ پست خیالی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ایک قوم اس طرح نہیں بنی کہ اس میں دس پندرہ آدمی تو بلند خیال ہوں اور باقی ملک میں ہمیں بلند خیالی پیدا ہو تو اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔“

تقریر یوں پر مشتمل یہ کتاب پڑھ کر آپ ایک ایسی ناہفہ روزگار شخصیت سے شناسائی حاصل کرتے ہیں جو اصول، اخلاص اور صداقت کا پیکر تھی۔ جس کے دل میں ملک و قوم کے واسطے درد مندی اور فکر رچی بسی تھی اور ایسی شخصیات سے محرومی آپ کی محرومی میں

## چوری

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب خیبر والا دن ہوا (یعنی جنگ خیر ہوئی) تو اصحاب رسول میں سے کچھ آدمی آئے اور انہوں نے کہا کہ فلاں شخص شہید ہے اور فلاں شہید ہے۔ حتیٰ کہ ایک آدمی کے پاس سے وہ گزرے تو کہا فلاں (بھی) شہید ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ہرگز نہیں۔ میں نے ایک چادر کی وجہ سے جو اس نے چرائی تھی اسے جہنم میں دیکھا ہے۔“ (مسلم)

فائدہ: معلوم ہوا کہ حقوق العباد شہادت سے بھی معاف نہیں ہوں گے۔ نیز مسلمانوں کے مشترکہ مال (قومی خزانے) میں خیانت بہت بڑا جرم ہے۔

حضرت ابو قتادہ حارث بن ربیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں کھڑے ہوئے اور ان کے لیے ذکر فرمایا۔ ”اللہ کے راستے میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا سب عملوں



پہن کر آتا اور میں صرف مسکراتا تو وہ کہتا تھا کہ اگر ہم بزرگوں کا نام روشن نہ کریں تو اور کون کرے گا۔ قصہ! اب پچھلے سال انیس سو ساٹھ میں پچیس سال گزرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہی یونیفارم میرے بڑے بھائی کے بڑے لڑکے کے بڑے لڑکے نے پہنا ہے۔ وہی اسد جس کو بعض باتیں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ غالباً ”اردو کو رو من بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے مغرب کے لیے دل پذیر بنایا جائے مگر آپ بھول رہے ہیں کہ کسی زبان کی اہمیت اس کی اپنی خوب صورتی سے نہیں بڑھتی، اس کے بولنے والوں کی خوب صورتی سے بڑھتی ہے۔ جب آپ اخلاقی طور پر صحت مند ہو جائیں گے تو آپ کی قومیت کا اعتبار قائم ہو جائے گا اور دنیا آپ کی اردو بھی دیکھے گی اور اس کے رسم الخط کے خرقے بھی اٹھائے گی۔ کاف کاہل اور قاف قندھار کے باریک فرق کو دیکھ کر لوگ کہیں گے سبحان اللہ! محض حروف کے امتیاز میں یہ لوگ کتنی دور چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی اپنی اصل پر نظر ہے۔ ورنہ کاف کاہل کے بجائے کاف کش کش اور قاف قندھار کی بجائے قاف بد قسمت زیادہ موزوں ہوتا۔ کیونکہ یہ کش کش جو بیخ اور باختر کی جانب سے اٹھتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ واقعی قسمت کی ستم گردی ہے۔ الغرض جب ہم صحت مند ہو جائیں گے تو اردو کی ساتھ اتنی بڑھ جائے گی کہ گندھارا سنگھ بھی تعریفی لہجے میں کہنے لگے گا۔ ”اردو دیاں فوجاں آئیاں۔“ دیکھیے! واقعاتی حقیقت کو بیان کی لطافت کیا رنگ عطا کرتی ہے۔

”ایک شام میں اندھیرے میں سڑک پر جا رہا تھا۔ اندھیرے میں سے آواز آئی اور آواز کے پیچھے ایک آدمی کی شکل نظر آئی۔ اچھا خاصا نوجوان تھا۔ گہڑے بھی اچھے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ ”مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے“ مگر بیوی کو مرضِ دق ہے اور علاج کے لیے پیسہ نہیں۔“ میری جیب میں پانچ روپے تھے۔ مستحق تو زیادہ کا تھا۔ مگر وہی دے دیے۔ یہ پانچ روپے کا اعلان اس لیے کرتا ہوں کہ اگر آپ میں سے کسی نے مجھ پر اندھیرے میں حملہ کیا تو پانچ روپے سے

زیادہ نہیں ملیں گے اور پھر بدنامی الگ ہوگی۔ اب تو مجھے پانچ روپے رکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کچھ دنوں بعد مجھے پھر اس سڑک پر قریباً ”اسی وقت جانے کا اتفاق ہوا۔ اندھیرے میں سے پھر آواز آئی۔ ”مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے“ مگر میرے بچے کو فاجعہ ہے۔ دو سال کا تھا جب اس کی ماں چل بسی تھی۔“ میں نے شرمائے کی آواز پہچان لی اور کہا کہ ”ان کو تو کچھ دن پہلے دق کی بیماری تھی نا؟“ اس نے بھی میری آواز پہچان لی اور کہا ”مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے“ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ وہی ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔“

اس کے بعد کئی سال تک یہ آواز نہیں سنی۔ اب کوئی تین مہینے ہوئے ہوں گے کہ ایک ہشت سالہ بچے سے پھر یہی فقرہ سنا۔ اس کا نام اسد ہے۔ میرے بڑے بھائی کے بڑے لڑکے کا بڑا لڑکا ہے۔ اس نے کچھ جنت کے بیچ زمین میں پھینکے تھے جو مینہ بھر میں سات آٹھ فٹ اونچے ہو گئے۔ بعض پودے جلد اونچے ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان بھی جلدی اونچے ہو جاتے ہیں۔ مگر جنت کی جڑ استوار نہیں ہوتی۔ کسی بھی ایسی چیز کی جڑ استوار نہیں ہوتی جو جلدی سے اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ کو بھی اپنی جڑیں اپنی بنیادیں استوار کرنی چاہئیں۔ آپ تو ماشاء اللہ اونچے درختوں کی طرح ہیں جن کی اصلاح آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ اپنے بچوں کی بنیادیں راستی پر رکھیں۔ ان کی نشوونما میں کوئی ٹیڑھی نہی نظر آئے تو اسے کاٹ دیں۔ درخت سیدھا اٹھے تو خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے سوچا ہے کہ سیدھے کے سارے محاورے نیکی کے ہیں۔ مثلاً ”سیدھا گھر خدا کا“ سیدھی بات کرنا، سیدھی چال چلنا اور ٹیڑھا پن کے سارے محاورے بدی کے ہیں۔ مثلاً ”ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنا“ ٹیڑھی چال اور ٹیڑھی کھیر۔ اور اگر میرے افکار یوں ہی پریشان رہے تو تھوڑے دنوں میں فرنی بھی ٹیڑھی ہو جائے گی۔

بات جنت کے بودوں کی ہو رہی تھی جو چھوٹے اسد نے کاشت کیے تھے۔ وہ مجھے جیجو (جی جو) کے نام

سے نکارتا ہے۔ اس لفظ کا نہ کوئی ماخذ ہے اور نہ ہی اس کے کوئی معنی ہیں۔ شروع میں ایک بچے نے بولنے کی ابتداء اس طرح کی کہ مجھے جیجو کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد سارے بچے سنت طفلان کے طور پر یہ نام دہراتے رہے۔ دوسرے لڑکے نے نعم البدل کے طور پر مجھے بیون (ب پ و ن) کہا۔ والد مرحوم نے سنا تو فرمایا کہ ”بچہ بیون کہنا چاہتا ہے جو کسی زبان میں بندر کو کہتے ہیں۔“ ساتھ ہی فرمایا کہ ”لڑکے ہو شیار ہوتے ہیں“ بچپان لیتے ہیں۔ ”لڑکا بچ ہو شیار تھا۔“ آخر کیوں نہ ہو۔ جب ذرا زیادہ ہو شیار ہوا تو۔۔۔ بیون کہنا چھوڑ دیا۔“

اپنی ذات کو اسی سہولت سے ہر نشست میں طنزو مزاح کا نشانہ بناتے رہنا، ان کا خصوصی وصف تھا۔ آج تو یہ سوچنا بھی محالات سے ہے۔

اقبال کا نظم رکھتے تھے۔ اور اقبال شناس قرآنِ فہم نہ ہوسکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور قرآن فہمی رکھنے والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملی محبت نہ رکھتا ہوسکتا۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ معاشرت سیاست اور فکر کی دنیا سے کہیں زیادہ گہرا انقلاب وہ تھا جو حضور رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کی دنیا میں پیدا کر دیا تھا اور اس کا حقیقی ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند ترین کردار اور مقدس ترین سیرت تھی۔ جو گہرا اثر انہوں نے اپنی قوم پر ڈالا۔ اپنے اعلا کردار سے ڈالا۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ گہرا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو خود بازار سے سودا لانا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ جب کوئی فرشتہ ان کے پاس آتا ہے تو کیوں اسے بربزی خریدنے کے لیے نہیں بھیج دیتے؟ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کے بازار میں جا کر بربزی یا پڑا خریدنے کو آپ کے تجل پر غمخوار کرتے ہیں۔ یہاں ایٹ آباد میں میرے گھر سے ملحق ایک سڑک گزرتی ہے۔ جس پر آنے جانے والے مجھے مالی کا کام کرتے دیکھتے ہیں۔ ایک شخص نے ایک دفعہ ہمدردی سے پوچھا کہ آپ کے پاس مالی نہیں ہے؟ میں نے

کہا ہے تو۔ مگر میں خود بھی کام کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا۔ ”آپ خود کیوں کام کرتے ہیں؟ آپ کے ہاتھ سخت ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ہاتھ سخت ہو جائیں تو دل نرم ہو جاتا ہے اور پھر کیا معلوم کہ آگے جا کر دنیا کی کیا حالت ہو۔ زمانے نے کوئی انقلابی کڑوٹ لی تو میں اپنے ہاتھوں کے چھالے دکھا کر یہ کہہ سکوں گا کہ میرے تو ہاتھ بھی مزدوروں کے سے ہیں اور دل بھی مزدوروں کا ہے کیونکہ میں بھی کبھی کبھی کام سے جی چراتا ہوں۔“

جب کسی دہسائی اور مزدور میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا اچھا نہیں تو اس کام پر اس کو فخر کیا خاک ہو گا۔ یہ باتیں ہیں جو آپ عید میلاد کے علاوہ بھی جہاں بیٹھیں، لوگوں سے کہہ سکتے ہیں تاکہ ان میں وہ ذہنی انقلاب پھر رہا ہو جو کسی اور نے اپنے کردار سے پیدا کیا تھا۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ وہ جو کی روٹی کھاتے تھے۔ یہ البتہ آپ بلند آواز سے کہیں کہ وہ دنیا والوں کا کردار اپنی مثال سے بناتے رہے۔ ایک مثال امانت اور دیانت کی تھی جس کی وجہ سے وہ امانت کھلائے۔ ایک ان کے پاس ذہنی امانت تھی جو آپ کے پاس بھی ہے اور آج میں اس امانت پر زور دینا چاہتا ہوں۔ یہ امانت عقل کی تھی جو بچ بولنے کی تلقین کرتی ہے اور ذہنی خیانت سے منع کرتی ہے۔ بس آپ یہ چھوٹی سی بات اپنے ذمہ لے لیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ ایک بڑی قوم بن جائیں گے۔

مگر اس وعدے سے جو میں آپ سے کر رہا ہوں کہ اگر آپ ذہنی امانتوں میں راست باز ہو جائیں تو ایک بڑی قوم بن جائیں گے، مجھے اس کا وعدہ دیا جو اس نے کسی بے نمازی سے کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر چالیس دن متواتر نماز پڑھو تو انعام دیں گا۔ جب چالیس دن نماز پڑھنے کے بعد وہ انعام کے لیے آیا تو ملنے لگا۔ ”اے الٰہی دم اور گردے کے سم! میں نے تو تمہارے فائدے کی بات کی تھی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ چالیس دن نماز پڑھ لی تو ایسی عادت پڑ جائے گی کہ پھر نہیں چھوڑو گے۔ نماز کی عادت خود تمہارا بہترین انعام ہے۔“ بے نمازی نے کہا۔ ”تو تمہارا آپ نے



میرے ساتھ دھوکا کیا اور آپ وعدہ خلافی بھی کر رہے ہیں۔ چلو! نہ سہی۔ میں نے بھی نمازیں بغیر وضو کے ہی پڑھی تھیں۔“

موضوع سے مربوط بر محل قصے اور لطیفے آپ کو تاڑی کا احساس دلاتے ہیں اور تو انائی کا دل نہیں احساس آپ کو اپنے حصار میں لیے رہتا ہے۔

”پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک شوریدہ سرشاعر نے جو ریلوے میں ملازم بھی تھا بڑے درد سے کچھ شعر کے جن میں ایک یہ بھی تھا۔

دیکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف قائد اعظم کا پاکستان دیکھ!

میں ان دنوں حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ وہ مجموعہ اشعار میرے پاس آیا کہ ”ہیو! اس پر کون سی دفعہ لگتی ہے؟“ میں نے کہا کہ ”خدا کے بندے! وہ تو صرف یہی کہتا ہے کہ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو؟ پاکستان کی طرف دیکھو۔ کیا یہ وہی ملک ہے جو قائد اعظم نے تراشا تھا۔ اگر آپ اس کے منہ کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں تو خوشی سے دیکھیں۔“

ایک زمانہ تھا کہ میں خود بھی گانا تھا یعنی حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ جب بھی حکومت کسی مشکل میں ہوتی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ قانونی طور پر رائے دینی ہوتی تھی اس لیے اکثر خاموش رہتا۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے خود کم علم ہوتا تھا۔ خصوصاً جب پریس ایکٹ کے بارے میں مجھ سے سوال کیے جاتے۔ ”جہاں فرمائیے کیانی صاحب! یہ فلاں اخبار بہت تنگ کر رہا ہے۔ اس کا کیا تدارک کریں؟“ میں کہتا۔ ”ضمانت ضبط کر لیجئے۔“ وہ پوچھتے کہ ”اگر اس نے ہائیکورٹ میں درخواست دے دی تو پھر؟“ میں کہتا ”درخواست تو ضرور منظور ہوگی۔“ وہ پوچھتے۔ ”پھر کیا کریں؟“ میں کہتا پھر ضمانت ضبط نہ کیجئے۔“ دیکھا! کیسی اچھی رائے دی۔“

”میں مترادف الفاظ کی مثال دے رہا تھا۔ مذکر‘ مونث اور پٹھانوں وزیروں کے جھگڑے میں خواجہ خواجہ پڑ گیا۔ وکیلوں کو چھوڑ کر عام لوگ تو مترادف الفاظ کو اتنی جلدی سمجھتے ہیں کہ بعض ان میں سے عدالت کو

بے انصافی کا مترادف تصور کرتے ہیں۔

ہم تو ابھی تک عدل و انصاف کی پگڈنڈیوں پر چل رہے ہیں۔ شاہراہیں تو ہیں ہی نہیں۔ شاہراہوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اور ہم مل کر کوشش کریں۔ زندگی کے ہر شعبے میں دیانت داری سے کام لیں۔ دفتروں میں باتوں سے زیادہ کام کریں، ہل چلانا ہو تو زمین کو زیادہ خودیں لڑکوں کو پڑھانا ہو تو اس طرح پڑھائیں کہ چھٹی کے دن بھی ہمدرد سے کے خواب دیکھا کریں۔“

نصف صدی بیت گئی۔ امید اور خواب کی کیفیت سے نکل کر ہم امید و بیم کی حالت میں جا پہنچے ہیں۔ تسمو کرنے کو بہت کچھ ہے مگر کتاب کی شکستگی کا مزا کرنا ہو جائے گا۔

”اس سے پہلے اگر آپ اپنے دل میں استقلال کی گرمی پیدا کریں اور پھر بغداد کی طرح ڈاکوؤں کے سامنے اور میری طرح گھر کے اندر بھی بچ بولنے میں تامل نہ کریں اور خیانت کو کسی شکل میں دیکھ کر خون نہ سہی“ آنسو ہی بہا میں تو آپ قوی حیثیت سے آپ وہ کچھ بن جائیں گے کہ خون بہانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“

نصیحت پر کان دھرے ہوتے تو آج۔۔۔ یہ حال نہ ہوتا!

ان کی بیشتر تقاریر یوم اقبال کے موقع کی ہیں۔ ہر دفعہ نئے خیال اور نئے طرز کی ہم لے۔

بے فوق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو گر مگر جو کچھ کرنا ہو وہ اس طرح کرو کہ اس میں ایک ولولہ نظر آئے اس میں تڑپ پیدا ہو۔ جیسے کسی کھوٹی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی بے قراری ہو۔ اس کام کے لیے وہ جسم کو چھوڑ کر روح کو مامور کرتا ہے کیونکہ جسم روح کے زور سے چلتا ہے اور جسم زوال پذیر ہے۔

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس ورنہ اس صحرا میں کیوں نالائ ہے یہ مثل جرس طنہ اور لطیف انداز اختیار کرتے ہوئے

”مفسرین کے کہنے کے مطابق گم گشتہ سے متروکہ جائیداد مراد ہے جیسے آموں کا بیغ یا رانگی مکان۔ میں ابھی ایک گائے گورو اسپور میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں وہاں کے ناظر نے لکھا کہ ”وہ طغیانی میں بہہ گئی ہے۔“ یہاں سے ایک ہندو دوست نے جاتے ہوئے اپنی گائے دی کہ یہ کسی تعالیٰ کے ہاتھ لگ جائے گی۔ اس سے تو آپ بہتر ہیں۔“ بعد میں جب میں نے سنا کہ گورو اسپور والی گائے طغیانی میں بہہ گئی ہے تو سوچا کہ بہہ کر ادھر ہی نکل آئی ہوگی۔ ممکن ہے وہی گائے ہو، زیادہ غسل کرنے سے صرف رنگ تبدیل کیا ہے اور رفتہ رفتہ یقین ہو گیا کہ یہ وہی گائے ہے کیونکہ دودھ بھی ویسا ہی سفید تھا۔ مکان نہ ملا تو گائے ہی سہی۔“

کابلی گدلانی اور بے عملی کی تیغ بینی پر زور دیتے ہوئے جسٹس صاحب نے باتوں ہی باتوں میں یہ راز بھی افشا کیا کہ ہر سال سالانہ سرکاری سبجری کے باوجود ہمارے درختوں میں آخر اضافہ کیوں نہیں ہوتا؟ کریشن کے لہلہاتے دور کا آتما زائنا رہا ہو چکا تھا،

اب آخر میں خاصے کی چیز کے طور پر 21 اپریل 1962ء کو کی گئی پچسپ، مفصل جامع اور آسان قسم تقریر میں سے اقتباسات جو فکر کو جلا بخشتے ہیں، خودی کی وضاحت کرتے ہیں اور سوچ کے نئے امکان پیدا کرتے ہیں۔ اگر آپ بھی چاہیں تو۔

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کس طرح اس نتیجے پر پہنچے مگر آخری نتیجہ یہی تھا کہ اسلام ایک جاہل حیات ہے۔ اسلام عمل سکھاتا ہے، حقیقت سے منہ نہیں موڑتا۔ حقیقت کی تلاش میں جس قلبی کے ذریعے ان مقامات تک پہنچا ہے، جہاں حواس خمسہ کے ذریعے سے نہیں پہنچ سکتے اور آخری حقیقت کو خدا کہتے ہیں۔ چونکہ حقیقت کی تلاش انسان کا کام ہے اس لیے مذہب زندگی کا ایک ضروری جزو ہے اور ان سب مشکل باتوں کی تشریح دراصل خودی کی ایک تشریح ہے۔

مجھے بھی شک ہوا کرتا تھا کہ ”خدا“ کا لفظ خود سے نکلا ہے مگر اب یہ کتاب پڑھ کر یقین ہو گیا ہے۔ ان بے پایاں چیزوں میں سب سے پہلے چیز جس پر

اقبال کی نظر پڑتی ہے، وہ قرآن ہے۔ اس کے نزدیک قرآن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان میں اس بات کا شعور پیدا کرے کہ اس کے تعلقات خدا سے ایک طرف اور کائنات سے دوسری طرف کیا ہیں۔“

”اسلام مادی دنیا سے گریز نہیں کرتا بلکہ اس کی تسخیر کر کے کوئی ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جس پر زندگی کی عمارت بایلوں میں نہیں بلکہ زمین پر کھڑی کی جاسکے آپ سمجھیں گے کہ میں ایسی بات کر رہا ہوں کیونکہ مادی دنیا کی تسخیر مسلمان تو نہیں کر رہے اور لوگ کر رہے ہیں۔

اقبال کہتا ہے اور میں بھی ادب کے ساتھ تائید کرتا ہوں کہ تعلیم قرآن یہ ہے کہ ان چیزوں کی حقیقت فکر کے ذریعے سے معلوم کر۔

(ترجمہ) ”تمہیں کان آکھ اور دل دیے۔“ کانوں سے تو سنتے ہیں۔ یہ ایک ذریعہ ہے، تحصیل علم کا دل سے آپ کیا کرتے ہیں، سوچتے ہیں۔ یہ دیکھئے! حواس خمسہ کے علاوہ ایک اور ذریعہ علم کے حاصل کرنے کا پیدا ہوا، بلکہ یوں سمجھئے کہ اس سنگ و خشت سے جن کا علم آکھ، کان اور دیگر حواس فراہم کرتے ہیں، دل کا معیار کوئی اور عمارت کھڑی کر دیتا ہے اور خدا اسی لیے کہتا ہے کہ دل بھی دیا ہے۔

اگر سورج اور چاند کو دیکھ کر آپ کو یہی کرنا تھا کہ اللہ کو مبارکباد دیں کہ تو نے بہت اچھا دستور قائم کیا ہے تاکہ وہ خوش ہو کر ایک اور چاند پیدا کر دے جو لاہور کی سیکیلوں کے خراب ہونے پر کام آئے تو بحیثیت ایک غیر جانب دار تماشائی کے مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اللہ کی خودی نے تو خدا کی اختیار کر لی، مگر آپ کی خودی گدلانی کے جذبے سے آگے نہیں بڑھی اور اگر یہی بات سمجھی تو پھر خدا نے کیوں کہا کہ یہ مخلوق بے کار ٹھیل کے طور پر پیدا نہیں کی ہے۔ پھر کیوں کہا کہ زمین و آسمان کو آپ کے لیے مسخر کیا ہے۔ زمین کو مسخر کرنے کے معنی تو یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ اس میں کھیتی باڑی کریں۔ زمین نہایت فرماں برداری سے آپ کو فصل دے گی۔

سورج کی تسخیر آپ کس طرح بیٹھے بیٹھے کریں





بندھن

احسن خان بہار قاضی احسن

شاہین رشید

”گھر میں تو کم ہی ٹائم دے پاتے ہوں گے فیملی لائف کو مِس تو کرتے ہوں گے؟“  
 ”بالکل! مِس کرتا ہوں۔ شہر سے باہر اور ملک سے باہر تو مجبوری ہوتی ہے لیکن جب میں لاہور میں ہوتا ہوں تب فیملی لائف ڈسٹرب نہیں ہوتی اور بیٹی کو دیکھ کر تو لگتا ہے ساری محنت وصول ہو گئی ہے۔“  
 ”شادی پسند کی تھی آپ کی؟“

”آپ ہماری شادی کو پسند اور ارجح کہہ سکتی ہیں۔ کیونکہ میری فیملی اور میری مسز قاضی کی فیملی کے آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے تو آنا جانا لگتا تھا۔ قاضی سے بھی پہلو ہائے ہو جاتی تھی۔ پھر جب گھر والوں نے رائے کو پوچھی تو میں نے انکار نہیں کیا کیونکہ مجھے بھی قاضی اچھی لگتی تھی۔ بس اس طرح ہماری بات پکی

فکار جب بہت زیادہ مشہور ہو جائیں تو پھر ان کے پاس بات کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ احسن خان بھی آج کے دور کے مصروف ترین فکار ہیں۔ اس لیے ”بندھن“ کے لیے ہم نے ان سے زیادہ وقت نہیں لیا۔

”کیسے ہیں۔ بہت مصروف رہتے ہیں؟“  
 ”جی الحمد للہ! بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ کی دعا سے کافی مصروفیات ہیں۔ آج کل کافی کام ہو رہا ہے۔“

”شادی شدہ لائف کیسے گزر رہی ہے؟“  
 ”ماشاء اللہ بہت اچھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک عدد پیاری سی بیٹی بھی عطا کی ہے جس کا نام سکینہ ہے۔ اب وہ تقریباً چار سال کی ہو رہی ہے۔“

ہونا تھا، ہو جاتا، جس کی قسمت میں چوری ہوتی، ہو جاتی۔ اور خدا نے انسان کو قرآن کے مطابق ایک ذمہ دار شخصیت عطا کی ہے جو اپنے افعال کی مختار ہے۔ وہ کسی اور کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ صرف اپنے کیے کا بوجھ اٹھاتا ہے۔“

”اس کو پڑھتے بھی نہیں، اس پر رشم کے غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ میں نے اس قسم کے ایک ریشمی غلاف میں ملبوس کتاب دیکھی، لباس ہٹا دیا تو یہی قرآن نکلا جس کو آپ کبھی کبھی پڑھ بھی لیتے ہیں۔ میں نے تعجب سے کہا ”یہ تو قرآن ہے۔“ مگر اقبال کہتا ہے کہ ”یہ تو کتاب تقدیر ہے۔“ سنئے!

اسی قرآن میں ہے آپ ترک جہاں کی تعلیم جس نے مومن کو بنایا مہ و مہوس کا امیر تین یہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز بھی نہال جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر تھا جو نا خوب بدترج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا خیر تو صاحبان! اس طرح تو میں جانتا ہوں کہ قرآن کتاب تقدیر ہے بشرطیکہ آپ یہ کہیں کہ اسی سے ہم نے اپنی تقدیر بنائی ہے اور خدا کی تقدیر کا ہمارے ارادوں میں نہال ہونا اس طرح ہے جیسے خون کی جگہ ہماری رگوں میں فولاد گردش کرنا ہو اور تیسری بات ضمیر کی ہے جو غلامی میں بدل جاتا ہے۔ آپ وقتاً فوقتاً ”آئینہ دیکھا کریں کہ جب سے آپ آزاد ہوئے ہیں ضمیر کا کوئی حصہ واپس آیا ہے یا نہیں۔ اقبال کے مطابق تقدیر ہے تو سہی، مگر وہ چیز جو ناک میں رہتی ہے کہ اگر آپ کا عمل ذرا کند ہو جائے تو اپنی دودھاری تلوار آپ کے سر پر مارے۔“

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی براں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی فہم و ادراک کو روشنی روح کو شکستگی اور ایمان کو تازگی عطا کرنے والی اس کتاب کا مطالعہ آپ کے ذوق لطیف کی داد کا منتظر ہے!

☆

گے یہ تو مطلب نہیں ہو سکتا کہ دسمبر کے مہینے میں جب صبح ٹھنڈ ہو تو آپ سورج کی شعاعوں سے اپنے بدن کو گرم کر لیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو جس دن بادل ہوتے سورج یہ کہہ دیتا کہ آج مجھے بادلوں نے تسخیر کر لیا ہے لہذا آپ کی تسخیر کو چھٹی ہے اور ایسی تسخیر یعنی دھوپ میں بیٹھنا تو کھوڑے اور گدھے کو بھی میسر ہے۔ مسخر کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ آپ اس کی ساخت پر راحت، اس کے ذرات، اس کی شعاعوں، اس کے شانہ روز اور سالانہ کرشموں کا جائزہ لے سکتے ہیں اور اسی کو سائنس کہتے ہیں۔ گویا سائنس مذہب کا حصہ ہے۔“

”اقبال کا خیال ہے کہ تقدیر کا ذکر جہاں قرآن میں ہوا ہے اس کا تعلق تمام وقت یا مجموعی وقت سے ہے۔ وقت کے تین حصے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ کیا آپ ماضی کو سچ چھپے چھوڑ سکتے ہیں؟ وقت ایک جاری ندی ہے جو ماضی کو حال تک پہنچاتا ہے۔ مستقبل کوئی ایسی چیز نہیں ہے جیسے ایک طے کیا جانے والا فاصلہ، جس کو ابھی طے کرنا ہو، بلکہ وہ ایک کھلا امکان ہے اور جب قرآن کہتا ہے کہ خدا نے یہ سب چیزیں پیدا کیں اور ہر ایک کو اپنی تقدیر دی تو اس کا یہی مطلب ہے ”ایک مستقبل اس کے لیے مقرر کیا جو ایک امکان ہے اور جو اس چیز کی ذاتی قابلیتوں اور ممکنات پر منحصر ہے۔ مستقبل سے مراد واقعات کے وہ سرسبز پارسل نہیں ہیں جو وقت کے بطن میں خوابیدہ ہیں اور جو مقررہ ساعت پر معرض وجود میں آجاتے ہیں۔ مثلاً ”تقسیم ہند کو سمجھئے! جس کے نتیجے میں پاکستان بنا۔ پاکستان ایک صندوق میں بند خفہ نہیں تھا جو وہ اگست کو کھولا گیا۔“

”ہمارے روزمرے کام بھی مشین کی طرح نہیں ہوتے۔ اغراض و مقاصد کے تانے بانے سے بنے ہوتے ہیں اور یہی مقصد یا ارادے کا عنصر ہمارے حال کو مستقبل کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اگر یہ سب چیزیں پہلے طے ہو گئی ہوتیں تو ہمیں فوج رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پولیس کی کیا ضرورت تھی؟ جسے قتل





انگریزی ادب میں ماسٹر کیا ہے۔ لندن سے میں نے  
اولیٰ کیا اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ اداکاری میں بھی  
شارٹ کور سز کیے۔ میری ہائیٹ چھ فٹ ہے۔  
”اپنی فیلٹی میں کس کے بہت قریب ہیں؟“  
”میں اپنی فیلٹی میں سب کے بہت قریب ہوں۔  
لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کو میری شخصیت  
میں جتنی اچھائیاں اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ سب  
میری والدہ کی وجہ سے ہیں اور میری طبیعت میں جو  
نری اور انکساری ہے وہ میرے والد صاحب کی بدولت  
ہے۔ کیونکہ انہوں نے کبھی ہم، ہم، ہم، بھائیوں پہ سختی  
نہیں کی اور نہ ہی کبھی مارا نہ ہی بلا وجہ ڈانٹا ہے۔ میری  
شخصیت میں میرے والدین کا عکس نمایاں ہے۔“  
”آپ کو غصہ آئے تو کس پر نکلتے ہیں؟“  
”جس پہ آتا ہے اسی پہ نکالتا ہوں۔ تیز آواز میں  
بولتا ہوں اور بات دل میں نہیں رکھتا۔ عموماً مجھے  
لوگوں کے جھوٹ بولنے پر بہت غصہ آتا ہے۔ کیونکہ  
کچھ بھی ہو، جھوٹ سامنے آتی جاتا ہے۔ پھر سوچیں  
کہ جھوٹ بولنے والے کی کیا عزت رہ جاتی ہوگی۔“  
”ہنی مومن کے لیے کہاں گئے تھے اور فضول خرچ  
کون ہے آپ یا فاطمہ؟“

”سری لنکا اور سنگا پورے بہت انجوائے کیا تھا۔  
ایک یادگار ٹرپ تھا ہمارا اور فضول خرچ تو میں ہی  
ہوں۔ اچھی چیزوں کو دیکھ کر میرا ہاتھ نہیں رکنا۔“  
”بہت شکریہ احسن خان! اب کچھ باتیں فاطمہ سے  
کر لیتے ہیں۔“  
فاطمہ کے بارے میں آپ کو بتائیں کہ فاطمہ کا  
تعلق لاہور سے ہے۔ ان کی والدہ کا تعلق ملتان سے  
ہے اور والد سری لنکا میں جا کر رہے ہیں۔ جبکہ والدہ  
کافی عرصہ تدریس کے شعبے سے وابستہ رہی ہیں۔  
فاطمہ کے دو بڑے بھائی ہیں اور یہ دو بھائیوں کی اگلوٹی  
بہن ہیں اور لاہور میں لزیونیورسٹی سے بی ایس سی  
آرزو کیا ہے۔  
”جی فاطمہ! لائف کیسی گزر رہی ہے۔ بیٹی کیسی

اور متعدد ڈرامے کیے۔ اب تو صرف ڈرامے ہی کر رہا  
ہوں۔“  
”گھر میں بھی ڈرامے کرتے ہیں؟“  
”قہقہے۔۔۔ نہیں ہرگز نہیں۔ گھر میں کوئی ڈراما  
نہیں ہوتا۔ عام لوگوں کی طرح رہتا ہوں۔ بیوی اور بیٹی  
کے ساتھ وقت گزارتا ہوں اور گھر میں مجھے ڈراما کرنا  
آتا بھی نہیں ہے۔“

”انٹرایو چر کس طرح کاہکتے ہیں؟“  
”دیکھتا تو بہت براٹھ ہوں۔ مگر ہونا وہی ہے جو  
اللہ تعالیٰ نے قسمت میں لکھ دیا ہے، لیکن میری  
خواہش ہے، بحیثیت اداکار تو لوگ مجھے جانتے ہی  
ہیں۔ بحیثیت ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بھی لوگ مجھے  
جانتیں اور میرے کام کو پسند کریں۔“  
”تو پھر اصل فیلڈ کیا ہوگی؟“

”میں سب کو نامزد کرتا ہوں لیکن فی الحال میری  
پہلی ترجیح اداکاری ہی ہے۔ ماڈلنگ بھی ساتھ ساتھ  
کر رہا ہوں۔“

”آپ کے خیال میں بیوی کو کمانا چاہیے؟“  
”مگر بیوی تعلیم یافتہ ہے اور اس پر گھر کی کوئی ذمہ  
داری نہیں ہے، مطلب کہ وہ فارغ ہے تو ضرور  
کمائے۔ ورنہ تو یہ ذمہ داری مرنے والے کے ہوتی ہے کہ وہ اپنے گھر  
والوں کی کفالت کرے۔ ویسے شادی سے پہلے فاطمہ  
نے جب کی تھی اور شادی کے بعد بھی۔“  
”شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ اور ساری  
رسمیں ہوئی تھیں؟“

”جی بالکل! دھوم دھام سے ہوئی تھی اور تقریباً  
ساری رسمیں ہوئی تھیں اور سب نے کافی انجوائے کیا  
تھا۔“  
”کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔“

”میں 10 اکتوبر 1978ء کو لندن میں  
پیدا ہوا۔ والدین لندن میں ہی رہتے ہیں۔ ہم تین  
بھائی اور دو بہن ہیں۔ میں اور میرا ایک بھائی ہم دونوں  
جزواں ہیں۔ میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے

ہو گئی۔“

”شادی کیسا تجربہ ہے؟“

”بہت اچھا۔ فیلٹی بن جاتی ہے۔ لائف سٹیبل  
ہو جاتی ہے۔ گھر میں کوئی منتظر ہوتا ہے۔ کوئی پیار  
کرنے والا ہوتا ہے۔ پھر بچے ہو جائیں تو زندگی مکمل  
ہو جاتی ہے۔“

میرے اور فاطمہ کے درمیان محبت بھی ہے اور ہم  
آہنگی بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مسائل سنتے  
ہیں اور انہیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔  
”گویا زندگی خوش گوار اور مزے میں گزر رہی  
ہے؟“

”بہت خوش گوار، بہت مزے کی اور بہت  
پرسکون۔“  
”پیگم آپ کے ڈرامے دیکھتی ہیں؟ اور تنقید کرتی  
ہیں؟“

”ہاں! کیوں نہیں۔ جب ٹائم مل جائے اور میرا  
ڈراما آ رہا ہے تو ضرور دیکھتی ہیں اور تنقید بھی کرتی  
ہیں۔“

”ویسے کیا آپ نے بچپن سے ہی یہ ٹھان لیا تھا کہ  
شوہر میں آتا ہے؟“

”بے شک! مجھے اس فیلڈ میں آنے کا شوق تھا  
لیکن ایسا نہیں تھا کہ میں نے یہ سوچ لیا ہو کہ بس اتنا  
ہے تو اس فیلڈ میں، ورنہ کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔ ہوا  
یوں کہ میں جب لاہور میں تھا تو اپنے دوستوں کے  
ساتھ فلم کی شوٹنگ دیکھنے گیا۔ وہاں جاوید فاضل  
صاحب نے مجھے فلم میں کام کرنے کی پیش کش  
کر دی۔ میں حیران ہوا۔ میرے دوست جو میرے  
ساتھ تھے انہوں نے آسایا کہ آفر کو مت ٹھکراؤ۔  
میں نے ہائی بھری اور یوں اس فیلڈ میں آ گیا۔“  
”پھر قاعدہ جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔“

”ہاں۔ جی! کیونکہ مجھے مزا آیا تو میں نے لندن  
سے اداکاری سے متعلق کچھ کورسز کیے اور فلم  
سے ہی اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور میں نے سات فلمیں

ہے اور کیا فرق بلا اس کے آنے سے؟“  
”جی احمد اللہ! زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ بیٹی  
ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور بہت پیاری ہے اور  
اس کے آنے سے کیا فرق پڑا۔ تو آپ یہ سمجھیں کہ  
یوں لگتا ہے کہ جیسے زندگی مکمل ہو گئی ہے۔ زندگی میں  
روشنی آ گئی ہے۔“

”شادی کو ماشاء اللہ پانچ سال ہو گئے ہیں۔ کیا شادی  
کے بعد آپ جوائنٹ فیلٹی میں آئی تھیں؟“  
”جب میں باہر کر آئی تھی تو گھر میں ہم دو مہیاں،  
بیوی اور میری ساس تھیں تو اسے میں جوائنٹ فیلٹی  
ہرگز نہیں کہوں گی۔ سرال آکر مجھے جتنا پیار ملا اس  
کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔“  
”آپ کی شادی ایک مشہور آرٹسٹ سے ہوئی؟  
کوئی مشکل نہیں آئی، کبھی سوچا کہ ان سے شادی نہ  
ہوئی ہوتی؟“

”نہیں، نہیں! ایسا کبھی نہیں سوچا اور نہ ہی کبھی  
سوچوں گی۔ میں تو اپنے آپ کو بہت خوش قسمت  
سمجھتی ہوں کہ میری مشہور انسان سے شادی ہوئی  
ہے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے عام لوگوں میں میری بھی  
بہت عزت ہے۔ لوگ ہمیں بہت عزت کے ساتھ  
مہلتے ہیں۔ ہاں تھوڑی سی پرائیویسی متاثر ہوتی ہے  
لیکن کوئی بات نہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ لوگ انہیں پسند



کرتے ہیں۔“

”عموماً جب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو امور خانہ داری سے ناواقف ہوتی ہیں اور اس وجہ سے کبھی کبھی طعنے بھی ملتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کیا صورت حال رہی؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لڑکیاں بڑھائی میں اتنی مصروف ہوتی ہیں کہ گھر داری پر توجہ نہیں دے پاتیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لیکن مجھے کسی نے کوئی طعنہ نہیں دیا اور نہ ہی کچھ کہا۔ بلکہ جو مجھے نہیں آتا تھا وہ میری ساس نے مجھے سکھایا۔“

”جہاں دو برتن ہوں، ٹکراتے ضرور ہیں۔ آپ لڑتے ہیں تو کون مٹاتا ہے؟“

”جس کی غلطی ہوتی ہے وہی سوری کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو طاقت اور رتبہ دیا ہے۔ اس لیے سوری کرنے میں اکثر میں پھل کر لیتی ہوں۔ مجھے پھل کرنے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔“

”غصے کے تیز ہیں کیا؟“

”ہرگز نہیں! بہت سارے کرنے والی شخصیت ہیں۔ ہاں مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو پھر ضرور غصہ کرتے ہیں اور یہ قدرتی بات ہے۔ غلط باتوں پر تو سب کو ہی غصہ آتا ہے۔“

”شوہر کے بارے میں بہت سی غلط اور صحیح باتیں مشہور ہیں۔ کبھی کلن دھڑے آپ نے؟“

”انسان کو بہکنا ہو تو وہ کہیں بھی بہک سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس فیلڈ میں بنے۔ مجھے ان پر مکمل بھروسہ ہے۔ ان کی فیملی بہت پڑھی لکھی اور سلیکھی ہوئی ہے اور اگر بیوی اچھی بیوی بن کر رہے اور شوہر کو شکایت کا موقع نہ دے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ مرد گھر سے باہر کسی کو دیکھے۔“

”اپنی اور احسن کی کوئی نمایاں خوبی اور خالی بتائیں؟“

”میری خالی تو یہ ہے کہ مجھے بہت جلد غصہ آجاتا ہے۔ مگر ایسے ہی نہیں بلکہ اگر کوئی مجھ سے چلائی

کرے یا دھوکا دینے کی کوشش کرے تب۔ اور احسن میں تو بہت خوبیاں ہیں اور یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ احسن پانچ وقت کے نمازی ہیں بلکہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔“

”چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں آپ دونوں؟“

”ان کی باقاعدہ چھٹی کب ہوتی ہے۔ ان کی تو کوئی روٹین لائف ہی نہیں۔ آج شہر میں ہیں تو کل شہر سے باہر اور برسوں ملک سے باہر۔ تو جب کبھی قسمت سے چھٹی کا دن مل جائے تو پھر فیملی کے ساتھ ہی گزارتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے، کھانے پینے کے لیے نکل جاتے ہیں۔“

”آپ کو شادی کی کون سی رسمیں پسند ہیں اور منہ دکھائی میں ملتا تھا؟“

”میں شادی کے موقع پر غیر ضروری رسموں کے خلاف ہوں اور آج کے دور میں تو یہ ہونی ہی نہیں چاہیے، کیونکہ بہت زیادہ منگائی ہوئی ہے۔ مجھے ماہوں کی رسم پسند نہیں ہے۔ البتہ مہندی کی رسم اچھی لگتی ہے اور منہ دکھائی میں مجھے گولڈ اور ڈائمنڈ کا سیٹ ملتا تھا جو کہ بہت خوب صورت تھا۔“

”احسن نے کہا کہ وہ فضول خرچ ہیں۔ آپ بتائیں کہ احسن کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں؟“

”یہ تو ہے کہ احسن فضول خرچ ہیں اور ویسے تو سب پر بہت خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اگر اسے اوپر خرچ کرنا ہو تو پھر کپڑوں پر اور جوتوں پر خرچ کرتے ہیں۔“

”آپ کے ساتھ گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟“

”بہت مشکل ہے، کیونکہ بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ پھر بھی گھر میں ہوں اور موڈ بھی بہت اچھا ہو تو پھر ضرور ہاتھ بٹا لیتے ہیں۔ انہیں گھر کی صفائی سہرائی کا بہت شوق ہے۔ گھر میں گندگی برداشت نہیں کر سکتے۔“

”آپ احسن کو کس لباس میں زیادہ اچھی لگتی ہیں؟“

”میں انہیں ہر لباس میں ہی اچھی لگتی ہوں۔ خواہ جینز ہو، شلوار قمیص ہو یا ساڑھی۔ ساڑھی سے میں بہت گھبراتی ہوں کیونکہ اس کے ساتھ چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے خود تو بس شلوار قمیص ہی اچھی لگتی ہے۔“

”احسن کھانے پینے کے شوقین ہیں یا جوتا ہے کھا لیتے ہیں؟“

”احسن کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔ لیکن کھانے میں اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کھانا مرغن نہ ہو۔ بس فرائڈ ہو۔ ان کی فیلڈ ایسی ہے کہ انہیں اپنی اسارٹس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”آج کے دور میں جبکہ منگائی بے اندازہ ہو گئی ہے بچت کو اہمیت دیتے ہیں؟“

”انسان کی زندگی میں تو پیسہ ہمیشہ ہی بہت اہم رہا ہے۔ کیونکہ پیسے کے بغیر تو انسان کی زندگی کچھ بھی نہیں ہے۔ تو بچت کی اہمیت تو ہمیشہ سے ہی ہے۔ کب کیسا وقت آجائے سو انسان کو اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔“

”آپ کی شادی تو والدین کی پسند سے ہوئی۔ لو میرج کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔ کامیاب ہوئی ہے؟“

”میں تو سمجھتی ہو کہ نوجوانوں کی یہ سوچ غلط ہے کہ لو میرج ہونی چاہیے۔ یہ سب نوجوانی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اولاد کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ والدین کا فیصلہ مانیں، کیونکہ ان کی سوچ ہی اولاد کے لیے بہتر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تجربہ کار ہوتے ہیں۔“

”جن لوگوں کی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کیا کہیں گی؟“

”ان کے لیے میں بھی کہوں گی کہ وہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی، پہلے اپنی تعلیم مکمل کریں۔ اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جائیں، پھر شادی کا سوچیں، کیونکہ شادی تو ساری عمر رہنی ہوتی ہے۔ جلد جلد کا دوریوں ہی گزر جائے تو پھر زندگی میں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

”بہت شکریہ! آپ نے ٹائم دیا۔“



## ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت دردی

خوبصورت چہانگی

شان ہو گئی ہے

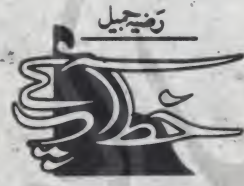
مضبوط جلد

آفٹ جپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امر نیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361





خط بچوانے کے لیے پتا  
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار کراچی -  
Email: info@khawateentdigest.com  
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔  
آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔  
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ہم کو اور ہمارے  
پیارے ملک کو سلامت رکھے۔ آمین

پہلا خط کراچی سے علیہ صمدی کا ہے، لکھتی ہیں  
اپنی پہلی تحریر کو شعاع کی زینت بنا دیکھ کر بہت خوش  
ہوئی۔ ان تمام قارئین کا شکریہ جنہوں نے تحریر پسند کی اور  
تعریف و تقدیر سے نوازا۔

شعاع کا ٹھنڈا سا سائیکل اور دلہن جی کے لباس نے اچھا  
تأثیر پیش کیا۔ نمروہ کے ناول کو بے صبری سے ختم کیا۔ خدیجہ  
کی موت ایسے تو سوچا بھی نہ تھا نمروہ واقعی ایک بے حد جاندار  
اور نایاب سا اضافہ ہیں۔

دیوار شب اور ستارہ شام بھی ٹھیک ٹھاک جا رہے ہیں  
مگر صفحات کی کمی کی شکایت بہر حال ہے۔ موش افتخار کے  
ناول نے مزہ دیا۔ فائزہ افتخار جی نام ہی کافی ہے۔ کہانی تو  
آگے کا جوا واضح ہوگی اور حویلی جیسے ماحول سے کچھ گھٹن  
بھی ہوئی۔

اور جناب آسیہ جی! اتنے سیدھے لوگ، خاص کراتی  
بھولی، ہیروئن کہاں ملتی ہے جی؟  
ایلیا یسین کا افسانہ الجھا سا لگا۔ ”آگہی“ اچھی کوشش  
ہے ”تھم قریرہ“ نے بھی معاشرتی دلوں کی تنگی واضح کی۔  
”ملا کاموتی“ بھی مختصر اچھی کوشش ہے مگر آخر میں مقصد کو  
مزید واضح کرنا چاہیے تھا۔ آخر میں ایک تجویز کہ ایک ایسا  
سلسلہ شروع کیا جائے جس میں، عالم دن ہماری ذہنی

الجھنوں اور خواتین کے جسمانی و دیگر مسئلے مسائل کے  
حل بتایا کریں جنہیں وہ جھجک کی وجہ سے دل میں دبا جاتی  
ہیں۔

پیاری علیہ! آپ یہ بتائیں، ایک افسانہ لکھ کر خاموشی  
کیوں جبکہ آپ میں صلاحیت ہے اور لکھ سکتی ہیں، آسیہ  
جی کے ناول میں آپ نے نوٹ نہیں کیا ہیروئن بہت کم  
عمر تھی۔ عقل بھی آتے آتے آتی ہے؟ شعاع کی پسندیدگی  
کے لیے شکریہ قبول کریں۔ عالم دین کی تجویز نوٹ کر لی ہے۔

وفیقہ زمیرہ اور کلثوم آصفہ نے فیض سے لکھا ہے  
شعاع کے تمام سلسلے ہی بہت اچھے ہیں نمروہ احمد کے  
ناول جنت کے پتے بہت زبردست ناول ہے اس میں مجھے  
حیا کا کردار بہت پسند ہے اور اس کے ساتھ ستارہ شام میں  
ماوی اور تنوی اور شبیہ العباس یہ تینوں میرے پسندیدہ کردار  
ہیں۔

وفیقہ زمیرہ اور کلثوم آصفہ! شعاع کی بزم میں خوش  
آمدید۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہارے دل سے شکریہ امید  
ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔  
کوٹ مومن سے نیلم شزادی شریک محفل ہیں، لکھا  
ہے

زیست کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں میں کچھ اس طرح سے  
ابھی کہ سلجھاتے سلجھاتے ہاتھ زخمی ہو گئے ان دیگرگوں  
حالات میں رب لم یزل کی یاد کے بعد جو چیز سب سے

بھاری رہی وہ شعاع ہے۔ فروری، مارچ اپریل اور مئی کا  
مہینہ گفتگو میں گزرا، ان چار ماہ کے آٹھ رسالے  
(خواتین بھی تو ہے نا!) پڑھنے میں اس قدر غرق ہوئی کہ  
جون سہ پہر آپہنچا۔

جس چیز نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ ہے ماہنامہ شعاع  
اپریل میں صفحہ نمبر 263 سلسلہ ”اس ماہ کی مسکراہٹیں“  
میں ”جنم میں جاؤ“ لطیفہ تھا۔ میری سب مسلمان بہنوں  
سے گزارش ہے کہ میسج بچہ بھی ایسے لطائف سے گریز  
کریں۔

دیوار شب میں جو یا مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے تو دوسری  
قسط سے یقین ہو گیا تھا کہ خیام یوسف کمال کا بیٹا ہے۔  
ستارہ شام بہت بہت اچھا ہے۔ گزارش ہے کہ فائزہ افتخار  
سے بھی کچھ لکھو (تس گئی ہوں) خط لکھنے کی دوسری  
وجہ ماہنامہ شعاع اپریل میں متا افسانہ دل کی گہرائیوں میں  
اترا۔ برگزیدہ ہستیوں کے نام کے ساتھ احترام کے ساتھ  
لاحقہ لگانا مت بھولا کریں۔

پیاری نیلم! اللہ تعالیٰ سے آپ کی بہتری اور خوش گوار  
زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔ جہاں تک زندگی کی دشواریوں  
اور حالات کے گرداب کا سوال ہے تو بہت کم لوگ ہوتے  
ہیں۔ جنہیں آسان زندگی ملتی ہے۔ زندگی میں خوشیاں اور  
غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو  
مشکل حالات میں بہت اور حوصلہ قائم رکھتے ہیں۔

آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ اس کے لیے  
معذرت۔ جن کو ماہیوں اور سہو کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا  
خیال رکھیں گے۔

زینب رانجھا عائشہ رانجھا، راقیہ رانجھا نے کٹنڈن

سیان ڈسک سے لکھا ہے  
شعاع ایک ایسا استاد ہے جو نہایت عمدی و شائستگی سے  
اپنے فرائض انجام دے رہا ہے اور اس کی خوش قسمتی ہے  
راٹر بھی ہمیشہ بہترین ملے۔

FM-101 یا لکھنؤ کے آر جے عثمان اکبر کا انٹرویو  
+ تصویر شائع کریں۔

زینب عائشہ اور راقیہ اشعاع کی پسندیدگی کے لیے  
شکریہ۔ اس میں شک نہیں کہ خواتین میں لکھنے والی  
تمام مصنفین ہی بہت اچھا لکھتی ہیں آپ کی فرمائش ضرور  
پوری کریں گے تھوڑا انتظار کریں۔

سونیا غوری اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں، لکھا ہے  
شعاع ہمارے گھر میں تقریباً ”دس سال سے آ رہا ہے  
جب سے بھائی نے پڑھنا شروع کیا ہے باقاعدگی سے آتا  
ہے۔ بھائی کی وجہ سے موصاف ہی موصاف اس دفعہ اکٹھے  
تین مکمل ناول؟ نمروہ جی آپ کے ناول نے ہمیں گھما کے  
رکھ دیا۔ چکر اکر رکھ دیا۔ مستقل سلسلے سب ہی پسند ہیں  
خاص طور پر بیٹھ کر سیدو جہاں کرنا بہت پسند ہے۔ ہمارے  
گھر نہ کیبل ہے نہ ہی ٹیلی ویژن ہاں کمپیوٹر ہے۔ جس پر  
”جنوں کا“ میرا مطلب ہے بھائیوں کا قہقہہ ہے۔ اس لیے  
شعاع، گمنان اور خواتین باقاعدگی سے منگواتے ہیں۔

ہاں میری کہانی کا کیا ہوا؟  
سونیا! شعاع بھائی کی وجہ سے آسانی اور باقاعدگی سے  
مل جاتا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اس کا کیڈٹ بھی  
آپ کو جانا ہے کہ آپ نے شعاع کو ان سے متعارف  
کرایا۔

آپ کی کہانی وصول نہیں ہوئی۔ کب بھجوائی تھی اور

## سانچہ ارتحال

محترم تہذیب و شائستگی خوش بیاں، معلم و ادب کا خزینہ، دانش ور، ادیب و محقق عبید اللہ بیگ اس دار فانی سے  
رخصت ہو گئے۔

اللہ وانا الیہ راجعون

ان کی وفات بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا  
فرمائے۔ آمین



کیا نام تھا؟

کوٹ مومن سے سعدیہ میر نے لکھا ہے

جون 2012ء کا خوب صورت ٹائٹل سے آراستہ شمارہ دو تارن کو ملا۔ نمروذیر میرے پاس الفاظ نہیں ہیں تعریف کے لیے اور نمروذیر آپ ترکی جابگی ہیں اس قدر ترکی کے متعلق معلومات۔

”میں بہت اکیلی ہوں۔ میرے پاس ابھی کوئی نہیں سوائے آپ کے، میرے پاس بجانے کے لیے کوئی گھٹی نہیں ہے۔ کھٹکھٹانے کے لیے کوئی دروازہ نہیں، ہلانے کے لیے کوئی ذخیرہ نہیں ہے۔ پہلی امید بھی آپ ہیں آخری بھی آپ ہیں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اگر آپ نے چین لیا تو کوئی دے نہ سکے گا اور اگر آپ دے دیں تو کوئی روک نہ سکے گا۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی دے دیں آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں“

یہ وہ الفاظ تھے جنہوں نے مجھ پر نجانے کیا اثر کیا کہ میں نے خود میں حیا سلمان کو دیکھا، رشتوں سے دور، اللہ کی مدد کے لیے اٹھنے والے ہاتھ، میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

آمنہ ریاض جی آپ بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں باقی راز موش افکار کا ناول ”گلے ملتا ہے“ بہت اچھا تھا، رباب سحر نے بھی بہت خوب صورت لکھا سنڈر بلا بھی فائزہ جی نے بہت خوب لکھا۔ آسیہ صاحبہ نے بھی خوب صورت انداز اپنایا۔

سعدیہ! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اس لیے کہ آپ ایک حساس دل اور پرکھنے والی نظر رکھتی ہیں۔ آپ نے نمروذیر کے جن جملوں کی تعریف کی ہے، وہ بلاشبہ بہت خوب صورت ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

جڑانوالہ فیصل آباد سے کوثر خالد نے لکھا ہے

بچپن میں میری تحریریں کبھی ضائع نہیں ہوئی تھیں۔ جیران ہوں مگر سوچتی ہوں کہ شاید رش بہت سے باری نہیں آتی۔ رسالوں کی عاشق میں اپنا تعارف لکھ کر بھیجا

تھا۔ اگر آپ پڑھتے تو پتا چلا کہ میں تو تبصرہ بھی نہیں بھیج سکتی کیونکہ میں تحریروں سے خالی نکالنے کے لیے نہیں پڑھتی بلکہ ہر کہانی سے کوئی نہ کوئی سبق حاصل کرتی ہوں اور علم میں اضافہ۔

ج پاری کوثر! شعاع کے لیے آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ شعاع کی سالگرہ پر مبارک باد کے لیے آپ نے جو نظم لکھی ہے۔ معذرت خواہ ہیں شعاع کی سالگرہ پر یہ منظوم مبارک باد شائع کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ نہ ہی یہ ہماری پالیسی ہے۔ آپ شعاع کی باقاعدہ قاری ہیں۔ کیا آپ نے اس طرح کی تحریریں کبھی ہمارے پروجیکٹ میں پڑھی ہیں؟ آپ کا افسانہ بھی پڑھا۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن کچھ اور لکھیں۔

کراچی سے مسرت الطاف احمد نے لکھا ہے

برائٹ سی دلہن دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہت ہی شاندار تھا۔

میں نے 30 مارچ کو ایک افسانہ ”کچھ ارمان، کچھ خواہشات“ کے نام سے بھیجا تھا میرے لاکھ پوچھنے پر بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ میری ہر تھ ڈے پر بھی آپ نے مجھے دوش نہیں کیا گیا آپ مجھ سے ناراض ہیں۔

جہاں تک بات ہے جون کے شمارے کی تو میں یہی کہوں گی کہ اس ماہ کا شمارہ ”اے ون“ تھا مکمل ناول، ناولٹ اور ہر سلسلہ قابل تعریف تھا دیوار شب کی یہ قسط بھی پرفیکٹ تھی۔ پڑھ کر کچھ میں مزہ آگیا جب کہ ستارہ شام کی یہ قسط بسو سو لگی۔ نمروذیر نے جس طرح حیا کی بے بسی، اس کا اللہ پر بھروسا امید اور خدیجہ کے لیے اس کی تڑپ دکھایا کب میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے یہ تو مجھے بھی پتا نہیں چلا ”تو آؤ گلد“ آسیہ رزاقی نے اپنے اسٹائل سے ہٹ کر ہلکی چٹکی سو فی اسٹوری لکھ کر میرا جی اندر تک خوش کر دیا۔ آپ کا ناول پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی دل چاہا دھمال ڈالوں۔ خوشی کا کردار اس کے مات کرنے کا انداز سب کچھ بہت ہی زبردست تھا۔ طرز تحریر بہت ہی خوب صورت، موضوع انٹریٹنگ اور دل کو چھو لینے والا تھی۔

رباب سحر کے مکمل ناول نے سچ میں دل جیت لیا تحریر نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں گرفتار کیا۔ آخری سطر تک پڑھنے میں دلچسپی رہی موش افکار کا مکمل ناول پڑھ کر مزا آیا۔ فائزہ افکار کا ناول ”اک نئی سنڈر بلا“ نام کی طرح یہ قسط بھی بہت خوب صورت تھی۔ پہلی قسط پڑھ کر آپ کے لیے دادواہ نکلا۔

ج پاری مسرت! آپ کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا، بلاشبہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی کہ آپ کی تحریریں کسی اور نام سے شائع ہوئیں اور کسی ماہ نام ہی غائب تھا۔ آپ یقین کریں۔ یہ سہوا ہوا ہے۔

افسانے کے لیے معذرت۔ آپ محنت کر کے کچھ اور لکھیں۔

کیمناڑی کراچی سے حوالی بی نے لکھا ہے

سرورق پر نظر دوڑائی۔ آہا! بچ بھونکنے سے کہاں سے اٹھتے ہیں۔ ہر چند کہ خط دیر سے بھیجا رہے ہیں۔ چھپنے نہ چھپنے کا ٹھکانہ نہیں پالنے کے بغیر شاعر۔ نہ ہوں نہ جو میرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں میں ان ہی کا تھا، میں ان ہی کا ہوں وہ میرے ہیں تو نہیں ہوں

سارہ بھائی کی شادی کی کامیابی کے لیے دعائیں۔ یہ کیا الیہ ہے ہمارا کہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہم بھی

اس طرح کے چلے اپنانے والوں پر انتہا پسندی کا لبیل لگا کر روشن خیالی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ آزاد خیالی کی دوڑ میں سبق لے جانے کی سعی میں ہم نے یہ بھی فراموش کر دیا ہے کہ یہ انداز وحلیہ، یہ وضع و قطع تو اس بے مثال اور عظیم الشان انسان اور تاریخ ساز۔ شخصیت سے منسوب ہے جو حسن انسانیت تھے۔

آمنہ بہت خوب تبصرہ کرتی ہیں۔ کہاں والی کا تبصرہ اور پھر برابر ہر ماہ ایک نئی کتاب کا خندہ دیتی آمنہ سے گزارش کہ ازراہ کرم یہ مفروضہ سلسلہ قتل کا شکار مت کیجئے گا۔

شاعری اور شعاع کے ساتھ ساتھ کاسلسلہ نثار تھا۔ شکوہ کرنا عیب ہے کہ صفحات کے سکڑنے کے عمل نے ایسے کئی دلچسپ سلسلوں کو قتل کا شکار کر دیا ہے۔

اب آتے ہیں تحریروں کی جانب، عالیہ بخاری زبردست اسلام صاحب کی محبت اور خلوص بھری خواہش، خیام کے دل میں ابھرنی لگی کی ترغیب اور معاذ کی زری کے حوالے سے فکر تینوں باتوں کی بان آکر ٹوٹتی ہے یہاں جی ہاں یقیناً ”آپ بھی جان گئے ہوں گے خیام اور زری زری اور خیام۔“

معذرت کے ساتھ ایک منظر میں زری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے اس نے معاذ کے لیے پوجا کا لفظ استعمال کیا تھا۔ براہ کرم ایسے لفظ ایڈٹ کر دیا کریں۔ محبت کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں۔

### سانچہ ارشاد

معروف افسانہ نگار بہن اختر بیگم نے اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اللہ وانا الیہ راجعون

اختر بیگم نے بے حد محبت کرنے والی، معشوق اور پر خلوص خاتون تھیں۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے دیرینہ وابستگی تھی۔

وہ مصنفین جنہوں نے خواتین ڈائجسٹ کی ابتدا سے ہی لکھا، ان میں اختر بیگم کا نام بھی شامل ہے۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے ”زندگی کی راہ میں“ اور ”مرکہزی“ شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کا مجموعہ زیر طبع ہے۔

اختر بیگم کی وفات ایک بڑا سانحہ ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ ان کے متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔



سوری نوے۔ آئندہ ریاض کی تحریر میں اس بار بھی قاتل بھروسہ نہ تھا۔ نمرہ احمد اسرار جوں کا توں برقرار۔ نمرہ احمد، ذیلی، عبدالرحمن پاشا؟؟؟ پورا ایک ماہ مزید انتظار۔ اسکی چیز بھی خوب ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کمائی کی تہم سے مطابقت رکھتے خاکے بہت اچھے لگتے ہیں۔ انٹرویوز میں فواد خان اور ماہر کا تفصیلی انٹرویو لائیں شائین اور ہاں ادبی شخصیات کا بھی انٹرویو کیا کریں۔ پیاری خواہ! تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود خط شامل اشاعت ہے۔ ہمیں احساس ہے شعاع لیٹ ہوتا ہے تو ہماری قارئین کو کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ پچھلی کمائی کے لیے معذرت۔ عید کے شمارے کے کچھ لکھیں ضروری شامل کریں گے۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ ان شاء اللہ جلدی پوری کریں گے۔  
ماریہ عابد یعنی عابد اور مریم عابد نے صادق آباد سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

”دیوار شب“ بہت سلو چل رہی ہے۔ پلیز تھوڑا تیز کریں اور جیوا کو اب بغاوت کر دینی چاہیے۔  
آئندہ ریاض کا ناول ”ستارہ شام“ اس کا نام مجھے پسند ہے۔ یہ صحیح جاری ہے مطلب نہ سلو نہ بہت تیز۔  
سب سے آخر میں رسالہ کی جان۔ وہ ہے نمرہ احمد کا ناول ”جنت کے پتے“ نمرہ احمد کی تعریف کس طرح کروں۔ ان کے ہی ناول ہوتے ہیں جن میں میں پہلے سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ کردار نگاری زبردست ہوتی ہے۔  
کچھ فرمائش کرنا تھی۔ پلیز پلیز جلی ظفر کا انٹرویو کریں اور کسی بڑے رائٹر کا بھی۔ ایک کمائی پڑھی تھی شاید نایاب جیلانی کی تھی اس میں ہیروئن کا نام عنوہ تھا تو پلیز نایاب آپ یا کسی نے وہ کمائی پڑھی ہو اور اسے مطلب پتہ ہو تو بتا دے۔

ج۔ ماریہ اور مریم انایاب جیلانی کی کمائی تھی جس میں ہیروئن کا نام عنوہ تھا۔ عنوہ کے معنی ہیں۔ دوستی رفاقت۔  
خالہ خنے پر ہماری جانب سے مبارک باد۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عمیرہ غفور نے صدیق آباد (موڑ کھنڈا) تحصیل و ضلع ننکانہ صاحب سے لکھا ہے

شعاع مجھے بے حد عزیز ہے۔ شعاع سے میں نے بہت کچھ سیکھا معاف کرنے کا وصف مبہر کرنے کی ہمت، تکلیف سنے کا حوصلہ سب کچھ بھلا کر آگے بڑھنے کا جذبہ اور زندگی کو ہر زاویے سے دیکھنے کا فن۔

میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں صدیق آباد کی رہنے والی ہوں۔ جہاں زندگی کی بنیادی سولتیں بھی میسر نہیں۔ حتیٰ کہ پینے کے لیے صاف پانی بھی مہیا نہیں ہے۔ لڑکیوں کا اسکول مل تک اور لڑکوں کا پرائمری تک۔ انہی کم سولتوں کے باوجود یہاں کے لوگوں میں خلوص، محنت، بھائی چارہ اور مہمان نوازی بہت ہے۔

سب سے پہلے ٹائٹل گرل انف اتنی گرمی ورنی ڈریس اتنی جیولری اور میک اپ۔ دیوار شب آپ کو کیا بتاؤں کتنی خوشی ہوئی اپنے اندازوں کی تصدیق پر اور ”ستارہ شام“ میں ماوی کا انداز بہت اچھا لگا اور جنت کے پتے بہت سی الجھنیں دور ہوئیں اور بہت افسوس ہوا ڈی جے کی موت کا۔ واقعی موت ہمارے تعاقب میں ہے کب زندگی ختم ہو جائے پتہ ہی نہیں۔ ناول روشنی کے جگنو آسیہ رزائی کا بہت اچھا تھا۔

”اک نئی سڈر ریلا“ فائزہ افتخار کا نام پڑھ کر ہی بہت خوشی ہوئی تھی۔  
افسانے سب ٹھیک تھے۔ عظمیٰ محمود کا ”لحم فکریہ“ بہت اچھا تھا۔ مستقل سلسلے میں دو جہاں میں رحیم گل کی جنت کی تلاش پڑھ کر کبھی اپنی کتاب یاد آئی رحیم گل کی ہی جنت کی تلاش میری ایک دوست نے تھیلی ہے جو کہ واپس کرنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے ہو سکتا ہے اب نام دیکھ کر ہی واپس کر دے۔

ج۔ پیاری عمیرہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعا میں آپ ہمارا شکریہ اپنی چھوٹی بہن تک پہنچا دیں کہ ان کے کہنے پر آپ نے ہمیں خط لکھا۔ انسان کو کسی بھی کام کو یہ سوچ کر نہیں چھوڑنا چاہیے کہ اس میں ناکامی ہو گی۔ کسی کام کو کر کے ناکام ہو جانا بہتر ہے بجائے اس کے کہ سرے سے کام کیا ہی نہ جائے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ اگر آپ کا خط شعاع نہ ہو۔ کتاب بھی ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ رہیں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

کائنات عابد فیصل آباد سے لکھتی ہیں

سرورق پر موجود ماڈل کا انداز اچھا لگا۔ جس چیز نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ نمرہ احمد کا ”جنت کے پتے“ تھا اس دفعہ کی قسط بہت اچھی تھی حیا، دعا مانگنا ہی تھا جس نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا اس وقت جب وہ ڈی جے کی زندگی کی دعا کر رہی تھی۔ اس کا دعا مانگنے کا انداز بہت اچھا لگا۔ اس کے علاوہ ”ستارہ شام“ بھی اچھا تھا افسانوں میں مجھے ”اجالا ہونے کو ہے“ بہت پسند آیا۔ ناول دونوں اچھے تھے۔ فائزہ افتخار کے ناول کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ مسکرائیں تو مجھے ہمیشہ سے اچھی لگتی ہیں۔

”پانوں سے خوشبو آئے“ میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔  
موش افتخار اور رباب سحر کے ناول کے بارے میں تو میں بھول ہی گئی۔ رباب سحر کا ناول بہت اچھا تھا۔  
پیاری کائنات! شعاع کی بزم میں خوش آمدید، متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

نوال افضل گمن گجرات سے شریک محفل ہیں  
پہلی مرتبہ شعاع 2000ء میں خریدی تھا..... شعاع کی جائے بدانتاش سے یعنی کراچی سے ہی تب رخسانہ جی کی ”خوشبو کا گھر“ کی پہلی قسط تھی..... پھر کسی نشئی کی طرح ایسا چکا لگا کہ بس آج تک جان بچھسی ہوئی ہے پھر رفتہ رفتہ خواتین اور کرنا بھی خریدنا شروع کر دیا۔ گھر میں کوئی پابندی نہیں..... ڈائجسٹ یقیناً ”ایک اچھے رہبر کی طرح کام سر انجام دے رہے ہیں۔ بس اتنی ہی گزارش ہے کہ ہماری رائٹر اپنے ناولوں۔ افسانوں اور اسٹوریز میں انگلش ورڈز کی بھرمار اور استعمال ذرا کم کیا کریں ہماری قوی زبان کوئی کوئی زبان نہیں کہ ہم سمجھ نہ سکیں۔ میری بات اگر بری لگی تو معذرت خواہ ہوں حالانکہ میں خود بھی

انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔ جامعہ پنجاب نیو کمپس لاہور سے.....

ج۔ نوال جی! کسی بھی کردار کی صحیح عکاسی کرنے اور اسے پورے طور پر واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کردار وہی زبان بولے جس طبقے اور ماحول سے اس کا تعلق ہے انگلش الفاظ کا استعمال ضروری ہو تب ہی کیا جاتا ہے ورنہ بلا ضرورت انگلش الفاظ کی بھرمار ہمیں بھی پسند نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شائستہ کرنا راجپوت نے چیونٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع خواتین اور کرنا کے ٹائٹل بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔ میں شعاع اور خواتین ہر ماہ خرید کر پڑھتی ہوں۔ ہر ماہ کرنا نہیں خرید سکتی اس لیے برائے شمارے خرید کر پڑھ لیتی ہوں ان تینوں شماروں کا ہر سلسلہ زبردست ہے کسی چیز کی نہیں ہے میری آنی صرف انٹرویوز پڑھتی ہیں میں نے F.M-94 کے عتیق الرحمان جی کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی پلیز پوری کر دیں۔  
بہج تصور کرے۔

پیاری شائستہ! ہمارے ادارے سے شائع ہونے والے تینوں پرچے آپ کو پسند ہیں، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

افراء ڈی جی خان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے  
میں پہلی مرتبہ کسی ادارے کو خط لکھ رہی ہوں۔ سو تھوڑی کھرابی ہوئی ہوں۔ بابا جان شعاع و خواتین نہیں پڑھنے دیتے حالانکہ انہوں نے خود کہا تھا کہ 9th کلاس کے بعد پڑھنا۔ لیکن انہیں کون سمجھائے جی؟ شعاع اور

## دعائے صحت

صوفیہ امجد کی ہمیشہ شدید علالت کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ان کے مرض کو رفع کرے اور انہیں شفاء عظمیٰ عطا فرمائے۔ (آمین)  
قارئین سے دعائے صحت کی درخواست ہے۔



آل جون کا پورا شمارہ بہت زبردست رہا۔ آپ کی کنیز نبوی کیوں اشتہاری ہو چکی ہیں؟ انہیں کیسے کہ اب لوٹ آئیں، سندھ دھرتی کو اندر تک محسوس کرنے کو دل بے قرار ہے کہ اب انتظار بھی نہیں ہوتا۔ پلیز کنیز نبوی جی پلیز قلم اٹھائیں اور اک نئی عشق کی داستان ”شاہ بھائی“ کے بیت اور بیچی کی نصیب جتنیں لکھ ڈالیں۔ پلیز۔۔۔

بچ کوثر، مریم اور سائرہ! آپ کی فرمائش پر کنیز نبوی کی تحریر شامل اشاعت ہے۔ شعلہ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کتابوں کے لیے آپ مکتبہ عمران ڈائجسٹ کو فون کر لیں۔ نمبر ہے 021-32216361

شاملہ کرن تو شین کنول، فائزہ جیس اور ندا تھکیل بوہڑی والا موہڑہ نکال سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے

سب سے پہلے حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول کریم پر بھی دیوار شب کی 52 قسط پر بھی۔ ناول خوب سے خوب تر ہونا چاہیہ۔ اجالا ہونے کو ہے اور آگ بھی اچھی تحریریں تھیں۔ لمحہ فکریہ اور اک نئی سنڈریلا بھی اچھی کہانیاں تھیں مالا کاموٹی بھی خوب تر تھی۔ ناول زندگی موسم اور خوشبو بھی اپنی خوشبو کی طرح پھول بکھیرتا ہوا تھا۔ آسیہ رزاقی کا ناول روپنی کے جگنو بھی اپنی مثال آپ تھا۔ ماہ جون کا شعلہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ خوب سے خوب تر تھا۔

ج۔ شاملہ، نو شین، فائزہ اور ندا! آپ لوگوں نے خط لکھا، بہت خوش ہوئی۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔



خواتین میرے فورٹ رسالے ہیں۔ پہلی مکمل تحریر میں نے نمرہ احمد کی ”مصحف“ پڑھی۔ تب سے باقاعدگی سے پڑھتی ہوں پر گھروالوں سے چھپ کر (بھئی اجازت جو نہیں پڑھنے کی) پلیز ”ستارہ شام“ کے صفحات پڑھا دیں۔ بہت کم صفحات ہوتے ہیں پڑھنے میں مزا نہیں آتا حالانکہ اچھی تحریر ہے۔

سلیم منیر، احسن خان اور نیوز کا ستر شاعر مرزا ان میں سے کسی کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

افزا! نگہرانے کی تو بات ہی نہیں ہے، ہم آپ کے اپنے ہی تو ہیں۔ شعلہ اور خواتین آپ اپنے گھروالوں کو پڑھنے کو دیں یا انہیں اس کے سلسلوں کی تحریریں پڑھ کر سنا لیں پھر وہ آپ منع نہیں کریں گے۔ انٹرویو کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کر لیں۔

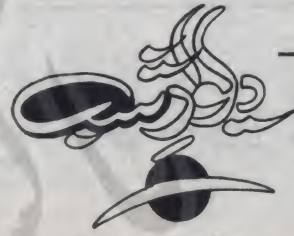
مسز کوثر منیر، مریم منیر احمد اور سائرہ منیر احمد نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ڈائجسٹ ملتے ہی فوراً ”نمرہ جی کا ناول نکالا اور بیٹھ گئے کونا سنبھال کر۔ حیا پر بہت غصہ آیا، کچھ بھی ہو، بہانہ کے بھلے کے لیے سہی چاہیے لیکن اسے عبدالرحمن پاشا سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہ کیا کیا نمرہ جی آپ نے۔ ڈی جے کی ڈینٹہ۔ لگاؤ تھا کہ سردرد کے پیچھے بھی کچھ بات ہے مگر اس اچانک موت نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ ”دیوار

شب“ بہت زبردست جا رہا ہے۔ عالیہ جی کا زری کے لیے راجو کا فیصلہ دل کو چھو گیا (مزا آگیا) شاکرہ کا اس دعوت سے اٹھ کر جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب جو اے کے بھی دن پھر لیں گے ”ستارہ شام“ بورنگ ہو گیا ہے اور دوسری شکایت یہ کہ کہانی شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے تو پلیز صفحات میں اضافہ کیجئے۔ ”نئی سنڈریلا“ کی دوسری قسط کا انتظار ہے۔ ”گلے ملتا ہے خواب کوئی“ ”اف موش افتخار نے کن موتیوں کو لفظوں میں رو دیا ہے ”زندگی موسم اور خوشبو“ اچھی کاوش تھی۔ ”روپنی کے جگنو“ آسیہ جی نے اچھا لکھا۔ آمنہ زریں سے کوئی ناول بھی لکھو آئیں۔ اور

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پہلے ماہنامہ شعلہ اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی چر تحریر کے حقیقی طبع و نقل جی ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نئی وی پیمنٹل یہ ڈراما، ڈرامائی تھکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔





قیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگہ خارا اور دلدار نانی نے اس کی پردہ پوشی پر حدناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کیدہ خاطر ہے۔ سچی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو ترائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا کمر اڑ سا لڑتے ہوئے ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو یہ دیکھ کر تباہ ہے۔ سالار قرام معاملہ فی الغور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے قیام کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لیتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لادی اڈے تک قیام کو چھوڑتا ہے۔ قیام کے لیے سالار کا دلیر حیران ہے۔ شہر کا کسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالوشوکت کے ہوش میں قیام کر تا ہے۔ زیورات کے ساتھ کئی اکلن چوڑیاں دیکھ کر قیام کو شہر پر چھکا لگتا ہے اودہ ہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھر دسا لوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

دیر کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری عہدے کے ایمان دار میرزا کرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبائے پروردگار کا بول میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ سچی کہ اپنی بڑھائی بھی، اماں اور دادی ہر دم معاذ اور دیر کے لیے زحاکو ہیں۔

دوسرا گھرانہ انبھارہ چا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری عہدے میں کرک ہونے کے باوجود وہ ادھر کی کماٹی سے اچھا خاصا کما کھاتے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی املاات کی دعوں سے بچیں میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت دیر جبکہ جویا کی بات معاذ سے ملے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر ناگ ڈال ہے۔ بچلے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس میں یوسف کمال کی بیٹی دوسرے کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ دیر اس اقبال پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافقت نہیں ہیں۔

## قسط ۵۳





خود پر جی نیل کی مذاق اڑاتی نگاہ گلناز کو کانٹے کی طرح چبھی تھی۔

”براہمت ماننا گلناز بیگم! عزت دار، خاندانی۔ ایسا ٹھہرنا ہوا شخص، جب پہلی بار بیوی کا انتخاب کرتا ہے تو اس کی ترجیح کچھ اور ہوتی ہے۔ یہاں تک تو وہ بعد میں آتا ہے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے۔ گھر میں بیٹھی تنگ دل، بد شکل، بد مزاج عورت سے نفرت ہونے کے بعد۔“

اس کی زبان لڑکھارہی تھی۔

وہ اپنی برداشت سے زیادہ پل چکا تھا۔ مگر ابھی تک ہوش میں تھا اور ٹھیک اپنی اوقات کے مطابق ہی باتیں کر رہا تھا۔

”یہاں آکر کسی کے بھی عشق میں مبتلا ہو جانا تو کبھی بات نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی تمہیں دیکھ کر بھی تمہارا دیوانہ نہ ہو، وہ حیرت کی بھی بات ہے اور بے عزتی کی بھی۔ کیوں؟ ٹھیک کہنا!“

وہ گلناز کی طرف اتنا جھکا کہ اسے سرک کر بیٹھنا پڑا۔

”بد ذات کہینہ!“ ابھی تازہ دیے گئے لاکھوں کے تحائف کا زرا اس لحاظ تھا اور نہ وہ اسے باہر کا راستہ دکھانے میں دیر کرنے والی نہیں تھی۔

”نصیب کی بات ہے سب اپنی جگہ آپ بھی ٹھیک ہیں لیکن جو میں نے کہا، وہ بھی غلط نہیں، میری بھانجی گیتی آرا پورے عزت اور وقار کے ساتھ رخصت ہوئی ہے اور وہ اپنے میاں کی دوسری، تیسری، چوتھی بیوی نہیں، پہلی محبت ہے۔ نکاح کی تصدیق آپ مسجد کے امام صاحب سے کر سکتے ہیں۔ گیتی آرا کا نکاح انہوں نے پڑھایا تھا۔“

”گیتی آرا!“ وہ زیر لب نام لیتے ہوئے مسکرا دیا۔ ”بہت خوب صورت نام ہے۔“

”وہ خود بھی بہت خوب صورت ہے!“ گلناز نے پہلی بار اپنی کسی بھانجی کے حسن کی تعریف اپنے ہاں آئے ہوئے مہمان سے کی۔

”ضرور ہوگی۔ اس نام کی لڑکیاں خوب صورت ہی ہوتی ہیں۔“ نیل کے لہجے میں حسرت سی اتری، گلناز نے کچھ حیرت سے اس کی کم ہوتی مسکراہٹ کو محسوس کیا۔

”اور یقیناً اس کا شوہر بہت ہی معمولی شکل کا ہوگا، نہ گوری رنگت، نہ قد اور نہ مردانہ وجاہت۔ ہا!“ اپنی دانست میں اس نے اپنی خوبیاں گونائی تھیں۔ مگر گلناز اب مزید متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔ نیل کے انداز، الفاظ، رویہ سب ہی کچھ ایک فرض سا پڑھاتے جارہے تھے، جسے بروقت نہ چکانی تو دونوں ہفتوں کی بے سکونی مول لیتی پڑتی۔

”خوب صورت تو عورتوں کا وصف ہے نیل صاحب! مرد کی شان تو اس کی بہادری، وقار اور قول کا پکا ہونے میں ہوتی ہے، خالی خولیاں باتیں بنانے والے مرد تو مرد کہلانے کے لائق ہی نہیں ہوتے نرے ڈھول کا پول۔“ اپنی بات اوجھری چھوڑ کر وہ جس تحارت سے ہنسی بھی، نیل کو اپنی پیشانی بھینکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

محفل کے سب سے اونچے چوہارے پر بیٹھی سونے کے زیورات سے لدی ہوئی گلناز کے پاس اظہار فخر کے لیے ابھی کچھ اور بھی باقی تھا۔

”اور سالار جیسا باوصف تو ہزاروں لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہے، بڑا پیسے والا اور سخی کراچی کا ہی ہے، آپ تو جانتے ہی ہوں گے ضرور!“

اور وہ یقیناً ”جانتا تھا۔“

گیتی، سالار۔

سالار، تکی۔

ان دونوں ناموں کا ساتھ ساتھ ہونا اب حیرت کی بات کہاں رہ گئی تھی پھر بھی وہ چند لمحوں کے قابل نہ رہا۔

گلناز نے اس کے چہرے کے اترے ہوئے رنگ کو اپنی فتح جان کر دل ہی دل میں خود کو شاباش دی۔ یقیناً ”سالار کی پوزیشن سے واقف ہے، تب ہی چہرے کا رنگ اڑا ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ آپ ضرور جانتے ہوں گے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”نہیں! میں نہیں جانتا!“ نیل کا لہجہ کھردراتھا اور آواز قدرے اونچی۔ گلناز نے حیرت سے اسے اٹھ کر کھڑا ہوتے دیکھا۔

”مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔“ وہ اتنی جلدی میں تھا کہ اس نے الماس سے الوداع لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

”شکر جو بلا ٹلی!“ بظاہر بڑے تپاک سے اسے رخصت کرتے ہوئے گلناز نے سکون کی گہری سانس لی اور واپس پلٹ آئی۔

ایک آباد والی سرکار پرانی کرم فرما تھی۔

”لاکھوں لٹا رہا، مگر کبھی منہ پر نہ لائے اور یہ نو دولتیا اس جیسے کتنے آئے اور گئے۔“ اس نے میزبانی سے سر جھکا اور بڑے ہال سے گزرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

سیڑھیوں پر سے تیزی سے اترتا ہوا نیل ابھی تک شاک میں تھا۔

اس کے ذرا نیور نے اسے خلاف توقع جلدی آتے دیکھ کر کچھ عجیب سا تو محسوس کیا تھا، مگر سارا دے کر اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لا کر ڈالنے میں اس نے دیر بھی نہیں کی تھی۔

گاڑی کیس سے نکل اور کیس سے کشادہ ہوئی اس گلی سے نکلتی چلی گئی۔

”سواس حسن بے مثال کا سرا یہاں سے جڑا تھا۔“ پچھلی سیٹ پر نیم دراز نیل کا ذہن پوری طرح بیدار ہو رہا تھا۔

”اور میں کتنا بڑا احمق جو یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس آوارہ گرد، معمولی شکل والے سالار کو، جسے کوئی لڑکی شاید ہی توجہ کے قابل سمجھتی، نہ سبزیری اور کہاں سے ملتی تھی ہا!“ اس نے پہلے اپنی کم عقلی پر افسوس کیا اور پھر اس معصوم کے حل ہو جانے کی خوشی میں مبتلا ہوا۔

”سو ثابت ہوا کہ وہ چوہا رسائی کے بڑے دعوے دار ہیں، وہ بھی اسی گلی کے مہمان ہیں اور مہمان بھی کیا خریدار، منہ مانگی ادائیگی پر بیش قیمت ہیرے کا مالک بن بیٹھا۔“

اس نے بیک وقت سالار پر رشک اور حسد محسوس کیا تھا۔

ایک بار پھر اس کا موبائل بج رہا تھا۔ زمرانیوں ہی منٹ منٹ پر پریشان کرتی تھی۔

”نیل! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

”بہتر ہوں پہلے سے۔“ وہ اس کے مروت نبھانے پر ابھی حیران ہی ہوا تھا کہ دوسرا الحمد واپس حقیقت کی دنیا میں لے آیا۔

”ایسا کرو، کسی ڈاکٹر سے میڈیکل سرٹیفکیٹ نہالو، کسی ایسی بیماری کا جس میں تمہاری حالت چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو، شدید بیماری کا غرض عدالت میں پیش ہو جائے گا تو تمہاری غیر حاضری کی وجہ مل جائے گی۔ کوئی فلاح کا انیک



”مجھے نہیں پسند یہ فلموں و لموں کا چکر یہ بھی کوئی کام ہے بھلا۔“ بڑی تیزی سے اس نے معاذ کی بات کاٹی تھی۔

”کیوں، برائی کی کیا بات ہے، باقاعدہ پروفیشن بن گیا اب تو“ اچھے گھروں کے لڑکے لڑکیاں ٹی وی میں آرہے ہیں، اکیڈمیاں کھل رہی ہیں۔ کم سہی اچھی فلمیں بھی بننا شروع تو ہوئی ہیں۔ میرے ایک دو اچھے جاننے والے ہیں۔ کم تو بات کروں، کسی ٹی وی سیریل کے لیے۔“

اس بار خیام نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے اس کے آگے۔

”پلین معاذ بھائی! اس کے چہرے پر اتنی بے جا رنگ تھی کہ معاذ مسکرا بھی نہ سکا۔

”پتا نہیں کیا ہے، جو اس پیار سے لڑکے کو کھل کر جیسے نہیں دیتا۔“ معاذ نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

”مصیبت یہ تھی کہ کچھ بھی نہ پوچھے کا وعدہ ابتدا میں ہی ہو چکا تھا بصورت دیگر وہ یہاں سے فوراً جا سکتا تھا۔

گواہ اس کے یہاں سے جانے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہی تھا مگر معاذ کو اپنے وعدے کا احترام تھا۔

”چند دن رہ گئے ہیں اسکول کی ادھنگ میں، ایک دم ہی مصروفیت بڑھ جانے لگی تھاری، پھر اس طرح خالی بیٹھنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی تمہیں۔“

”اچھا ہے، بلکہ بہت ہی اچھا ہے!“ خیام اس بار مسکرایا تھا۔

”اچھا وہ تم ساجد کی امی کو کہہ آئے تھے کہ وہ زری کے نکاح میں ضرور آجائیں۔ ان کا اتنا بہت ضروری ہے۔

وہ ان لوگوں کی بہت قریبی محلے دار رہی ہیں۔“ معاذ کو یاد آیا۔

”وہ ضرور آئیں گی معاذ بھائی! میں انہیں کہہ آیا تھا اور سعیدہ بھابی نے بھی انہیں فون کر دیا تھا سکھر سے۔“

”اللہ کرے یہ کام بھی خیریت سے ہو جائے۔ مجھے زری کی طرف سے بڑی فکر ہے خیام! بے سوچے سمجھے

بہت سے کام کر لیتا ہوں، لیکن زری کی ذمہ داری نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اب سوچتا ہوں تو امی کی مخالفت کی وجہ

سمجھ میں آتی ہے۔“

”لڑکیاں تو ہوتی ہی مصیبت ہیں معاذ بھائی! آزمائش، شرمندگی، خوف، سب میں ان ہی کی وجہ سے مبتلا ہونا پڑتا

ہے انسان کو۔“ وہ دھیمے لہجے میں بے ساختہ کہہ اٹھا۔

معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ سامنے ہاتھ پھیلائے کھیرل سے گرتے پانی کے قطروں کو اپنی ہتھیلی پر

جمع کر رہا تھا۔ اور ذاتی زندگی کے بارے میں یہ پہلا خیال تھا جس کا اس نے اظہار کیا تھا۔

”ایسا نہیں ہے خیام! عورت کا رت تو بہت بلند ہے، دنیا میں محبت کی سب سے مضبوط علامت قربانی دینے کا

وصف اللہ نے ان ہی میں رکھا ہے۔ زندگی کو گزارنے کے سلیقہ وہ ہی دیتی ہیں مرد کو ورنہ۔“

”مجھے نہیں لگتا۔“ اس نے تیزی سے معاذ کی بات کاٹی اور ہاتھ میں جمع شدہ پانی کو جھٹک کر نیچے گرایا۔

”جس چیز کو آپ محبت کہتے ہیں، وہ صرف ان کی مجبوری ہوتی ہے، انہیں پتا ہوتا ہے کہ وہ موسا کی میں اکیلی

نہیں رہ سکتیں اسی لیے وہ مرد چاہے کوئی بھی ہو باپ، بھائی، شوہر، بیٹا یا بھتیجہ کوئی اور۔ کسی کو بھی پکڑے رکھتی ہیں

جب تک وہ سارے سارا انہیں ڈھونڈ لیتیں۔ اب آپ اس خود غرضی کو محبت کا نام دیتے ہیں تو آپ کی مرضی۔

ایک طرح سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”کچھ کھائیں تو میں سامنے سے جا کر لے آتا ہوں۔“

نئی میں سر ہلاتے ہوئے معاذ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

خیام کے چہرے پر سرخی سی پھیلی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت ٹھہری ایسی اور بھی گہری۔

وغیرہ۔“ بے تاثر سے لہجے میں وہ جس طرح تیز تیز بول رہی تھی، اس میں کسی بھی طرح کی ہلکی سی بھی اپنائیت کا شائبہ نہیں تھا۔

”جسمانی بیماری، ذہنی عارضہ، میں نے بھی کسی سے کہا ہے کہ وہ تمہارے لیے ذہنی بیماری کے کچھ ثبوت پرانی

تاریخوں کے بناوٹ۔ ایک نہ پاگل شخص کو خاصی رعایت مل جاتی ہے ہماری عدالتوں سے۔“

اگر آج وہ اس کے سامنے ہوتی تو شاید پہلی بار وہ اس کے منہ پر زور سے پھٹ مارنے کی آرزو کو پورا کر ہی لیتا۔

غصہ کی ایک تند لہر نے نیل کو اپنی لیپٹ میں لیا۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو!“ دوسری طرف سے زرتاج اس کی مستقل خاموشی سے گہرا کرپکار رہی تھی۔ وہ بمشکل ہی خود پر قابو پا رہا تھا۔

”تمہیں بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں ہے زرتاج! میں آ رہا ہوں اور میں دیکھ لوں گا کہ کیا کرتا ہے، کیا نہیں۔

ذہنی معذوری کے سرٹیفکیٹ تم ضرور لو مگر کم از کم میرے لیے نہیں۔“

اپنی بات ختم کر کے اس نے فون منقطع کیا اور ساتھ ہی آف بھی۔

وہ پوری تسلی کے ساتھ کچھ سوچنا چاہتا تھا جس میں کسی کی شراکت گوارا نہیں تھی۔ یہ ٹرمپ کارڈ جو آج

اتفاقاً ”ہی ہاتھ لگا تھا“ کام کی چیز تھا اگر عقل سے استعمال کیا جائے اس کا شکار طرباغ بہت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔

اور اس بار پھر وہ زرتاج کو بھٹک بھی دینے والا نہیں تھا۔

\*\*\*

کئی دن کی بولا دینے والی گرمی کے بعد رات کے پچھلے پھر کھل کر بارش برسی تھی۔

صبح ہر شے گیلی گیلی اور ہوا مٹی اور سبزے کی مہک سے بو بھل۔

معاذ نے گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ برآمدے کے آگے نکلے سرخ کھیرل کے شیز کے نیچے

بیٹھا رک رک کر قطرہ قطرہ کرتے بارش کے پانی کو بہت انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

اسکول کی نئی عمارت میں منتقل ہونے کے درمیان کے ان چند دنوں میں کچھ اور کام توجہ طلب تھے۔ سو آج کل

پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ وقتی طور پر رکا ہوا تھا۔

معاذ نے خیام کی افسردگی اور شمالی پسندی کو ان دنوں میں ہی بار بار نوٹ کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ پتا نہیں کہاں

تھا؟

معاذ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ تب ہی کچھ احساس ہونے پر اس نے پلٹ کر

دیکھا تھا۔

”آپ!“ وہ اٹھ کر کھڑا ہونے لگا تھا مگر وہ منع کرتے ہوئے خود بھی قریب بڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہو رہا تھا؟“

”کچھ نہیں بس ایسے ہی۔“ جھمنبی ہوئی سی مسکراہٹ خیام کے چہرے پر آئی۔

معاذ نے ایک خاموش سی نگاہ اس پر ڈالی۔

پرانی سی جینز کے ساتھ سفید ٹی شرٹ پہنے، اس سرخ کھیرل کے نیچے بیٹھا ہوا، وہ اتنا خاص لگ رہا تھا جیسے کوئی

بہت پسندیدہ رومانٹک ہیرو۔

”خیام! تم نے شو بڑیوں نہیں جوائن کیا، مذاق نہیں سیر سلی کہ رہا ہوں، اتنے خوب صورت لڑکے، ایسی پرسنائی کہاں دیکھنے کو ملتی ہے ہماری فلموں میں۔ یہاں تو سنا ہے ابھی بھی۔“



وہ ضبط کی آخری حد کے آس پاس ہی کھڑا تھا۔

”ہماری مائیں بھی تو عورت ہی ہیں نا خیام، ہمیں اس دنیا میں لانے والی ہماری جنت ان کے قدموں کے نیچے ہے۔“

معاذ نے جوابات اس کی کڑواہٹ کو کم کرنے کے لیے کہنا چاہی تھی، درو کے ایک سب سے پرانے سلسلے کو تازہ کرنے کا سبب بنی۔

”ہر ماں اولاد کو پیدا کر کے احسان نہیں کرتی ہے معاذ بھائی! بہت سی اولادیں، زندگی بھر یہ تمنا کرتی ہیں کہ کاش وہ اس دنیا میں نہ آئی ہوتیں اور نہ ہی ہر ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ اور یہ بات وہ مائیں خود ثابت کرتی ہیں۔“

وہ بات ختم کر کے تیزی سے کچن کی طرف چلا گیا۔ معاذ کو لگا تھا جیسے وہ اب بس رونے ہی والا ہے اور کیا پتا، کچن میں اپنے آنسو ہی صاف کر رہا ہو معاذ نے تاسف سے پہلو بدلا۔

ہزار جب وہ کسی نہ کسی کو نادانستہ طور پر کسی دکھ میں مبتلا کرنے کا سبب بنا، ایسا ہی ہماری بوجھ دل پر آکر گرتا تھا۔ اس وقت خیام کے اندر چھپی انتہا درجے کی کڑواہٹ کا ایک اور رخ سامنے آیا تھا۔

”حقیقت کتنی بھی تلخ تھی، لیکن اسی تلخ ترین گہرائی سے خیر کا چشمہ بھی پھوٹنے کا منظر ہوتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے گہری سیاہ رات کے قریب تر، سحر کی پہلی کرن۔“

اسے ابابا کی کبھی بات یاد آئی۔

”سو خدا کرے کہ خیام کی زندگی کی صبح بھی قریب تر ہو!“ اس نے دل کی گہرائی سے دعا کی۔

نی الوقت زری اور راجو کا نکاح ساری توجہ لے رہا تھا۔ ایک بار وہ رخصت ہو کر اس گھر سے چلی جاتی تو وہ ایک بڑی فکر سے آزاد ہونے والا تھا۔

زری کی شدت پسندی نے اسے پہلی بار کسی عورت سے خوف زدہ کیا تھا اور ہر ماں کی طرح وہ اس خوف کو ابابا کے ساتھ شیئر کرنے کی ہمت بھی نہیں پاسکتا تھا، مگر وہی تھے جو اس الجھن کو دور کرنے کا سبب بنے تھے۔

ورنہ اس کے پاس تو لے دے کر بس یہی ایک خیام تھا، جس پر نظر تو جاتی تھی مگر ساتھ ہی ایک بڑی بے انصافی کا احساس بھی دل میں جگہ بناتا تھا۔

وہ اتنا پیارا، معصوم اور افسردہ سالک، کچھ اور ڈیرہ رو کر تاتھا!

”شکر ہے جو ابائے اسے اس غلطی سے بچالیا، ورنہ خیام یقیناً ”یہاں سے چلا جاتا!“

آج کی اس گفتگو سے اس کے یہ تو سمجھ میں آگیا تھا وہ اس کے کہنے پر زری سے شادی کرنے پر رضامند ہو جاتا۔ ناممکن!

سامنے کچن میں خیام نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلی سے سختی سے رگڑا۔

”کاش وہ معاذ بھائی کو ان عورتوں کے چہرے دکھا سکتا جو اس کی کئی ہر بات کی تصدیق کرتی ہیں، فیوزہ، نگینہ، صندل اور اب۔۔۔ گیتی آرا!“

سب کسی نہ کسی قیمت پر بکتی رہیں، یہاں تک کہ گیتی بھی جس کے بارے میں اسے پورا یقین تھا کہ وہ چاہے اب زندگی بھر بھی واپس پلٹ کر نہ دیکھے تب بھی وہیں نالی ستارہ کے چوہارے پر زندگی گزارنے والی ہے۔

برآمدے کے بالکل آخری سرے پر بنے کمرے میں دنیا کی رنگینوں سے منہ چھپا کر مٹھن اس کی یاد میں۔۔۔

مگر وہ بھی!

اس کی نظروں میں گیتی کا پرسکون چہرہ، قیمتی لباس، بڑی سی گاڑی اور گاڑی کا دروازہ کھولتا ہوا ڈرائیور سب ہی



کچھ کتنے دن سے اگلے تھے اندر کہیں اتار ضرب توڑی ہی تھی۔  
اور عجیب تو یہ کہ سب کچھ چھوڑ کر آنے پر بھی ٹھوہنے کا جو احساس کبھی نہیں جاگاتھا، وہ گیتی کی ایک جھلک کا  
ہی منظر تھا۔

”خیاں! تمہاری چائے میں اور کتنی دیر ہے؟“  
باہر سے معاذ آواز دے رہا تھا اور اس کی آواز میں وہی تسلی دلاتا ہوا انداز تھا، جو بار بار سنبھلنے کا موقع فراہم کرتا  
تھا۔  
”آ رہا ہوں معاذ بھائی۔“ اس نے رُے اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔



زرتاج بیگم نے انیکسی کی طرف ہوتی چل پھل پھل کو حیرت سے دیکھا۔  
وہاں کچھ سامان اتار جا رہا تھا۔ فرنیچر وغیرہ اور کچھ اور بھی۔ فاصلہ زیادہ تھا، وہ بہت درست اندازہ لگانے میں  
کامیاب نہ ہو سکی۔  
”اے! اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ملازمہ کو آواز دی۔“ یہ سب کیا ہے؟ کہاں سے آ رہا ہے یہ سامان؟  
کس نے منگایا ہے؟“  
”مجھے نہیں پتا۔ میں تو یہاں اندر گھر کا کام کرتی ہوں بیگم صاحب! وہ اطمینان سے جواب دے کر آگے بڑھ گئی۔  
زرتاج کی الجھن اب بھی برقرار تھی۔

ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرے ملازم کی لاعلمی کے بعد اس پر اچانک ہی ایک اور تکلیف دہ انکشاف یہ ہوا  
کہ سارے ملازم اس کے دائرہ کار سے قریباً نکل چکے ہیں۔ ان کے دو ٹوک جواب اور انداز میں آئی بے نیازیوں  
ہی نہیں تھی، ورنہ کسی کی مجال جو اس کے پوچھے گئے سوال کا یوں نکاسا جواب دے سکے۔  
”کسی ایک کو نہیں رکھوں گی، نکال دوں گی تم سب حرام خوروں کو تو کروں گی کی نہیں پڑی، ایک اشارے پر  
سینکڑوں میری جوتیاں چاٹنے کو تیار ہیں، تم لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ یہ میرا گھر ہے، یہاں کا پتا بھی میری مرضی  
کے بغیر بھی نہیں ہلا ہے، سیاہ و سفید کی مالک ہوں یہاں کی میں۔“  
لاؤنج میں کھڑے ہو کر وہ حلق کے بل چلا رہی تھی۔ گئے دنوں کی وہ مطلق العنانی اب بھولا بھرا قصہ ہوئی جا  
رہی تھی، مگر وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”اپنا اپنا حساب کر لو اور دفع ہو جاؤ بے غیرتو۔“  
مگر وہ سارے بے غیرت کھڑے کھڑے نکالے جانے کا حکم سن کر بھی وہیں کھڑے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ  
رہے تھے۔

”سنا نہیں تم لوگوں نے۔ کیا کہہ رہی ہوں میں۔ منظور! وہ اپنے نسبتاً پرانے وفادار کی طرف مڑی۔“ ان  
سب کا حساب کر کے نکالوا ہر میں اپنے گھر میں کسی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ انیکسی میں آئے سامان کی  
اگواڑی شروع ہونے والا قصہ چند منٹوں میں کہیں سے کہیں پہنچنے لگا تھا۔

منظور نے آنکھ کے اشارے سے ان سب کو وہاں سے ہٹنے کے لیے کہا، تب ہی انہیں وہاں سے ہٹا دیکھ کر وہ پھر  
سے چلائی تھی۔

”جا کہاں رہے ہو اپنا حساب کر دو اور دفع ہو۔“  
”آپ انہیں نہیں نکال سکتیں بیگم صاحب! یہ اس طرح نہیں ہٹائے جاسکتے۔“ منظور کو مجبور ہو کر وہ اطلاع

دینی بڑی جو ابھی تک زرتاج کی چند خوش فہمیوں کو برقرار رکھے ہوئے تھی ”سالار صاحب کا حکم ہے، کسی بھی  
ملازم کو ان کی مرضی کے بغیر نکالا اور رکھا نہیں جاسکتا، یہ فیصلہ صرف وہ ہی کر سکتے ہیں یا پھر ان کی بیگم۔“  
زرتاج نے بہت بے یقینی سے ان سب کی طرف دیکھا۔

ان کے انداز کی بے نیازی اور چرے کا سکون، منظور کی کمی باتوں کی تصدیق کر رہے تھے۔  
وہ چند لمحے یوں ہی گم صدمہ سی کھڑی رہی اور پھر تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔  
اوسرا انیکسی میں راجو کی گھر گھر ہستی کا سامان پورا ہوا تھا۔  
”بیچے راجو بھائی! اب صرف آپ کی دلسن کی کمی رہ گئی ہے وہ آجائیں گی تو گھر مکمل ہوگا۔“  
گیتی نے ہاتھ میں تھامے بچے کو کچھ پھول بھی ایک گل دان میں ڈال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور مڑ کر راجو کی  
طرف دیکھا۔ تو وہ افسردگی سے مسکرا دیا۔

”سب آپ کی اور سالار صاحب کی مہمانی ہے بھابھی! پتا نہیں کیا کیا کیے جا رہے ہیں میرے لیے ورنہ میں تو  
اب تک کسی سینٹرل اسپتال میں جمع کر لیا جا چکا ہوں یا پھر۔“  
”پھر شروع کر دیں آپ نے وہ بے کار کیا باتیں۔“ گیتی نے بڑی اپنائیت سے اسے ٹوکا۔ ”ایک نئی زندگی کا آغاز  
کرنے جا رہے ہیں آپ ساری تکلیف دہ باتوں کو پیچھے چھوڑ دیجئے پلیر!“  
”ساری کہاں چھوڑی جاسکتی ہیں بھابھی!“

رام کالج دھیمہ ہوا اور چرے سے وہ افسردہ سی مسکراہٹ بھی گم!  
”مجھے پتا ہے کہ آپ کے لیے روزی کا غم بہت بڑا ہے راجو بھائی! آپ ساری زندگی اسے نہیں بھول سکتے۔ مگر  
آپ دیکھیے گا کہ ظالم اپنے انجام تک ضرور پہنچیں گے اور ان کو ملنے والی سزا ہی آپ کے دکھ کا مداوا کرے گی۔“  
وہ اپنی بات کہتے ہوئے زرارہ کی راجو نے شاید گیتی کی تسلی کے لیے ہلکے سے اشارت میں سر ہلایا تھا۔  
”مداوا ہو گیا نہیں، لیکن اتنے پیارے لوگوں کو پریشان رکھنا بھی تو اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے اپنے دل میں کچھ  
ایسا ہی سوچا تھا۔

باہر سے سالار کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ تیز تیز بولتا ہوا وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ گیتی اور راجو دونوں ہی  
دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

”سب کچھ مکمل ہو گیا ہے یا ابھی کچھ کمی ہے؟ اچھی طرح دیکھ لو گیتی! اور تم بھی راجو! وہ بولتا ہوا اندر آیا تھا۔  
راجو کے لیے انیکسی کا فریج کراکری اور دیگر سامان کی مکمل تبدیلی کا آئینہ یا سراسر اس کا تھا۔ راجو منع ہی کرتا رہ  
گیا تھا۔ اس کے خیال میں انیکسی میں پہلے ہی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ سواس فضول خرچی کی قطعی ضرورت  
نہیں تھی۔ مگر اس نے ایک نہیں سنی تھی۔

”زری اور راجو دونوں ہی نے بہت سی محرومیوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ پیسے، وسائل، رشتے، محبتیں کچھ  
بھی نہیں رہا ان کے پاس۔ الگ الگ بھی کہاں دیکھو تو دل بیٹھتا ہے گیتی! اور میں جانتا ہوں کہ محرومیاں کس طرح  
روح کے اندر رنجے گاؤں کر جینے کا حوصلہ ختم کرتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوسیاں تبدیلیاں انہیں پھر سے جینے کی امنگ  
عطا کریں گی، تم دیکھ لیتا۔“

اس نے تنہائی میں گیتی سے کہا تھا اور وہ اس کی باتوں، فیصلوں پر حیران ہونا بالکل چھوڑ چکی تھی۔  
زری اور راجو کی شادی پر اس کی ابا کے ساتھ واحد شرط بھی زری کے ساتھ کوئی ایک پیسے کی بھی چیز ساتھ نہ آنا  
تھی۔

”گیتی! ذرا کچن پر ایک نگاہ اور ڈال لو۔“



وہ اس کا حکم سنتے ہی باہر نکل گئی تھی۔ راجو غریب روکتا ہی رہ گیا۔

”آپ بھابھی پر بہت کام ڈال رہے ہیں۔ بے چاری ہر وقت لگی رہتی ہیں مجھے تو سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔“ وہ واقعی شرمندہ تھا۔

سالار ہلکے سے ہنس پڑا۔ ”تمہیں نہیں پتا وہ ایسی ذمہ داریوں سے بہت خوش رہتی ہے اور میں ویسے بھی نہیں چاہتا کہ وہ زیادہ وقت زرتاج بیگم کے زیر اثر رہے، سمجھ کر رہے ہوتا۔“ راجو نے ہلکے سے سر ہلایا تھا۔

”اور سب سے اہم بات یہ کہ تمہیں تمہاری ذاتی زندگی میں خوش و خرم دیکھنا میری اور لگتی دونوں ہی کی دلی آرزو ہے، جو وہ کر رہی ہے اسے کرنے دو، یہ سمجھ کر کہ یہ اس کی خوشی ہے۔“ راجو اس بار ہلکے سے مسکرایا تھا۔

زندگی میں کبھی کبھی سب کچھ ایسا ہونے لگتا ہے سالار بھائی! جس کے بارے میں وہ ہم و گمان بھی نہیں ہوتا ہے، اب یہی دیکھ لیں عین سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روزی کے بعد زندگی میں ایسی کسی بات کی گنجائش باقی ہے۔ مگر۔۔۔ اس کی آواز کہیں گم ہوئی۔

سالار نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں تمہارا دل سے شکر گزار ہوں راجو! کہ تم نے میرا مان رکھا، مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ تم نے یہ فیصلہ اپنی خوشی کے لیے نہیں بلکہ میری خوشی کے لیے کیا ہے۔ احسان ہے یہ تمہارا مجھ پر۔“ ”ایسا نہ کہیں، آپ کے لیے تو میری جان حاضر ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔“ راجو کی آواز دھیمی مگر لہجے میں بڑی پراثر سچائی تھی۔

”میں روزی کو بھولنے کے لیے نہیں کہہ رہا، کیونکہ کسی کو بھولنا اتنا آسان نہیں ہوتا، لیکن کوشش کرنا کہ روزی کے ساتھ زندگی کا آغاز محبت کے ساتھ کرو، دیکھنا جو بابا“ وہ تمہاری زندگی کو بدل کر رکھ دے گی۔“ ”مجھے صرف نبیل کی فکر ہے۔ وہ اس رشتے پر بہت شدید غصے میں آئے گا۔ بہر حال روزی اس کی بہن تو ہے۔“

تا۔

”بہن!“ سالار تلخی سے مسکرایا۔ ”سالوں سے منہ موڑ کر خود زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اس کی بلا سے بہن، بھائی، ماں، باپ کا جو حشر ہو۔ مجھے تو یقین ہے کہ وہ اگر روزی کو دیکھے گا بھی تو پچھانے کی غلطی نہیں کرے گا اور اگر پچھانتا ہے تو بھی یہ ان دونوں کا معاملہ ہے۔ روزی کو شدید نفرت ہے اس سے۔ تم چھوڑو۔ یہ ان لوگوں کو خود پنپانے دو۔ اگر ایسا موقع آیا۔“

سالار نے نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”شادی کے چند دن بعد تم روزی کو لے کر ویسے بھی اپنے گھر جاؤ گے، وہاں ایک بہت اچھی سی ویدہ کی دعوت کرنی ہے تمہیں۔ میں چاہتا ہوں تمہاری امی اور بہنوں کی ہر خوشی دو بالا ہو اور پھر جب تک تم واپس آؤ گے تو تب تک خدا نے چاہا تو نبیل یہاں سے جا چکا ہو گا۔“

”اور روزی کا کیس؟“

وہ بے ساختہ کہہ ٹوٹ گیا۔ مگر دل میں شرمندہ بھی ہوا۔ اتنا کچھ جو سالار اس کے لیے کر رہا تھا۔ اس کے بعد بھی؟ ”وہ تو یہاں سے پہلے وہاں درج ہو چکا ہے راجو!“ سالار نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”بہت جلد فیصلہ آئے گا“ بے فکر رہو، زرتاج بیگم کے اختارات اور تعلقات کا اندازہ مجھے ان ہی دنوں میں ہوا ہے، لیکن کب تک۔۔۔ عدالت نے نبیل کو حاضر ہونے کا حکم دے دیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کیا گھٹیا حربہ استعمال کرتا ہے۔“



وہ برعزم بھی تھا اور پر یقین بھی۔  
اور اس کی کئی ہر بات پر راجو کو مکمل بھروسہ بھی تھا۔ روزی کا انصاف ہونا ہی تھا۔ کسی بھی صورت سہی۔  
”تم بہت سکون سے خوشی خوشی اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو اور بس اللہ پر بھروسہ رکھو وہ اپنے کسی بندے کو مایوس نہیں کرتا۔ صرف وہ دن رہ گئے ہیں تمہاری شادی میں۔“  
وہ اس کو ساتھ لیے باہر چلا آیا۔ انیکسی کی دیواروں کے پیٹ کے ساتھ جو سارے اضافے کی گئے تھے۔ ایک بہت خوش گوار سے احساس کو جنم دے رہے تھے۔ سامنے موسمی پھولوں سے لدے ہوئے گیلے اور پیچھے نظر آتا وسیع سبزہ زار۔

سالار نے ایک گہری سانس لی۔  
دوسری طرف پکن سے گیتی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا اطمینان بتا رہا تھا کہ سب کام مکمل ہوا۔  
”تم اب آرام کرو راجو! صبح سے لگے ہوئے ہو۔“ انیکسی کی سیڑھیوں پر سے گیتی کے ساتھ اترتے ہوئے سالار نے پلٹ کر اسے ہدایت کی تھی۔  
وہ پھر بھی کچھ دیر وہیں کھڑا نہیں بڑی عقیدت سے دیکھے گیا اور پھر اندر چلا گیا۔  
”شکر ہے جو راجو شادی پر راضی ہوا، میں اس سے بنا پوچھے اب اسے وعدہ کر آیا تھا۔ مگر اس نے میری بات کو رکھا، یہ کیا کہ بات ہے۔“ گھر کے رہائشی حصے کی طرف جاتے ہوئے سالار نے گیتی سے کہا۔ وہ مسکرا دی۔  
”آپ کی بات تو ہر ایک ہی مان جاتا ہے۔ اس میں نئی بات کون سی ہے۔“  
”مثلاً۔“ اس نے اپنا بازو گیتی کے کندھے پر پھیلا لیا۔  
”بہت سی مثالیں ہیں اور سب سے بڑی تو میں خود آپ کی ایک آواز پر کیسے چل پڑی آپ کے ساتھ۔ ثانی تک کو خفا کر دیا تھا۔“  
”خیر، تمہاری تو بات ہی دوسری ہے۔ پرانی سیٹنگ تھی تم سے، کیسے نہ سنتیں میری بات۔“ وہ شرارت سے ہنسا۔

”توبہ کریں! میں نے کیا سیٹنگ کی تھی آپ سے۔۔۔ بے کاریں ہی۔“  
سالار نے دلچسپی سے اس کے گلابی چہرے کو دیکھا۔  
”اور یہ اس طرح فری ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ سب ملازم آتے جاتے رہتے ہیں۔“ اس نے کندھے پر پھیلا سالار کا ہاتھ بھی بی الفور ہٹایا تو وہ ہنستا چلا گیا۔  
”تمہارا بھی جواب نہیں گیتی آرا۔“ اس کی آنکھوں میں ہنستے ہوئے پانی سا اگیا تھا۔  
گیتی نے کئی بار سنا تھا کہ جن لوگوں کی آنکھوں میں ہنستے ہوئے پانی آتا ہے، وہ بہت سادہ دل اور مخلص ہوتے ہیں۔ سو وہ ایسا ہی تھا۔ اور ایسے مخلص، سچے دیانت دار شخص سے کوئی ایک چھوٹی سی چوری بھی کہاں جائز تھی۔  
پچھلے چند دنوں سے دل میں بچھا احساس ندامت ایک بار پھر سراٹھانے لگا۔  
”شاید مجھے بتائی دینا چاہیے تھا اسی دن، مگر مہلت ہی کہاں ملی۔ رات کو معاذ بھائی کے ہاں دعوت تھی اور پھر۔۔۔ مصروفیت کا ایسا سلسلہ دراز تھا کہ جیسے دوڑتے بھاگتے دن رات ختم ہو رہے تھے۔“  
”کیا سوچ رہی ہو؟“ سالار نے پھر سے محبت سے اس کے بالوں کو چھوا۔  
وہ گہری داخلی سیڑھیوں کے بالکل قریب آتے جا رہے تھے۔ تب ہی وہ چلتے چلتے رکی تھی۔  
”سینے!“  
وہ اس کے ایک دم رکنے پر کچھ حیران سا ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”چند دن پہلے مجھے خیام ملا تھا ایک اسٹور پر۔“  
بنانگی تھپد کے اس نے سالار کو وہ اطلاع دی جو واجب ہو رہی تھی۔  
جواباً ”چند لمحے وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔ لیکن گیتی نے اس کی آنکھوں میں الجھن کی محسوس کی تھی۔  
”میری اس سے کچھ بات تو نہیں ہوئی، لیکن ہمارا سامنا ہوا تھا۔ وہ میڈیکل اسٹور پر دو ایس خرید رہا تھا۔ جب میں وہاں۔۔۔“ نگاہیں جھکائے اس نے وہ مختصر سا واقعہ من و عن بیان کیا اور بیچ میں ایک بار بھی سالار کی طرف نہیں دیکھا۔  
”پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا ہے،“ خیام سے اس کی گئے دنوں کی دلچسپی کا واقف حال تھا۔ ٹھیک ان دنوں میں اس کا ثانی ستارہ کے ہاں آنا شروع ہوا تھا۔ جسودہ تازہ تازہ سوگ منار ہی تھی۔  
دنوں کے بیچ آئی چند لمحوں کی خاموشی میں وہ ہر رے امکان میں گھری۔  
”مردوں کو ہر بات بتانا کیا ضروری ہے بھلا؟ اب آگے کیا اعتبار کریں گے۔“ اپنا بیک گراؤنڈ اس پر اب بھی سہم ساطاری کرنا تھا۔ ورنہ افسیوے پندیدگیوں، مرضی کی شادیاں اور بہت کچھ۔۔۔ اور کچھ بھی نیا نہیں۔  
سالار نے اس کے پچھلے پڑتے رنگ اور جھکی ہوئی پلکوں کی طرف دیکھا اور دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما۔  
”تو اس میں خاص بات کیا ہے جو تم نے مجھے بتانا ضروری سمجھی۔“ سالار کے انداز میں بڑی فطری سی لاپرواہی تھی۔

”جی! اس نے جو تک کر سالار کی طرف دیکھا۔  
”ہاں نا، لوگ ملتے ہی رہتے ہیں آتے جاتے خیام بھی کہیں نہ کہیں تو ملنا ہی تھا اور آگے بھی ملے گا۔ اس میں کون سی پریشانی والی بات ہے۔ تمہیں تو چاہیے تھا کہ بڑھ کر اس سے بات کر تیں، پتا پوچھتیں، کیا خبر وہ ثانی سے ملنے کے لیے تیار ہو جاتا۔“  
تبصرہ، مشورہ، سب ہی کچھ بے حد نارمل۔  
گیتی نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ ”مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اس کا حال چال پوچھتی۔ وہ ہم لوگوں سے تعلق نہیں رکھتا چاہتا۔ یہ بات سب کو پتا ہے، وہاں لاہور میں بھی اور ثانی مدت ہوئی صبر کچھ کی ہیں۔“  
خیام سے اس کی بے زاری اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ”مجھے آپ کو بتانا تھا، سو بتا دیا اس سے آگے میرے لیے اس موضوع کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“  
وہ پورے وقار سے سالار کے سامنے کھڑی کمر رہی تھی۔



آج تیسرا دن تھا۔ جو بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔  
جوانی نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتے ہوئے بڑی فکر مند نگاہوں سے شاکرہ ای کی طرف دیکھا۔  
ان کا رنگ سفید پڑ رہا تھا اور آنکھیں اب بھی بند۔ پچھلے تین چار دنوں سے وہ اسی حالت میں تھیں۔ محلے کے جو ڈاکٹر انہیں دیکھ کر کھنکھاتے تھے۔ ان کی دوا سے ذرا بھی افادہ نہیں تھا۔ مگر کپاگل اور سلمان دونوں ہی کسی اور کو دکھانے کے حق میں نہیں تھے۔  
”بار بار ڈاکٹر بدلنے سے مرض اور بھی بگڑ جاتا ہے۔ یہ بے چارے قریب ہیں۔ سستے بھی ہیں اور اچھے بھی۔“  
آپاگل کی بتائی ہوئی خوبیوں کے بعد کسی بحث کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔  
وہ اور سلمان دونوں بے حد مطمئن تھے۔ مگر جو اب بے حد مضطرب تھی اس روز فرید الدین کے ہاں کی دعوت کے



بعد جب وہ گھرائی گئی تھیں، بالکل خاموش تھیں اور ان کے بخار کی ابتدا اسی رات ہوئی تھی۔  
 ”امی! مجھ سے ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے جو یا نے انہیں بے قراری سے دھیمی آواز میں  
 پکارا۔ مگر وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح خاموش لیٹی تھیں۔

جو یا کے دل کو بے بے و، ہم گھیر رہے تھے۔ خدا نہ کرے! انہیں کچھ ہو گیا تو۔  
 بری طرح گھبرا کر اس نے شاگرہ امی کے ہاتھوں کو کوئی بار چوما تھا۔ ان کے ہاتھ برف کی طرح سرد تھے۔ وہ کسی  
 خوف زدہ بچے کی طرح ان کے سینے میں منہ چھپا کر سسکتی رہی۔

”امی! پلیز ٹھیک ہو جائیں! امی! میں بہت پیار کرتی ہوں آپ سے۔۔۔ امی۔۔۔ امی۔۔۔“  
 اسے ان دنوں میں اور بھی شدت سے یہ احساس ہوا تھا کہ سارے گلے شکلوں، محرومیوں کے باوجود وہاں کا وجود  
 اس کے لیے آج بھی سایہ رحمت تھا۔  
 کوئی کچھ کے، کچھ سمجھے۔

باہر سے آپاگل کے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ جو یا نے جلدی سے علیحدہ ہو کر اپنے آنسو خشک کیے  
 اور اٹھ کر دروازے سے نکل گئی۔

خاموش ساکت لیٹی شاگرہ امی کی بند پلکوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور آنکھوں سے آنسو پانی کی باریک لکیر  
 بناتے ہوئے چہرے پر پھلتے چلے گئے۔

باہر آپاگل کا دُف آج بھی جویا ہی تھی۔  
 ”کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے جویا! ہر وقت امی کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی ہو۔ لوگ بیمار پڑتے ہی ہیں، معمولی سا  
 بخار ہی تو ہے۔“

”امی اس طرح پہلے کبھی بیمار نہیں ہوئیں آپا! اب تو بالکل بستر پر چلی گئی ہیں۔ بات بھی نہیں کرتیں۔ مجھے  
 سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ آپ انہیں کسی دوسرے اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتیں، کسی اسپیشلسٹ کو جو۔۔۔“  
 آپاگل نے بے زاری سے ماتھے کو جھوا۔

”اتنی بڑی ہو گئی ہو، مگر عقل ابھی بھی ٹخنوں میں ہی ہے تمہاری۔ ایک ذرا سے بخار کو ہوا بنا لیا ہے۔ اتنا بھی  
 نہیں سمجھ رہی ہو کہ اتنی کی بیماری جسمانی نہیں، ذہنی ہے۔ اتنی پریشانیوں میں گھری ہیں، نروس بریک ڈاؤن قسم  
 کی ہی بیماری ہے یہ، فکریں کم ہوں گی تو خود بخود اچھی ہو جائیں گی، بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ! چھی ہو جائیں گی۔ دیکھ  
 لینا بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔“

ان کی آنکھوں میں آئی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ اتنی گہری اور معنی خیز ہونے لگتی تھی کہ جو یا کو آنکھ ملانا  
 مشکل ہو تا تھا۔ گھر میں جویہ پھڑی آپاگل اور سلمان مل کر پکار رہے تھے۔ وہ اب کوئی ایسا راز بھی نہیں تھی۔  
 فرید الدین ایڈویٹ کا رشتہ، رشتہ نہیں سارے مسائل کا شافی حل تھا۔ یہ بات کئی سنی اور مانی جا چکی تھی۔  
 کسی نے اس سے رسمی سی ”ہاں“ کروانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

صرف زویا تھی جو پریشان ہو کر بار بار اس کی توجہ اس معاملے کی طرف دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر یہاں  
 اس کے لیے فرید الدین سے بڑی پریشانی شاگرہ امی کی بیماری تھی۔

”تم اتنی فکر مت کرو، ویسے ہی ساری پریشانیاں اپنے سر لے کر کیا سے کیا حال بنا لیا ہے تم نے۔ رنگ روپ  
 کچھ بھی تو نہیں رہا، میں تو شکر کرتی ہوں کہ فرید الدین نے تمہیں پسند کر لیا۔ ورنہ آج کل تو مرد ایسی ویسی لڑکی پر  
 ہاتھ بھی نہیں رکھتے۔ ہر ایک اچھے سے اچھے کا طلب گار ہے۔“

جویا نے بے بس سی نگاہوں سے آپاگل کی طرف دیکھا تو وہ نہ جانے کیا سمجھیں۔



”چھوڑو ان لوگوں کی پروا کرنا انہوں نے کون سا تمہارا ذرا بھی خیال کیا ہے۔ اب امی کو ہی دیکھ لو۔“  
اودھرا دھڑکے کر انہوں نے کسی کے نہ ہونے کا یقین کیا۔

”ہیں تو ماں! کچھ کہنا اچھا تو نہیں لگتا مگر انہوں نے کب انصاف سے کام لیا۔ سارا بوجھ تم پر ہی ڈالنا مسلمان پر کوئی ایک فکر ایک ذمہ داری ڈالی ہو تو بتاؤ۔ تمہاری خون پسینے کی کمائی کو اس کی زبان کے چنچروں میں اڑایا ہے انہوں نے اور لکھ کر رکھ لو میری بات، تم اگر اسی گھر میں بیٹھی رہیں تو وہ اور مسلمان ساری زندگی تمہیں استعمال کریں گے۔ تم یوں ہی کماتا کر اس کٹھن کا کارہ مسلمان کو پاتی رہو گی۔ اور وہ نہ آج کچھ کرے گا اور نہ کل۔“  
محسن کے کوئے پر کھڑی وہ بڑی اپنائیت بھری راز داری جو یا سے برت رہی تھیں۔ تب ہی مسلمان اپنے کمرے سے نکل کر وہاں چلا آیا۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں چیکے چیکے۔ کہیں میری تو برائیاں نہیں ہو رہی ہیں۔“

”نہیں! ہم کیوں کریں گے تمہاری برائی۔ ایک اکلوتے تو بھائی ہو ہمارے۔ اللہ سے ہر وقت تمہاری سلامتی کی دعا ملتی ہوں صبح شام۔“ اسے ٹھیک اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر وہ ابھی گھبرائے بغیر اپنا بیان بدل چکی تھیں۔  
مسلمان نے یوں ہی بے فکری سے اپنا سر ہلایا۔

”دعاؤں کا شکریہ۔ لیکن صاف بات ہے کہ تمہارا کچھ بھی بھروسا نہیں ہے آپا ایسے کیا بات ہو رہی تھی بتاؤ تو سہی۔“ گھر میں ہمہ وقت فاسخ رہتے جاہل عورتوں کی طرح ارد گرد کی سبک دینی کی بری عادت پڑ چکی تھی۔

آپا گل نے برا سامنہ بنایا۔ ”کچھ نہیں“ ایسے ہی جو یا کو سمجھا رہی تھی کہ امی کی بہت زیادہ ٹینشن مت لو، اب ظاہر ہے عمر ہے، فکریں ہیں، طبیعت تو خراب چلتی ہی ہے، ہر وقت ان کی پریشانی میں مت گھلا کرے۔“  
جو یا نے اپنی نم ہوئی آنکھوں کو پھیلنے سے روکنا۔

”صرف بخار ہے، وہ بھی کمزوری کا، میں بتا رہا ہوں دو چار دن اچھا سا کھانا کھائیں گی تو خود بخود ہی اٹھ کر کھڑی ہو جائیں گی۔ تم آج سنی والا پلاؤ بنا لو، رائتے کے ساتھ۔ آہا! مزا آجائے گا۔ امی نہ اٹھ کر بیٹھی ہوں تو میرا نام بدل دینا۔“

وہ جو یا سے مخاطب تھا اور اپنے بتائے ہوئے حل کا مزا اسے ابھی سے آنے لگا تھا۔ آپا گل جیسی عقل مند نے بھی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

”میں اسکول ہو کر ابھی کھنٹے بھر تک آتی ہوں آپا اور امی کے لیے میں نے۔ کچھ ڈی بنا کر رکھ دی ہے۔ اگر وہ کھائیں تو آپ کھلا دیجیے گا۔“

مسلمان کی بات کو ان سنا سار کرتے ہوئے اس نے آپا گل کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

مسلمان اور آپا گل دونوں ہی کی آنکھوں میں معنی جیزی سی اتری۔ ”اسکول تو بند ہیں وہاں کیا کرنے جا رہی ہو؟“

”افس کھلا ہوتا ہے، میرے بیسے باقی ہیں ان پر۔ اس کا پتا کرنے جا رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جاؤ، مگر دیر مت کرنا۔“ آپا گل کو پیسوں کا سن کرنی الفور اطمینان حاصل ہوا تھا۔ خود وہ مسلمان کو لے کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھیں۔

سارے اختلافات کے باوجود وہی ایک مضبوط اتحادی تھا گھر میں اور فرید الدین جیسے سنجیدہ معاملے میں اس کا ساتھ ہونا بہت بڑی سپورٹ تھی۔

”میں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ ہم شادی گھر پر ہی کریں گے۔ چار آدمی لا کر نکاح کریں۔ بعد میں کریں ولیمہ کہیں بھی قایم و نواز اشارہ والے ہوئیں گے۔“

مسلمان کے چہرے پر طنز ہی مسکراہٹ آئی۔

”تم بھی نا آپا گل! جب کسی کو چڑھانے پر آتی ہو تو بالکل ہی آنکھیں بند کر لیتی ہو قایم و نواز اشارہ والی شکل نہیں ہے فرید الدین کی، کسی ٹھکے ہوئے شادی ہال یا پھر گلی میں ٹینٹ لگا کر ولیمہ ہو گا جو یا کا۔ دیکھ لیتا۔“

”اچھا اور مہر کتنا؟“

”مہر۔“ وہ سوچ میں پڑا۔ ”ایک نہیں، دس پانچ لاکھ رکھو الو!“

”پانچ بہت زیادہ ہے، لاکھ سے زیادہ نہیں رکھنے والا وہ آدمی۔“ انہوں نے قطعیت سے سر ہلایا۔ مگر وہ پھر بھی اصرار کے گیا۔

”کو شش تو کرنا دیکھو وقت کا کچھ پتا نہیں۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ کیا شان و شوکت کی زندگی تھی میری، یہ تمہارا فرید الدین تو تیل بچتا ہے ذوبے کے آگے۔“

اپنی بات کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔  
حسروں کا کچھ شمار نہیں تھا۔

کیا شان تھی محسے میں، جب ذوبہ اور مسلمان کی منگنی کا سامان اتر رہا تھا۔ وہ درجنوں پھلوں، مٹھائیوں اور ڈرائی فروٹ کے ٹوکڑے، تحفے میں آئے سونے کے زیورات۔

زمین پر پیر رکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔  
ایک چھوٹے پل میں آپا گل فرش سے عرش پر اور پھر واپس بڑے زور سے فرش پر پٹی گئیں۔

انہوں نے بے چین ساہو کر ہلبدلا۔ جو یا اتنی دیر میں ان لوگوں کے سامنے سے گزر کر جا چکی تھی۔  
”کچھ پتا نہیں ہو تا فرید الدین جیسے لوگوں کا کھل کو کوئی پتی یا جوان اولاد اٹھ کر سامنے آئی تو فیصلہ کرانے میں آسانی ہو گی۔“

”وہاں دعوت میں تو تم بہت فرید الدین کی تعریفیں کر رہے تھے۔ بھائی بیٹا لیا تھا اسے، اب سارے شکوک شبہات یاد آ رہے ہیں۔“ آپا گل چڑھی گئیں۔

”اس وقت تعریف ضروری تھی مگر اس وقت تحفظات، اہم ہیں۔ اس بار غلطی نہیں کرنی اور دیر بھی نہیں۔“  
آپا گل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”امی نے بے وقت بستر پڑ لیا ہے۔ دیر تو ہماری طرف سے ہی ہو رہی ہے۔ کیا سوچتا ہو گا فرید الدین کہ دعوت کھا کر گئے تو خود ایک بار بھی جھوٹے منہ نہیں پوچھا۔ وہ تو میں ہی امی کی بیماری کو بدھا چڑھا کر سناے جا رہی ہوں۔

ایک دن تو اسپتال تک میں داخل کروا تھا۔“

”چھ کیا؟ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ آج کل میں ہی بلا لیں۔ گھر میں پریشانی کا بہانہ ہے۔ کوئی خاطر مدارات بھی نہیں کرنی پڑے گی۔“ مسلمان کے کہنے میں یاد باسا جوش تھا۔

آپا گل نے پر سوچ نگاہوں سے مسلمان کی طرف دیکھا۔

”امی نے توجہ ان کی مرضی ہو گی تب ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ والد صاحب وہاں جیل میں جا کر ایسے بیٹھے ہیں کہ اللہ ہی ہے جو وہاں سے واپس ہو، سارے مسائل ہم لوگوں کے لیے ہی رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کون سی خوش قسمت اولادیں ہوتی ہوں گی جن کے ماں باپ انہیں سیٹ کرتے ہوں گے۔ یہاں تو ماں باپ خود مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔“

یہاں اگر آپا گل اس سے سو فیصد متفق تھیں۔

”اب دیکھ لو اس روز کیا بواؤ لے پن کا مظاہرہ کیا امی نے فرید الدین کے ہاں، کیا تک تھی نیچے جا کر بیٹھنے کی، اگر



دل گھبرایا تھا۔“

جویا واپس آئی تب تک وہ دونوں اسی طرح محو گفتگو تھے۔

”نیچے کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا سلمان بھائی! وہ دروازے میں کھڑی کہہ رہی تھی تب ان دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔“

”ہاں مجھے پتا تھا کہ تم جلدی آجاؤ گی! اس لیے نہیں بند کیا تھا۔ پیسے مل گئے تمہیں، کتنے ہیں؟“  
”آپ نے ان کی کو۔۔۔ کچھ ہی کھلا دی تھی۔“ ان دونوں کے کہنے کو ان سنا کر کے وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔  
آپاگل کا جواب ان کے چہرے کے تاثرات سے مل رہا تھا۔ بنا کوئی دوسرا سوال کیے وہ تیزی سے شاکرہ امی کے کمرے کی طرف دوڑتی ہوئی گئی تھی۔

دروازہ نیم ہوا تھا۔

اور شاکرہ امی کچھ آڑے ترچھے سے انداز میں بیڈ پر ہی تھیں۔

عجیب غیر معمولی سا احساس۔

ایک لمحے کے لیے تو جویا کو پیروں پر کھڑا رہنا بھی محال ہوا تھا۔

”امی!“ آواز اس کے لبوں سے بھی نہیں نکل سکی۔ اپنی ساری ہمت جمع کر کے اس نے انہیں سیدھا کیا۔

وہ ہوش میں تھیں۔ لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہی تھیں۔

شاید انہیں پیاس لگی تھی اور کسی کو نہ پا کر انہوں نے خود سائیڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھانا چاہا تھا۔ جویا نے سہارا لے کر انہیں کچھ اوپر کیا اور پانی کا گلاس ان کے منہ سے لگایا۔ بہت ذرا سا وہ پی پائیں اور باقی یوں ہی بنے لگا۔ جویا نے انہیں لٹا کر ان کا چہرہ صاف کیا۔

تب ہی اسے دروازے میں زویا نظر آئی۔ وہ ابھی کالج سے واپس آئی تھی۔ جویا کے بری طرح دھڑکتے ہوئے دل کو سہارا ملا۔

”زویا! ایسوی لینس بلواؤ، ہم امی کو اسپتال لے چلتے ہیں۔ وہاں ایک بہتر دیکھ بھال تو ہو جائے گی ان کی۔ یہاں تو اتنے دن سے بس یوں ہی۔۔۔“

زویا نے اس کی بات کے دوران ہی ایسوی لینس کے لیے نمبر لایا تھا۔

جویا نے بڑی تیزی سے ضروری چیزیں اکٹھی کرنی شروع کی تھیں۔



عصر کی نماز ابھی کچھ دیر پہلے پڑھ لی گئی تھی اور روشن، کھلے کھلے بڑے ہال میں ایک سعد ساعت اتری تھی۔

”زرینہ بیگم، بنت وزیر علی، آپ کا نکاح، ہمراہ راجہ ولد۔۔۔“

آسمانوں پر ہوا فیصلہ آج وقوع پذیر تھا۔

زری نے جھکی جھکی نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔ سب ہی جمع تھے۔ سکھر سے آئے اس کے رشتے دار خالہ بتول، راجو کے ساتھ آئے چند قریب ترین لوگ اور یہاں گھروالے۔

اس کی نگاہ ایک چھوٹے سے بل میں جائزہ مکمل کر کے معاذ پر ہی رکی تھی۔

وہ قریب بیٹھا نکاح نامے کے کاغذات کو دیکھ رہا تھا اور چہرے پر بڑا نمایاں سا اطمینان پھیلا تھا۔

زری نے ایک گہری سانس اندر ہی اتاری۔

وہ یہی سکون دیکھنے کی متمنی تھی، جس کی درخواست خود معاذ نے اس سے کی تھی۔



”میری خاطر زری! تم شادی کر لو گی تو مجھے سکون مل جائے گا۔ بہت بڑا بوجھ ہے۔“  
سو آج وہ بوجھ ہمیشہ کے لیے اتر ا۔

تقدیر کا فیصلہ اپنی جگہ ٹکرا س نے تو صرف اس ایک حکم کی تعمیل ہی کی۔  
تب ہی معاذ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو زری نے جلدی سے نظرس جھکا لیں۔ معاذ نے شاید کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے نکاح کے پیر سائن کروانے کے لیے قریب آ گیا تھا۔  
”یہاں سائن کرو زری!“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

سامنے کھلے کاغذ پر سائن کی جگہ پر انگلی رکھے اس آخری مرحلے پر بھی وہی مددگار تھا۔  
زری نے دل حلق میں آتا ہوا محسوس کیا۔

”بس یہ چند آخری بل پھر تو شاید تنہائی میں بھی اس کے بارے میں سوچنا اپنے آپ سے شرمندہ کرے گا۔“  
”سائن کرو زری!“ اس کے برابر میں ایک طرف ابا اور دوسری طرف سعیدہ بھابی کے سکھر سے آئے چچا بیٹھے تھے۔

کون گواہ تھا کون وکیل۔

اس کی نگاہ صرف معاذ کی انگلی پر جمی تھی۔  
خالی جگہ جو اس ایک نام کی منتظر تھی، بھری گئی۔

یہاں اور یہاں اور۔۔۔  
وہ صحنے پلٹ کر جہاں کہتا گیا وہ اپنا نام لکھے گئی۔  
کارروائی تمام ہوئی۔

معاذ نے اس کے قریب سے اٹھتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اس کے سر کو چھوا تو اس کے ضبط کی ہر حد ختم ہوئی تھی۔

مرد حضرات کا یہ چھوٹا سا مجمع چھٹ کر اب سامنے ہال کے دوسرے حصے میں بیٹھے دو لہما کی طرف منتقل ہوا تھا۔  
نکاح کی کارروائی وہاں مکمل ہوئی تھی۔ یہاں دادی تھیں جو روتی بلکتی زری کو تسلی دیتے ہوئے خود کتنے ہی آنسو بہا چکی تھیں اور دادی کو سنبھالتی ہوئی ربیعہ۔  
دل کی گہرائی کو چھوٹی ہوئی یہ گھڑیاں ہر آنکھ کو پر نم کر رہی تھیں۔ زری سے ہمہ وقت خائف رہنے والی شائستہ۔

ایک ناگوار بوجھ کی طرح بچ کر جانے والی سعیدہ تکیہ بار بار اپنے آنسو صاف کر رہی تھیں۔  
نکاح کے بعد کی دعا ختم ہوئی تو مبارک باد کا سلسلہ۔ دادی نے قریب ہی بیٹھی گیتی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔  
”ہم تو خیر بیوے ہیں بھگینیا! تم تو یہ لہما کی خاص بہن ہو۔ تم کس خوشی میں آنسو بہا رہی ہو۔“  
گیتی شرمیلے سے انداز میں ہنس پڑی تھی۔

معاذ نکل کر برآمدے میں آیا تھا۔

سامنے کے احاطے میں کھانے کی میزیں بڑے سلیقے سے لگی تھیں۔ لیکن کھانے میں ابھی دیر تھی۔ فی الحال ڈپرکس اور اسمتھکس وغیرہ کی سرونگ تھی۔ یہ سارا انتظام ابا نے خاص طور پر خود کیا تھا۔ سو بڑی بے فکری سی تھی۔

فضائیں اڑتی مزے داری خوشبو نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ آج واقعی بہت خوش تھا۔

ایک فرض جو خوبی ادا ہوا اور ایک خوف جو دل و دماغ پر بوجھ سا طاری کرتا تھا، رفع ہوا۔ اوپر آسمان کی طرف

دیکھتے ہوئے معاذ نے بدل سے رب کا شکر ادا کیا۔

آس پاس چند لڑکے نظر آ رہے تھے جو مدد کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ لیکن خیام کہیں نہیں تھا۔  
بہت دیر سے وہ اس کا منتظر تھا۔ ابا بھی پوچھ چکے تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ اب تک غائب تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے خیام کا نمبر ملایا تھا۔ دو تین باری کو پیش کے بعد وہ مل ہی گیا۔

”اس طرف اچانک ہی فائرنگ ہو گئی ہے۔ معاذ بھائی! میں تو نکل چکا تھا، مگر بھگدڑا تھی تھی کہ واپس آنا پڑا۔  
سب کچھ بند ہے اس طرف۔۔۔“

کراچی کے حالات کی برسوں سے ایک سی غیر یقینی صورت حال۔

”ٹھیک ہے، تم بس اپنا خیال رکھو۔ خواجہ خانہ نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ فون بند کر کے پلٹا تو اندر سے سالار آ رہا تھا۔

معاذ ہلکے سے مسکرایا۔

”شکر ہے سب کچھ خیریت سے ہو گیا۔ آپ نے ایک بڑی ذمہ داری میرے اوپر سے ختم کی ہے سالار! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔“

”ہماری نیت اچھی تھی معاذ! اب خدا کرے کہ یہ دونوں اپنے اپنے دکھ بھول کر بہت محبت بھری زندگی گزاریں۔“ سالار اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔

”میں بہت خوش ہوں معاذ! مجھے لگنے لگا ہے کہ اللہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ ورنہ وہ مجھے تم لوگوں جیسے پیارے انسانوں سے کیوں ملواتا۔ کتنی جیسی بیوی کیوں عطا کرتا، یہ سب اس کی مہربانی ہی ہے نا۔“

سالار کی آواز بوجھل سی ہوئی۔ معاذ اس کی دلی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہا تھا اور زندگی کا ایک لمبا عرصہ سخت تنہائی کے عالم میں کاٹ چکا تھا۔

”مجھے اب لگتا ہے جیسے میرا بھی ایک خاندان ہے، سر پر بزرگ ہیں اور تم جیسا بھائی۔“ اپنی جذباتیت پر قابو پاتے ہوئے اس نے بے تکلفی سے معاذ کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ مارا۔ ”اور تم جیسا بھائی جو اب تک کنوارا پھر رہا ہے۔ ربیعہ کے ساتھ تمہاری شادی بھی ہو جانی چاہیے۔ بات کروں گا کسی وقت فرصت سے۔“

معاذ صرف اس کا دل رکھنے کے لیے مسکرایا تھا۔ زندگی کو گلے جو یا نام کے دکھ سے سالار ابھی تک ناواقف تھا۔  
تو یہ بھی اچھا ہی تھا۔

”چلیں آئیں اندر چلتے ہیں۔ میں اور آپ دونوں ہی ایک ساتھ وہاں سے غائب رہے تو اور کوئی نہ سہی ابا ضرور ہمیں ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ جا میں گے۔“

اس نے کہتے ہوئے سالار کے ساتھ واپس ہال کا رخ کیا۔

زری بالکل سامنے بیٹھی تھی اور اب نکاح کے بعد راجو کو بھی ساتھ لا کر بٹھادیا گیا تھا اور وہ دونوں ایک ساتھ کتے اچھے لگ رہے تھے۔ اس میں کوئی دوائے نہیں ہو سکتی تھیں۔

سالار کو اندر داخل ہوتے ہی ابا نے آواز دے لی تھی، مگر وہ چند لمحے دروازے میں کھڑا زری اور راجو کو ہی دیکھے گیا۔ زری اب بالکل بھی نگاہ نہیں اٹھا رہی تھی۔ خاموش، معصوم، بے ضرر۔

اودھ جتنی بار بھی اس کی طرف دیکھتا، دل کا زمینان پہلے سے بھی بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

سو شکر ہے جو وہ اس مشکل مقام سے سرخرو ہو کر گزرا۔

ربیعہ فونو نیشن کے لیے آواز دے رہی تھی۔ معاذ کو متوجہ ہونا پڑا۔



ہسپتال کی پرہجوم ایمرجنسی کے باہر گزرا وقت صبر آزمایا تھا۔ مگر اس کے اختتام پر شاگرد امی کی طبیعت سنبھلنے کی اچھی خبر تھی۔

زویا اور جویانہ اطمینان کی سانس لی تھی۔

”دون دن ہسپتال میں انڈر آبزرویشن رکھ کر چھٹی دے دیں گے ان شاء اللہ۔“ مہمان لہجے والی ڈاکٹر بیماری کی تفصیل کے ساتھ آگے کا پروگرام بتا کر جا چکی تھی۔

تب ہی آپاگل کا فون ایک بار پھر آیا تھا۔

”جب طبیعت سنبھل گئی ہے تو گھر لی آؤ۔ یہ ہسپتال والے تو اپنا بل بنانے کے چکر میں یوں ہی مریض کو داخل کر لیتے ہیں۔ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو۔ مگر تم تو عقل پکڑو۔“

وہ سرے سے ہسپتال لانے کی ہی مخالف تھیں نہ کہ اب ایڈمٹ ہونا۔

جویانہ فون خاموشی سے زویا کو پکڑا دیا۔ وہ ان سے سننے کی بہتر صلاحیت رکھتی تھی۔

”دو ہی دن کی تو بات ہے۔ امی کا بی بی بے حد بڑھ رہا تھا۔ اب کہیں جا کر نارمل ہوا ہے۔ پھر کتنا تیز بخار تھا۔ میں نے آپاگل سے کہہ دیا ہے کہ ہم انہیں دون دن ہسپتال میں ہی رکھیں گے۔“

زویا۔ ”نیاس آکر اسے بتایا تو وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔“

شاگرد امی اب ٹھیک تھیں۔ کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد انہوں نے زویا اور جویانہ سے دو چار باتیں بھی کیں۔ تھوڑا سا دلیہ کھایا اور پھر گمری نیند سو گئیں۔

”دواؤں کی وجہ سے آج رات غفلت بھی رہے گی اور جتنا سوئیں گی اتنا ہی اچھا ہے ان کے لیے۔ بہت اچھا ہوا جویا! جو ہم امی کو یہاں لے آئے۔“

”ہاں!“ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں زویا کو دیکھا۔ ”میں بہت ڈر گئی ہوں زویا! امی اس طرح کبھی بہت نہیں ہارتیں۔ مگر یہ پورا ہفتہ ایسا گزرا جس میں وہ ایک بار بھی اٹھ کر کھڑی نہیں ہوئیں۔ بخار تو انہیں پہلے بھی کئی بار آیا ہے۔“

زویا کی آنکھوں میں کچھ الجھن سی تھی۔ ”اس روز فرید الدین کے ہاں کچھ ہوا تھا کیا؟ وہیں سے بہت اپ سیٹ آئی تھیں۔ آپاگل اور سلمان بھائی نے تو دماغی دورہ تک قرار دے دیا تھا۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”پتا نہیں۔ مجھے نہیں اندازہ زویا!“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

زویا بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

اس کی رنگت بالکل پھیکا پڑ چکی تھی اور شاید وہ اتنا صبر کر چکی تھی کہ اب اس کے احساسات کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں رہا تھا۔

”تمہیں فرید الدین کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیا؟“ پچھلے موضوع کو ادا ہو چھوڑ کر زویانہ بے ساختہ ہی اس سے پوچھا تھا۔

وہ یوں ہی خاموشی سے فرش کو نکتے لگتی۔

”کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے۔“ کسی کسی وقت زویا کو اس پر بڑے زور کا غصہ آتا تھا۔

”اس وقت اس بات کی کوئی تک نہیں ہے زویا! ابھی یہ فرید الدین کہاں سے آگیا؟“ اس بار جویا کو اس کی طرف دیکھنا پڑا۔

”وہ آپاٹھیں آچکا ہے اور اگر تم یوں ہی خاموش بیٹھی رہیں تو ان لوگوں کو جو کچھ کرنا ہے مگر گزریں گے۔“ آپا گل کا پھر فون آ رہا تھا۔

اس بار جویانہ خود ہی ریسپو کر لیا۔ زویا کے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے سے فرار ہی سی۔

دوسری طرف آپاگل جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

”تم سب تو آرام سے ہسپتال میں جا کر بیٹھ گئے ہو، کسی ایک کو تو گھر پر بھی رہنا چاہیے تھا۔ سلمان کا کھانا ہی بنا جاتیں وہ اتنا پریشان بیٹھا ہے، میں نے تو کہہ دیا کہ ایک انڈیا بنالے اور ڈبل روٹی سے کھالے، مگر اس کے تو خعرے ہی اتنے ہیں کہ۔“ وہ اپنے گھر پر بیٹھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب بھی انہیں کوئی ذمہ داری بانٹنے کا خدشہ

ہوتا وہ اسی طرح راہ فرار اختیار کر لیتی تھیں۔

جویانہ خاموشی سے سیل فون آف کیا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا جویا۔“ زویا بات کا سرا تھاے منتظر تھی اور وہ آپاگل نہیں تھی جو آسانی سے ہنستے بھاگ نکلنے کا رستہ ڈھونڈ سکتی۔

”میرے پاس کسی کے سوال کا جواب نہیں ہے زویا! مت پوچھو کچھ بھی پلیز۔“ اس کے انداز میں عجیب سی بے بسی تھی۔

”تو تم انہیں کچھ نہیں کوئی۔ ٹھیک!“

اس بار اس نے زویا کی بات کی تردید یا تصدیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

ہسپتال کے اس خاموش سنسان کمرے میں بڑا بوجھل سا احساس پھیلا تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر اس بار یہ لڑائی میں اکیلی لڑوں گی۔ دیکھوں گی کون کرتا ہے من بانی اور اگر وہ سب زبردستی کریں گے تو میں اور تم کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔ چاہے اسلام چچا کے گھر میں۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا زویا۔“ بہت تیزی سے جویانہ اس کی بات کا ٹلی تھی۔ ”اور ذلیل کروانا ہے کیا اپنے گھرانے کو سوج سمجھ کر بولا کرو۔“

بہت دن بعد وہ اس طرح غصے میں آئی تھی۔ ”اور میرے بارے میں اتنی فکر مند مت ہو تم، ہزاروں لاکھوں لڑکیاں یوں ہی جی لیتی ہیں۔ اپنی زندگی کے مطلب، معنی کھو کر۔ مجھ سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ حالات میں تو میں کوئی زمانے سے علیحدہ ہو تیں! کچھ انوکھا تو نہیں ہو رہا میرے ساتھ جو پہلے کسی کے ساتھ نہ ہوا ہو۔“

زویانہ بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا جویا! کہ تمہیں وہ سب قبول ہوگا۔“

”مجھے وہ سب قبول ہے زویا! جو امی کہیں گی۔ میں ان کے کہے کسی حکم سے باہر نہیں ہوں گی۔ میرا بس یہ فیصلہ ہے۔“ وہ اٹھ کر شاگرد امی کے قدموں کے پاس جا کر بیٹھی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے، بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکانات کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



# قصہ

ذرا برابر اہمیت نہ دی اور بواجی کو میرے لیے رشتہ ڈھونڈنے کا ٹاسک سونپ دیا۔  
بواجی بہت بھروسے کی خاتون ہیں۔ میری بہنوں کی شادیاں بھی ان ہی کے توسط سے انجام پائی ہیں اور آج کل بواجی میرے لیے دھڑا دھڑرتے لا رہی ہیں۔

صرف ایک ہی شرط رکھ دی کہ میرے لیے ایسا لڑکا ڈھونڈے جس کا گھر نہ مختصر ہو اور ساس کا ٹٹا تو ہرگز نہ ہو یعنی میں جس کو پیاری ہوں اس کی والدہ محترمہ اللہ کو پیاری ہو چکی ہوں۔  
ای نے میری اس فرمائش کو احمقانہ گردانتے ہوئے



پچھلے ہی دنوں میں نے اپنی بائیسویں سالگرہ منائی تھی۔ ابھی تو میرے زندگی انجوائے کرنے کے دن تھے، لیکن ای کو یہ بات کون سمجھاتا۔ وہ میری آزادی سلب کرنے کے درپے تھیں۔

بڑی تینوں بہنوں کے حالات میرے سامنے تھے۔ مانا کہ تینوں اپنے گھروں میں سیٹ ہیں اور خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہیں، پھر بھی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے تو دبیں ہیں نا۔ ماشاء اللہ تینوں ہی بھرے بے کنبوں میں بیباہی گئی ہیں اور تینوں کی ساس محترماتیں تھوڑی بہت نہیں، اچھی خاصی خراش ہیں اور ان کی ازدواجی زندگیوں کے سکون کو درہم برہم کرنے کی اپنی سی کوششوں میں لگی رہتی ہیں۔ شکر ہے کہ ان کو مایاں اچھے ملے ہیں، سوشو ہوں گی خاطر ساسوں کے چنگھے جیلے، طعنے اور طنز نہ ہی خوشی سننے پر مجبور ہیں۔ ہاں! ایسے آنے کے بعد سسرال والوں کی دل کھول کر برائیاں ضرور کرتی ہیں اور جی ہلکا پھلکا کر کے پھر سے سسرال سدھار جاتی ہیں، لیکن میں اپنی بہنوں سے ذرا مختلف ہوں۔

مجھ میں ضبط اور برداشت کی نہ صرف کمی ہے، بلکہ اگر کوئی مجھ سے ناروا رویہ اپناتا ہے تو میں اس سے ہنس ہنس کر بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔  
چھٹی آیا کرتی ہیں کہ ”کڑیا! سسرال میں زندگی گزارنے کے لیے مفاہمت اور مصلحت سے کام لیتا پڑتا ہے۔“ لیکن میں ایسی مصلحت کو منافقت شمار کرتی ہوں۔ اسی لیے تو میں نے ای کے سامنے شادی کی

تینوں آپائیں آج پھر مجھے سمجھانے کے لیے اکٹھی ہوئی تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اکٹھی کی گئی تھیں۔ امی مجھ سے عاجز آئی ہوئی تھیں۔ کل بواجی میرے لیے جو رشتہ لے کر آئی تھیں وہ امی کے حساب سے بہت مناسب تھا لیکن میں نے اس پر کئی اعتراض لگا کر رد کر دیا۔ امی تو میری مرضی اور رائے کو درخور امتنا ہی نہ جانتی تھیں لیکن بابا نے کہہ رکھا تھا کہ میری رضامندی کے بغیر کوئی رشتہ فاسل نہیں کرنا۔ امی کا خیال تھا کہ بابا نے مجھے بگاڑ رکھا ہے۔ میں بابا کی واقعی بہت لاڈلی تھی۔ حالانکہ بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ عموماً ”بڑا چہ لاڈلا ہوتا ہے یا سب سے چھوٹا یا پھر اکلوتا۔“ میرا کیس ان میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ میں چھ بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھی۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں، پھر میں اور اس کے بعد دو بھائی۔ امی تو بڑا اعتراف کرتی ہیں کہ مسلسل چوتھی بیٹی کی پیدائش پر انہیں دھچکا لگا تھا۔ دادی بھی منہ سے کچھ نہ کہتی تھیں مگر مجھے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آپس بھرتی تھیں۔ ایسے میں بابا نے مجھے اللہ کی رحمت قرار دیتے ہوئے مجھ پر بے تحاشا بار بھجوا کر کہا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے تو ان کا جنت میں داخلہ بالکل ہی کنفرم کر دیا ہے، خیر! بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں بتا رہی تھی کہ امی تین بہنوں کے فرض سے نمٹنے کے بعد سنجیدگی سے مجھے بھی ٹھکانے لگانے کا سوچ رہی تھیں، لیکن میں فی الحال اس معاملے میں غیر سنجیدہ



لیکن ان سب رشتوں میں قدر مشترک بڑی فیملی ہوتی تھی۔

میں جانتے بوجھتے اندھے کنویں میں چھلانگ کسے لگاتی، سہولت سے انکار کر دیتی اور اسی لیے تنگ آکر امی نے مجھے سمجھانے کے لیے آیاؤں کو بلوا بھیجا تھا اور اب تینوں آیاؤں مجھے گھیرے بیٹھی تھیں۔

”تصویر تو دیکھو ذرا لڑکے کی، کتنا پیٹنڈم ہے، پھر ویل کو ایفائیڈ۔ لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں ایسے

رشتوں کا۔“ منجھلی آپا نے لڑکے کی تصویر میرے سامنے رکھتے ہوئے سمجھایا۔

”مجھ میں اور دو سری لڑکیوں میں یہ ہی تو فرق ہے آپا! کہ میں خواب نہیں دیکھتی، بلکہ حقیقت کی دنیا میں رہتی ہوں۔“ میں نے رسائیت سے کہتے ہوئے تصویر پیچھے ہٹا دی۔

”پتا تو چلے برائی کیا ہے اس رشتے میں۔“ بڑی آپا نے زچہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”برائی کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن بوا جی کے ساتھ موصوف کی والدہ محترمہ بھی تشریف لائی تھیں۔ مجھے تو انہوں نے دیکھتے کے ساتھ ہی اوکے کر دیا مگر میں انہیں اوکے نہ کر سکی، اتنی یگ سی لگ رہی تھیں وہ خود اگر خراث قسم کی ساس ثابت ہوئیں تو ان کے مرنے کے انتظار میں میں تو خود بوزھی ہو جاؤں گی۔“ دیکھ رہے ہونا تم لوگ، کیسی عاقبت اندیش لڑکی ہے اب میں بغیر ساس کا سرال کہاں سے ڈھونڈوں اس کے لیے۔“ امی نے مجھے غضب ناک نگاہوں سے گھورا۔

”ضروری نہیں چند! کہ ہر ساس خراب ہی نکلے۔“ بڑی آپا نے مجھے پکارا۔

”تو انسان رسک لے ہی کیوں؟“ میں اپنی بات سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

”اچھا تو پھر شہناز خالہ کے فواد میں کیا برائی ہے بے چاری شہناز خالہ تو تقریباً ”بستر مرگ“ پر ہی ہیں۔“

منجھلی آیا کو ایک اور رشتہ یاد آیا۔ شہناز خالہ امی کی

دور پرے کی کزن تھیں۔ وہ بھی اپنے بیٹے کے لیے میری طلب گار تھیں۔

”آپا! آپ کو یاد ہے، آپ کی ساس بھی شادی سے قبل بستر مرگ پر دکھائی دیتی تھیں، لیکن انہوں نے شادی کے بعد آپ سے اتنی خدمتیں کروائیں کہ پھر سے بھلی چنگی ہو گئیں اور شہناز خالہ تو توبہ منگتی ہٹلر ٹائپ خاتون ہیں۔ بڑی دو سوؤں کا کیسے ناک میں دم کر رکھا ہے۔“

”اچھا تو شہناز بھو کے دیور کا بیٹا۔ اس کی والدہ تو بے چاری شکل سے ہی بہت مسکین اور سیدھی سی لگتی ہیں۔ وہ اتنی خراث ساس ثابت نہیں ہوں گی۔“ چھوٹی آپا نے رشتوں کی بھاری میں سے ایک اور رشتہ باہر نکالا۔ مجھے ہنسی آگئی تھی۔

”پلیز آپا! آپ لوگوں کو میری شادی کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آپ لوگوں کی شادیوں کے بعد میں نے بڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داری بھی سنبھال رکھی ہے۔ آصف، آصف ابھی چھوٹے ہیں۔ آصف کی شادی میں ابھی کم از کم چار پانچ سال ہیں، میری بھی شادی ہو گئی تو گھر کا انتظام کیسے چلے گا۔ کچھ عرصہ تو مجھے امی بابا کی خدمت کر لینے دیں۔“

میں نے امی کے شانے پر لاڈ سے سر نکایا تھا۔ ”اللہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت رکھے۔ چار بندوں کا کھانا پکانا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے اور یہ جو گھر چمکاتی رہتی ہو تو دو چار سو روپے دے کر کوئی ماسی رکھ لوں گی۔ غضب خدا کا گھر کے کاموں کے لیے تمہاری عمر نکال دوں؟ ہم باز آئے تمہاری ایسی خدمتوں سے۔“ امی کو آج مجھ پر زیادہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

”اچھا اب چھوڑیں بھی امی! صبح تو کہہ رہی ہے، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اپنے گھر میں جتنے عیش کرنے ہیں کر لے۔ شادی کے بعد تو گھر داری کے جتنی جھٹ میں پھنسنایا پڑتا ہے۔“

منجھلی آپا نے اپنے بیٹے کو تھکتے ہوئے میری حمایت لی۔ بڑی اور چھوٹی آپا نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، یوں میٹنگ بغیر کسی نتیجے کے برخواست ہو گئی،

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

چار دن بعد بوا جی خراہاں پھر تشریف لا رہی تھیں۔

”آپ تو ایسا رشتہ لائی ہوں بیٹا! کہ تمہیں ہاں کرتے ہی ہے گی۔“

نسب کی حد تک وہ میری ڈیڈ انڈز سے واقف تھیں، جب ہی ہنستے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”جلدی بتائیں بوا جی! کیا رشتہ لائی ہیں آپ۔“ میں نے مزے لے کر پوچھا۔ بوا سے ہم بہن،

بھائیوں کا تکلف کا رشتہ تو تھا نہیں وہ ہمارے مزاجوں سے آشنا عشیق مزاج خاتون تھیں۔ میرے انداز پر ہنس پڑیں۔ البتہ امی کو اس بے تکلفی پر غصہ آیا تھا، جب ہی مجھے کڑے تیروں سے گھورا تھا۔

”جاؤ چائے بناؤ بوا جی کے لیے۔“ اس سے پہلے میں بوا جی سے کچھ سن گئی لے پانی انہوں نے مجھے منظر نامے سے غائب کرنا چاہا۔

”فوفہ امی! رشتے کے متعلق تو جان لینے دیں۔“ میں ٹھنکی۔

”سامعہ! بیوگی مجھ سے۔ کم عمر لڑکیاں اپنی شادی سے متعلق یوں منہ بھڑا کر باتیں کرتی اچھی نہیں لگتیں۔“ امی نے اس بار مجھے ڈانٹ ہی دیا۔

”طوبی! کم عمر لڑکیاں شادی کر سکتی ہیں مگر شادی کے متعلق بات نہیں کر سکتیں۔“ میں منہ پھلا کر کمرے سے نکل گئی۔ بوا جی کے جانے کے بعد امی مسکراتے ہوئے میرے پاس آن پہنچیں۔

”سات بہن، بھائیوں میں آخری نمبر ہے لڑکے کا۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔

”آخری بیٹیں انوکھا لاڈلا ہوتا ہے۔ میری طرف سے انکار۔“ میں جھٹ بول اٹھی۔ امی نے ذرا سا گھورا مگر بات جاری رکھی۔

”ایک ٹیکریکل انجینئر ہے۔ تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور فیملی بھی خاصی دل آف ہے۔“

”اس کی بیوی چوڑی لیٹی، ہرگز نہیں۔“

”ممارے بہن، بھائی شادی شدہ ہیں۔“ امی نے جیسے میرا اعتراض سنایا نہیں۔

”پھر تو اور بھی مسئلہ ہے۔ شادی شدہ مندوں کے ساتھ، جیٹھائیوں کا رعب بھی سہنا پڑے گا۔“ میں اب بھی انکاری تھی۔

”والدین کا ایک عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔ سب بہن، بھائیوں کی الگ الگ رہائش ہے۔ آخری الحال تو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتا ہے، لیکن شادی کے بعد وہ بھی الگ رہائش رکھے گا۔“

امی نے سب سے اہم بات آخر میں بتائی۔ ”اوہ گریٹ!“ میں اچھلی ہی تو پڑی۔

”منظور ہے امی! موصوف منظور۔“ میں خوشی سے چمکتے ہوئے بولی۔ ساس فری سرال تو میرا دیرینہ خواب تھا اور یہاں ساس تو کیا کسی بھی سرالی رشتے دار کے ساتھ رہنے کا مفتا تھا ہی نہیں۔

”تمہارے منظور کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ دعا کرو وہ بھی تمہیں پسند کر جائیں۔“ امی نے جتلیا تھا۔ میں ہنس پڑی۔

”آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے امی! یہ پلاٹ رشتے ایسے ہی تو نہیں آ رہے۔“ میں نے شوخی سے کہا۔

”اچھا اب اتراؤ مت۔ اللہ نے اچھی صورت دی ہے تو شکر کرو اس کا اور دعا کرو کہ اللہ نصیب بھی اچھے کرے۔“

امی نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ میں نے فرماں برداری سے گردن ہلا دی تھی اور دو دن بعد لڑکے کی دو بڑی بہنیں اور دو بھائیوں بوا جی کے ساتھ مجھے دیکھنے آن پہنچیں۔

آج سے پہلے میں نے کبھی لڑکے والوں کی خاطر تیار ہونے کا تردد نہیں کیا تھا، بس منہ پر پانی کے چھپکے اور بالوں میں برش مار کر لڑکے والوں کے سامنے چلی جاتی، لیکن آج میں نے اپنی تیاری پر خصوصی توجہ دی تھی۔ کچن سنبھالنے کے لیے منجھلی آپا موجود تھیں۔ میں نے صرف ٹرائل اندر ٹھکٹ کر لے جانے کا فریضہ



انجام دیا۔

مکملی آپا نے فراخ دل سے اپنے سارے دن کی محنت کو میرا نام دے کر مہمانوں کو چیزیں سرو کیں۔ میں نے اس جھوٹ کو نظریہ ضرورت قرار دے دیا۔ یہ تھوڑا ہی تھا کہ مجھے یہ چیزیں بنانی نہیں آتی تھیں، بس آج اپنی تیاری پر خصوصی توجہ دینے کی وجہ سے مجھے کچن میں جانے کی فرصت نہیں ملی تھی اور اس تیاری کا فوری نتیجہ لڑکے والوں کی آنکھوں میں ستائش سے ظاہر ہو گیا تھا۔

خاصی مہذب اور پڑھی لکھی فیملی تھی۔ رکھ رکھاؤ میں تو خیر، ہم لوگ بھی کم نہ تھے۔ خاطر تواضع کے بعد لڑکے کی بڑی بہن نے شائستگی سے امی کو مخاطب کیا۔

”دیکھیے آئی! بیچی ہمیں پسند آئی ہے۔ ہم رسمی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت ہے ہی نہیں۔ بواجی نے آپ سے ذکر کیا ہو گا کہ میرے دوسرے ممبر کے بھائی آج کل اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ سے چھٹیاں گزارنے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ امریکی شادی ان کی موجودگی میں ہی ہو جائے۔ ذرا دھڑ مہینے بعد ان کی واپسی ہے۔ دراصل امر ہم سب کا لاڈلا چھوٹا بھائی ہے، اس کی خوشیاں دیکھنے کا سب کو ہی ارمان ہے۔“ انہوں نے متانت سے بات مکمل کی۔

”وہ تو ٹھیک ہے پراتی جلدی۔“ امی تو بوکھلا ہی گئیں۔

”مجبوری ہے آئی! چیز وغیرہ کی ہماری طرف سے کوئی ڈیمانڈ نہیں۔ یہ بات ہم محاورہً نہیں بلکہ حقیقتاً کہہ رہے ہیں کہ آپ شادی کی تیاریوں کی وجہ سے وقت مختصر جان کر پریشان نہ ہوں۔ ہم صرف آپ کی بیٹی کے طلب گار بن کر آئے ہیں۔ جتنی جلدی ہو سکے آپ امر کو اگر دیکھ لیں اور اگر اس رشتے پر دل مطمئن ہوتا ہے تو ہمیں آگاہ کر دیجیے، پھر ہم باہمی مشورے سے شادی کی تاریخ طے کر لیں گے۔“

ان کے لہجے کا یقین ظاہر کر رہا تھا کہ امی ان کے بھائی کو ناپسند کر رہی نہ پائیں گی اور ہوا بھی یہی۔ دو تین دن بعد امی، بابا، بڑی آپا اور بھائی جان (ہسنوی) جاکر احمر کو سند قبضہ لے کر بخش آئے۔

میرے تو اس ہی کام نہ کر رہے تھے۔ من پسند رشتہ مانا الگ بات تھی مگر یوں اتنے شارٹ نوٹس پر اپنا گھر بار، والدین، چھوٹے لاڈلے بھائیوں کو چھوڑ جانا دوسری بات۔ میں اتنی جلدی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن اس بار امی تو امی، بابا نے بھی میری ایک نہ سنی اور مجھے احمر کے سنگ رخصت کر کے ہی دم لیا۔

\*\*\*

احمر کی رفاقت میں چند روز گزارنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ امی، بابا کا انتخاب میرے لیے ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی، جس نے مجھے احمر جیسے شخص کا ساتھ دیا۔ احمر بہت محبت کرنے والے، خیال رکھنے والے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شریک حیات کی عزت کرنے والے انسان تھے۔ میں اپنی زندگی سے بے حد مطمئن تھی اور امی، بابا مجھے مطمئن دیکھ کر مجھ سے بڑھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔

شادی کے ابتدائی چند دن میں نے اپنے جیٹھ کے گھر گزارے، جہاں پہلے احمر کی بھی رہائش تھی، لیکن کچھ دنوں بعد احمر نے ان کے قرب وجوار میں ایک چھوٹا سا خوب صورت تعمیر کیا گیا گھر کرائے پر لے لیا۔ ویسے تو میرے سسرالی ملندار اور خوش اخلاق ثابت ہوئے تھے۔ لیکن میں جانتی تھی کہ یہ دونوں کا اعزاز ہے۔ بڑی آپا وغیرہ جو بکری بھی میرے گھر آتے تو ہنس کر مجھے چھیڑتے۔

”واقعی سامعہ! تمہارے فلسفے پر ہمیں یقین آ گیا۔“ ساس اور سسرالی رشتہ داروں کے بغیر گھر میں کتنا سکون ہوتا ہے۔

”اللہ نظرید سے بچائے اور یہ سکون ہمیشہ قائم و دائم

رکھے، لیکن بڑا چند ماہ بعد جب تمہاری گود میں خیر سے تنہا مہمان آئے گا تب تمہیں سسرالی رشتہ داروں کی قدر و قیمت کا کسی حد تک اندازہ بھی ہو گا۔ اکیلی جان کو سو طرح کے مسئلے ہوتے ہیں۔ کوئی تجربہ کار بندہ پاس ہو تو یہ مرحلے آسانی سے نیت جاتے ہیں۔ اب میری ساس زبان کی لاکھ تیز سہی مگر زچگی سے پہلے اور بعد کے مرحلوں میں ان کا بہت تعاون رہا میرے ساتھ۔“

چھوٹی آپا مجھے کسی قدر ڈرا دیتیں، لیکن اللہ کا مجھ پر خاص کرم تھا۔ یہ سب مرحلے بھی بخیر و خوبی نپٹ گئے۔

ماہ کے ہونے سے چندہ، بیس دن پہلے میری بڑی نند

فرخندہ آیا اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ میرے پاس

رہنے آچکیں۔

وہ مزاج کی بہت اچھی خاتون تھیں۔ ان کی دونوں

بیٹیوں کی بھی مجھ سے اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔

فلزہ انیس سال کی اور عفرو سترو سال کی تھیں۔ دونوں ہی

بہت پیاری بچیاں تھیں۔ فلزہ کی پڑھائی میں دلچسپی ذرا

کم تھی۔ فرخندہ آپا کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر کتابیں اٹھا

لتی تھی۔ ہاں ابھر گئے سارے کام جھٹ پٹ پٹا لیتی،

پکین سے تو اسے خصوصی شفقت تھا۔ آج کل تو دونوں

بچیاں اپنے پیپرز بھگتا کر فارغ تھیں۔ انہوں نے مجھے

گھر کے کاموں سے بالکل ہی بے دخل کر دیا۔ فرخندہ

آپا بھی سلائی مشین سنبھالے کتھے مہمان کا ساز و

سماں تیار کرتی رہتیں۔

ایک چمکیلی صبح میری گود میں ننھی ماہ نے آنکھیں

کھولیں تو گویا میری اور احمر کی زندگی مکمل ہو گئی۔ ماہ دو

سال کی تھی تو اللہ نے ریاں کی صورت میں اس کا پیارا

سا بھائی بھی دے دیا۔ زندگی بہت بھرپور، مکمل اور

خوب صورت ہو گئی تھی۔ ہاں اگر تھوڑی بہت پریشانی

تھی تو امی وغیرہ کی طرف سے تھی۔ امی کی طبیعت

خراب رہنے لگی تھی۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے عارضوں

نے میری ہر دم متحرک رہنے والی امی کو بہت کمزور اور

نڈھال سا کر دیا تھا۔ بابا کے اپنے جوڑوں میں درد رہنے

لگا تھا۔ آصف و اصف اپنی پڑھائیوں میں مگن، کبھی

کالج، کبھی اکیڈمی تو کبھی یار دوستوں کے ساتھ باہر گھر

میں تنہائی اور سناٹے کا راج رہنے لگا تھا۔

میں ہر دیک ایڈیٹل گزارتی یا جب بھی امی کا تنہائی

سے دل کھلے آتا تو مجھے فون کھڑا دیتیں۔ باقی نہیں تو

سسرال والی تھیں۔ گھر واری کے جھجھکت میں ایسی

ابھی بڑی رہتیں کہ مہینوں بعد آنے کی فرصت ملتی۔

میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بھی تو احمر کے

ساتھ چلی جاتی۔ ورنہ آصف، و اصف میں سے کوئی

لے آ جاتا۔ میں جاتی تو امی کے منع کرنے کے باوجود

کتنے کام پٹا ڈالتی۔ کبھی گھر کی تفصیلی صفائی پر کمر باندھ

لیتی۔ کچن میں گھسی تو تین چار طرح کے کھانے بنا کر

فرز کر دیتی۔ دونوں بچے تو نانا، نانی اور ماموں سے لاڈ

اٹھوانے میں مصروف رہتے ہیں گھر کے کام پٹائی

رہتی۔ امی خفا بھی ہوتیں۔

”لوکیاں میکے آکر آرام کرتی ہیں اور تم پھر کی کی

طرح گھومتی رہتی ہو۔ میرے بچے! دو گھڑی سکون

سے ماں کے پاس بیٹھ جایا کرو۔ گھر کے کاموں کا کیا ہے،

یہ کبھی ختم ہوتے ہیں بھلا۔“

”گھر کے کاموں میں تو ہر وقت آپ ابھی رہتی

ہیں۔ صحت دیکھی ہے اپنی، کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔ ذرا

جو اپنا خیال رکھتی ہوں۔“ میں جواباً ”ان سے زیادہ خفا

ہوئی۔

”خیر سے آصف کی پڑھائی ختم ہو جائے، پھر ہولے

آؤں گی۔“ امی مسکراتے ہوئے مجھے تسلی دیتیں۔ سچ تو

یہ تھا کہ امی سمیت ہم سب بہنوں کو آصف کی شادی کا

بہت ارمان اور انتظار تھا۔

اللہ اللہ کر کے آصف کی پڑھائی پایہ تکمیل کو پہنچی

اور فوراً ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں زبردست سی

جاب بھی مل گئی۔ ماشاء اللہ قابلیت میں میرے دونوں

بھائی کسی سے کم نہ تھے۔ اب ہم ساری بہنوں نے

بھابھی ڈھونڈنے کی مہم شروع کر دی۔ بلکہ سب سے

پہلے تو آصف صاحب کو ہی پکڑ کر پوچھا تھا۔

”دیکھو! تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈنا شروع کر رہے

ہیں۔“



ہیں۔ تم بتاؤ اگر پہلے ہی کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے پھر نہ کہنا کہ پوچھا نہیں۔“

”میں شریف سبندہ بھلا اپنے لیے لڑکی کیسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ یونیورسٹی میں قدم رکھنے سے پہلے آپ سب لوگوں نے وارننگ دے دی تھی کہ خبردار! کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو تمہاری خیر نہیں۔“ آصف جل کر بولا تھا۔

”تو ظاہر ہے یونیورسٹی تمہیں بڑھنے بھیجا تھا یا لڑکیاں تاؤنے۔ خاندان برادری کی کوئی لڑکی پسند ہے تو بتاؤ۔“ بڑی آپا نے اسے مخاطب کیا۔

”اچھا خاندان برادری کی لڑکیاں تاؤنے کی اجازت دے رکھی تھی آپ نے۔ سوری! مجھے پہلے سے علم نہ تھا۔ ورنہ کوئی ڈھونڈ کر رکھتا۔“ آصف کے انداز پر ہم سب کو ہی ہنسی آگئی۔

”چلو اب اجازت ہے اپنے آس پاس کی سب لڑکیوں پر نگاہ دو! اور کوئی پسند ہے تو بتاؤ۔“

میں نے دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا اور آصف صاحب نے اس آخر سے بہت جلدی فائدہ اٹھالیا۔ میرے جیٹھ کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔ میرے میکے والے بھی مدعو تھے اور وہیں آصف صاحب کو فرخندہ آپا کی فلزہ پسند آگئی۔ مجھتے ہوئے اس نے ہم بہنوں کے سامنے اپنی پسند کا اظہار بھی کر دیا۔

”ارے واہ! اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ وہ تو سمجھو گھر کی پکی ہے۔“

ہم بہنوں نے اس کی پسند کو فوراً ”اوکے کر دیا تھا اور فلزہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس پر کسی قسم کے اعتراض کا جواز ہی نہ تھا۔ میں تو اسے قریب سے جانتی تھی۔ ہنس مکھ خوش اخلاق، منسلک اور سکھ ہمارے گھر کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت تھی۔

فرخندہ آپا کی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ نے اسے ماسٹرز کے مرحلے تک پہنچا دیا تھا۔ آج کل ایم اے انگلش کر رہی تھی وہ۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ خیال مجھے خود سے کیوں نہ آیا۔ پہلے مرحلے میں میں نے احمر سے

بات کی۔ ظاہر ہے انہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ لاڈلی بھانجی کے لیے آصف کا رشتہ انہیں ہر لحاظ سے بہترین لگتا تھا۔

اب فرخندہ آپا کا عندیہ لیتا باقی تھا۔ امید تو یہی تھی کہ وہ یہ رشتہ بلا تامل قبول کر لیں گی۔ ہماری شادی کو اتنے برس گزرنے کے باوجود ہم منہ بھانج کے مثالی تعلقات تھے۔ پھر آصف بڑھا لکھا، خوب صورت، برسر روزگار تھا۔ کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جس کو بنیاد بنا کر انکار کیا جاتا۔ پھر بھی اسی نے مجھے ہی ذمہ داری سونپی کہ پہلے میں فرخندہ آپا سے بات کروں۔ اگر وہاں سے مثبت عندیہ ملے تو امی اور پاپی ہمیں جا کر باقاعدہ رشتہ ڈالیں۔

میں اور احمر فرخندہ آپا کے ہاں جا کر بات کرنے کے لیے کوئی مناسب دن سوچ رہے تھے کہ وہاں سے خود بلاوا آگیا۔ فرخندہ باجی اور آفاق بھائی کے بچے ان کی شادی کی پچیسویں سالگرہ منا رہے تھے۔ سلور جوبلی کے موقع پر ہمیں بھی انوائٹ کیا گیا۔ سارے خاندان والے ہنسی خوشی تقریب میں شرکت کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ فرخندہ آپا تو بچوں پر خفا ہو رہی تھیں۔ لیکن ہم سب نے قریب کو خوب انجوائے کیا۔

یہ غیر رسمی یادگار تقریب رات گئے اختتام پذیر ہوئی۔ باقی سب مہمان تو رخصت ہو گئے۔ لیکن فرخندہ آپا نے ہمیں رات کے لیے روک لیا۔ ویسے بھی اسے دن احمر کا آف تھا۔ پہلے بھی دو چار میٹوں میں میں ایک، دو دن فرخندہ آپا کے ہاں گزارنے جاتی تھی۔ اس بار تو ان سے ضروری بات بھی کرنی تھی جو تسلی اور سکون سے بیٹھ کر ہی کی جاسکتی تھی، سو میں بخوشی رکنے پر راضی ہو گئی۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد میں فرخندہ آپا کے ساتھ مل کر کچن سمیٹ رہی تھی جب ہی مناسب موقع جان کر میں نے آصف اور فلزہ کے رشتے کی بات چھیڑ ڈالی۔

پکن سلیب صاف کرتے ہوئے فرخندہ آپا کے ہاتھ

رک گئے۔ ان کے لیے یہ بات یقیناً ”غیر متوقع تھی“ لیکن ذرا دیر بعد ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ پھیلی وہ بڑی حوصلہ افزا تھی۔

”آصف تو میرا دیکھا بھالا بچہ ہے، مجھے پسند بھی بہت ہے، لیکن میں تمہارے بھائی جان اور بچوں سے مشورے کے بعد ہی کوئی جواب دے سکوں گی۔“

”ظاہر ہے آفاق بھائی سے پوچھنا سب سے اہم ہے آپ ان سے بات کر بیچے اور فلزہ کی رضامندی بھی ضرور بیچے گا۔ یہ نیا دور ہے، ہمارے بچے بے حد سمجھ دار ہیں۔ ان کے مستقبل کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اگلی صبح کی بات تھی۔ میں نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر اپنے لیے چائے بنانے کچن کی طرف جا رہی تھی کہ عفرہ، فلزہ کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے رک گئی۔ کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔

فرخندہ آپا کی فیملی بھی سحر خیز تھی۔ سب باقاعدگی سے نماز فجر ادا کرتے تھے۔ یقیناً ”فلزہ اور عفرہ بھی نماز سے فارغ ہو کر حسب معمول بستر میں تھیں پس لڑا رہی ہوں گی۔ دونوں بہنوں میں ہلاکی دوستی تھی۔ میں بھی مسکراتے ہوئے کمرے میں جھانک کر انہیں چائے کی آفر کرنا چاہ رہی تھی کہ عفرہ کی آواز نے مجھے اپنے ارادے پر عملی جامہ نہ پہنانے دیا۔

”کیا ڈشنگ اور اسارٹ خفص ہیں آصف بھائی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو فوراً ہاں کہتی۔“ عفرہ نے کہا تھا۔ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رنگ گئی۔ گویا فرخندہ آپا نے رات کو ہی بچوں سے معاملہ ڈسکس بھی کر لیا۔ فطری تجسس نے مجھے چھپ کر بات سننے کی غیر اخلاقی حرکت پر مجبور کر دیا۔ میں فلزہ کا جواب جاننا چاہ رہی تھی۔

”تم میری جگہ ہوتیں تو تم بھی فوراً ہاں نہ کرتیں۔ جب اپنی زندگی کا معاملہ ہوتا ہے تو ہر شخص سوچنے کا

وقت چاہتا ہے۔“ فلزہ کچھ چڑ کر بولی تھی۔ مجھے ہچکا سا لگا۔ میں تو اس کی کھلتی ہنسی کے ساتھ کچھ اور سننے کی منتظر تھی۔

”بی بی! یہ میں تمہیں پہلے بتا دوں کہ وقت تمہیں ہرگز نہ ملے گا جہاں تک میرا خیال ہے، مای وغیرہ جلد از جلد اپنے بھائی کی شادی بنانا چاہ رہے ہیں۔ ان کی امی کی طبیعت آج کل کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ دیکھ لینا وہ لوگ توجہ مننی اور پٹ بیاہ کرنا چاہیں گے۔“ عفرہ نے اسے شوخی سے چھیڑا۔

”اس بات کا تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ پروپونل بے شک اچھے ہیں اور مجھے تو ڈر ہے کہ ممانورا“ آخر بھی کر دیں گی، لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ فلزہ روپاسی ہو کر بولی تھی۔

”کیا وجہ بتاؤ گی ماما۔ دیکھا نہیں ممانکتی خوش خوش ہمیں یہ خروینے آئی تھیں۔“ عفرہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا یہ وجہ کافی نہیں ہے کہ ابھی میری عمر کم ہے۔ شادی بہت بڑی ذمہ داری ہے اور میں فی الحال خود کو یہ

ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں سمجھتی۔ پہلے ممانے زور زہد سوتی کر کے مجھے ماسٹرز میں ایڈیشن دلا دیا اور جب مجھے واقعی پڑھائی میں مزا آنے لگا ہے تو ایک انوکھی بات سامنے لے آئی ہیں۔ میں سنجیدگی سے اپنا ماسٹرز کمپلیٹ کرنا چاہتی ہوں۔ پھر پڑھائی سے فارغ ہو کر اپنے گھر میں کچھ ٹینشن فری وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ میں اتنی جلدی شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔“ فلزہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

”یہ باتیں تم ممانے کہہ کر دیکھو، ممانیں گی بے وقوفی کی باتیں مت کرو فلزہ! اچھا رشتہ ٹھکانا کفران نعمت ہوتا ہے۔“ عفرہ نے فرخندہ آپا کے سے انداز میں کہا تھا۔

”ہاں ہے مجھے بھی۔“ فلزہ نے یقیناً ”منہ بسور“ تھا۔ ”ویسے فلزہ تم سوچو تو سہی، کتنی اچھی فیملی ہے مای



وغیرہ کی۔ مختصر ترین سسرال سے پلا پڑے گا تمہیں۔ لڑکیوں کی تو سسرالی رشتہ داروں سے ویسے بھی جان جاتی ہے۔ تمہیں کوئی لمبا چوڑا سسرال بھگتنا نہیں پڑے گا۔ بے شک چار بہنیں ہیں ماما وغیرہ مگر پہلی بات تو یہ کہ سب کی سب بائے بچہ بہت اچھی ہیں اور پھر سب اپنے اپنے گھر مارکی۔ ایک چھوٹا بڑا ورہ بھی سال دو سال میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا اور ماما کے والدین وہ بے چارے بھی کتنا عرصہ جنیں گے۔ ان کی امی تو ویسے بھی بیمار یوں میں گھری پڑی ہیں۔ چند سالوں میں سسرال کے جھجھٹ سے بالکل آزار ہوگی تم۔“ عفرہ جانے اور بھی اسے کیا کچھ سمجھا رہی تھی۔ مگر میں اپنی جگہ کھڑی سن کی سن رہ گئی۔

”اللہ میرے ماں باپ کو درازیٰ عمر دے، انہیں صحت و تندرستی سے نوازے۔ ان کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔“ میرا روال روال دعا گو تھا۔

عفرہ پر مجھے شدید ترین غصہ آیا۔ کس بے رحمی سے اس نے اس رشتے کے پس پوائنٹ گنوائے تھے۔ ”اساپ اٹ عفرہ!“ فلزہ نے اسے ناگواری سے ٹوکا تھا۔

”سچ تو کہہ رہی ہوں فلزہ! آئی بے چاری تو بمشکل چند سالوں کی خدمت لیں گی۔ اپنی دوست صبحی کا حال دیکھا ہے تم نے۔ کس ہٹی کٹی ساس سے پلا پڑا ہے۔ اتنی تیز طرار کہ خدا کی پناہ! مجھے تو اسٹار پس گئے ڈرامے دیکھ کر ساسوں سے ویسے بھی بہت ڈر لگنے لگا ہے“ آئی بے چاری تو۔“

عفرہ اپنی ہی رو میں بولے جا رہی تھی۔

”پلیز عفرہ! خاموش ہو جاؤ اور برائے مہربانی اسٹار پس کے ڈرامے دیکھنا بند کر دو۔ کسی کی ماں کے متعلق ہم اتنی بے رحمی سے تذکرہ کیسے کر سکتے ہیں۔ اللہ ہر کسی پر اس کی ماں کا سایہ سلامت رکھے۔ بزرگ تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اگر کچھ تیز مزاج کے ہوتے

ہیں تو یہ لڑکی کے ضبط اور تربیت کا امتحان ہوتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اپنی تعلیم اور تربیت دونوں پر بھروسہ ہے۔ لہذا جو انٹریکشن تمہیں اس رشتے میں نظر آرہی ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنا ماسٹرز کمپلیٹ ہونے سے پہلے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم امی کو کہہ دینا کہ اگر ماما وغیرہ اتنا انتظار کر سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ انہیں شائستہ طریقے سے انکار کر دیتے۔“ فلزہ کا انداز سادہ اور دو ٹوک تھا اور بس ایک لمحے کی بات تھی، میں شرمندگی اور ندامت کے سمندر میں غرق ہو گئی۔ اس چھوٹی سی لڑکی نے گویا مجھے آئینہ دکھا دیا تھا۔ جس میں میرے ماضی کا بہت بھیاں تک عکس مجھے منہ چڑا رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ دیکھ کر نگاہ چرائی پڑ گئی تھی۔ کتنے تعجب کی بات تھی کہ آج تک مجھے احساس ہی نہ ہوا تھا کہ میرا ماضی کا طرز عمل کتنا نامناسب اور غلط تھا۔ میں خوش باش اپنی زندگی جیسے جا رہی تھی۔ اگر آج بھی میں عفرہ اور فلزہ کی باتیں نہ سنتی تو مجھے احساس ہی نہ ہوتا کہ میں ماضی میں کتنی کٹھن بے رحم اور سنگ دل تھی۔

آج جب میری اپنی ماں کو کسی نے ساس کی کھٹنگی میں کھڑا کر کے ویسے ہی کمشنس دیے جیسے کبھی میرا معمول ہوتا تھا تو میں لرز کر رہ گئی۔ میں پشیمان تو تھی، لیکن شاید خوش بھی۔ آصف نے اچھا انتخاب کیا تھا۔ ظاہر اور باطن دونوں کا حسن رکھنے والی لڑکی۔ ہم لوگ واقعی آصف کی شادی جلد از جلد کرنے کے خواہش مند تھے لیکن فلزہ جیسی لڑکی کو کھونا بھی تو نری حماقت ہی ہوگی نا۔ ہمیں اس کی پڑھائی مکمل ہونے کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔





# سیری الحسن

لیڈی ڈاکٹر نے بین ایک طرف رکھا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے مجھے گھورا۔

”جی جناب! یہ سب کیا ہے۔“

میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس ڈاکٹر سے میری اچھی خاصی بے تکلفی بلکہ کافی حد تک دوستی ہی تھی۔ میرے خاندانی پس منظر، تعلیم، مشاغل ہر بات سے وہ آگاہ تھی۔ کوئی پردہ نہیں تھا۔ پہلے یہ مثل مشہور تھی کہ ”خاوند اور دانی سے کیا پیٹ چھپانا۔“ اب یہ مثل لیڈی ڈاکٹر پر اسی طرح صادق آتی ہے۔

اس نے دوبارہ مجھے گھورتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

”شائستہ! دراصل تم ایک ڈپریشنڈ پرسن ہو، کوئی بات نہیں۔ تمہارے سب ٹیسٹ اور رپورٹس بالکل صحیح ہیں۔ تمہارا یہ مسئلہ صرف ہارمونل نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے ہے اور ہارمونز میں گڑبڑ کی ایک بہت بڑی وجہ ذہنی تناؤ اور ڈپریشن ہے۔ نکالو خود کو اس خود ساختہ ذہنی تناؤ سے۔ بھلا کیا مسئلہ ہے تمہیں ہاں! عیش کرتی ہو۔ ہر آسائش اور شوہر کی محبت حاصل ہے تمہیں، پھر یہ سب کیا ہے۔ مجھے تو تمہاری یہ خود ساختہ بیماری صرف ذہنی فرار لگتا ہے اور کچھ نہیں۔“

اس کی صاف گوئی کا میں نے بالکل برا نہیں مانا۔ میں جانتی تھی حقیقت بھی یہی ہے۔ پھر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ایک مشورہ دوں؟ پارلر جایا کرو بلکہ اکثر جایا کرو، دیکھنا! جرت انگیز طور پر اس تناؤ سے نکل آؤ گی۔“

پھر وہ گویا فلسفیانہ انداز میں بولی۔

”پارلر دراصل عورتوں کا بازار ہے۔ ہر عورت کے ساتھ آگ نئی کمائی منسلک ہے۔ یہ نت نئی کمائیاں، یہ عجائب خانہ اور اپنی ہم جنس کا ساتھ تمہیں اس تناؤ سے نکال لائے گا۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اور جو پارلر کے بلوں سے میاں کاموڈ خراب ہوا اور ان کو ڈپریشن ہو گیا تو؟“

وہ اپنے سابقہ موڈ کے تحت بولی۔

”نہیں بلکہ حسین بیوی جب مزید نکھر جائے گی تو میاں کاموڈ مزید خوش گوار ہو جائے گا۔“

☆ ☆ ☆

پارلر واقعی عورتوں کا مینا بازار تھا۔ ہر عورت کے ساتھ کوئی کمائی لگی تھی۔ زرگس کی ایک اور بات سے مجھے اتفاق ہوا۔ یہاں تو ہر طرف نئی نئی کمائیاں اور دکھوں کا ڈھیر لگا تھا۔ حتیٰ کہ فوزیہ جو پارلر کی مالک تھی، اس کے بارے میں بہت کچھ عجیب و غریب سننے کو ملا۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں جنہوں نے میرے فطری تجسس کو ابھار دیا اور میں نے فوزیہ کی کمائی میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

فوزیہ کی کمائی کوئی ایسی غیر متوقع اور غیر روایتی تو نہیں تھی۔ وہی عام سی لوائٹوری جو ہر طرف آپ کو بکھری نظر آئے گی مگر۔

”تھریے! پہلے مجھے آپ کو فوزیہ سے ملوانا ہے۔ سانولی سلونی مینگی دلی بے حد جیکھے نقوش کی مالک





سرورِ فوزیہ! اچھی خاصی خوب صورت اور باوقاری خاتون ہے۔ پانچ بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی کوئی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ شادی شدہ ہے۔ بے داغ تنی ہوئی جلد متناسب اور پتلا دماغ، وہ یقیناً ”ایسی“ ہے کہ دوسروں کو متاثر کر سکے۔ پھر جرب زبان، یعنی اپنے کام میں ماہر، آنے والی خواتین کو اتنے عقل مندانہ اور ہنرمندانہ مشورے دیتی کہ اس کے گاہک اس کے گریویدہ ہیں۔

یہ تو مجھے شروع سے معلوم تھا کہ فوزیہ نے شادی اپنی پسند سے اور گھروالوں سے مکمل طور پر بغاوت کر کے کی تھی۔ خیر یہ قطعی اس کا ذاتی مسئلہ و فیصلہ تھا۔ مجھے اس سے کیا سروکار! میری ذاتی رائے اس معاملے میں جو بھی تھی سو تھی، مگر میں نے کبھی اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس معاملے نے شروع شروع میں اس کی سادھ کو کافی متاثر کیا۔ حتیٰ کہ جب میری کالونی میں یہ بار لڑنیا نکھلا تھا تو میرے میاں نے مجھے بڑی سختی سے یہ کہتے ہوئے منع کیا تھا۔ ”ادھر کارخانہ بھی مت کرنا۔ اس عورت کی شہرت کچھ اچھی نہیں۔ سنا ہے غلط قسم کی عورتوں کا آنا جانا ہے۔“

میں نے خاموشی سے سر ہلادیا تھا۔ پھر کالونی میں ہی ایک دو اجتماعات پر میری اس سے ملاقات ہوئی اور جہاں خواتین بیٹھی ہوں اس قسم کی باتیں تو ایک چٹکارے کے ساتھ دوہرائی جاتی ہیں اور ایسے ہی اجتماعات میں فوزیہ کی غالباً ”کسی ہمدرد خاتون نے مجھے بتایا۔“

”ارے نہیں مہزاجہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھی خاصی شریف فیملی کی لڑکی ہے۔ وہ ازدانی صاحب کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی، ان کی بیٹی ہے۔ بس خانہ خراب ہو اس محبت کا جو اچھے خاصے انسان کو کیا ہے کیا بنا دیتی ہے۔ اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خاندان سے بغاوت کی۔ مگر لوگوں کو تو باتیں کرنے کا موقع چاہیے۔ اچھی خاصی شریف لڑکی کے لیے جانے کیسی باتیں کرتے ہیں۔ لوگوں کو تو خدا کا

خوف ہی نہیں۔ ٹھیک ہے اس کا طریقہ غلط تھا۔ ہمارے ہاں اس بات کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر...“ وہ خاتون سانس لینے لڑکیں تو میں نے کچھ پوچھنا چاہا۔

”مگر میں نے تو سنا ہے کہ...“ وہ مجھے کانٹے ہوئے بولیں۔

”ہاں ہاں! تو میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ آپ نے بہت کچھ سنا ہو گا مگر سب سچ نہیں۔ میں کوئی اس کی حمایت نہیں کر رہی۔ ظاہر ہے محبت کے جوش میں اس نے بہت سی غلطیاں کیں مگر کسی کی کردار کسی کرنا تو بہت ہی گھٹیا حرکت ہے۔“

اور پھر یوں ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان اس موضوع پر بحث چل پڑی کہ جو لڑکیاں گھر سے بغاوت کر کے شادی کرتی ہیں، معاشرہ ان کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور وہ بات ادھوری ہی رہ گئی۔ جو میں پوچھنا رہی تھی۔

لیکن اس ملاقات کا یہ فائدہ ہوا کہ میرے اور میرے میاں کے ذہن پر چھائی گروچھٹ گئی۔ خاص طور پر جب انہیں یہ پتا چلا کہ فوزیہ ازدانی صاحب کی بیٹی ہے تو وہ بولے۔

”ہاں یار! ازدانی صاحب کو کون نہیں جانتا۔ ان کی شرافت کی تو سارا محلہ مثال دیتا تھا۔ کچھ سنا تو تھا میں نے کہ ان کی ایک بیٹی نے اپنی مرضی سے خود سے شادی کر لی تھی مگر نہیں جانتا تھا کہ فوزیہ ہی ان کی بیٹی ہے۔ خیر! ہمیں کیا کسی کے داخلی معاملات سے۔“ وہ اخبار سے سر اٹھا کر بولے۔

”ٹھیک ہے، تم اپنا کام کروانے چلی جایا کرو گھر کے قریب ہے۔ بجائے اس کے کہ کہیں دور جاؤ۔ مگر بہت زیادہ دوشی بھانے کی ضرورت نہیں۔“

اور یوں آہستہ آہستہ وہ جھجک اور تکلف کی دیوار گرنی شروع ہو گئی۔ میں ضرورتاً ”اپنے کام کے سلسلے میں اس کے پاس چلی جاتی تھی اور یہ تو ماننے والی بات تھی کہ اس کا کام بہت اچھا تھا۔ بڑی مہارت تھی اس کے ہاتھ میں اور پوری دیانت سے وہ اپنا کام کرتی تھی۔

اور اب جبکہ میں نے اپنی ڈاکٹر کے مشورے کو کچھ زیادہ ہی سیریس لے لیا اور بطور بہت قریبی نہ سہی دور ہی کی سہی بڑوں کی حیثیت سے بھی میرا ایک آدمہ چکر لگ جاتا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں پکوان وغیرہ کا تبادلہ بھی ہونے لگا تو ظاہر ہی بات ہے ایک دوسرے کی ذات میں دلچسپی بھی بڑھی۔

فوزیہ جب کبھی پارلر میں نہ ہوتی پارلر سے ملحقہ اپنے پورشن میں کئی گھریلو مصونیت میں مصروف ہوتی تو وہاں بیٹھی خواتین میں بعض اوقات ہی وہ زیر بحث آجاتی۔ لے دے کے موضوع وہی اس کی پسند کی شادی ہونا، تو بعض اوقات چڑ کر بر ملا کہہ دیتی۔

”لوگ کبھی انسان کو معاف نہیں کرتے۔ بس وہ رب ہی ہے جو بندے کی غلطیاں بھلا دیتا ہے اور اس طرح کے معاملات میں تو لوگوں کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ ایسی باتیں کرنے میں لطف جو ملتا ہے۔“ میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی طنزیہ ہو گیا تھا کہ وہاں بیٹھی ایک خاتون بڑے غصے سے بولیں۔

”ہاں تو ایسی باتیں بھلا بھولتی ہیں۔ اب وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ بنے، آپ کی دوست ہو، بڑوں ہو، مگر حقیقت تو حقیقت ہی رہے گی نال کہ آخر اس نے اتنے چاہنے والے ہاں پاپ کو چھوڑ کر گھر سے بھاگ کر شادی کی اور وہ بھی ایک ایسے مرد سے جو نہ صرف پہلے سے شادی شدہ تھا بلکہ دو بچوں کا باپ بھی تھا۔ ارے ایسی عورتیں تو۔“

وہ خاتون تو ابھی جانے کیا کیا بولتیں مگر میرا دماغ گویا سن ہو گیا۔ یہ ایک نیا انکشاف تھا میرے لیے، بلکہ نیا کیا ایک لڑکا دینے والی حقیقت! میں اپنے آپ کو جانے کیسے سنبھال کر واپس آئی اور تمام دن خاموشی سے سر لیٹ کر لیٹی رہی۔ ایک عجیب سی کشمکش اور بے کلی میری ذات میں جاری تھی۔ مجھے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ آخر مجھے کیا ہوا ہے۔ میرے میاں نے مجھ سے بار بار پوچھا اور جب میں نے انہیں حقیقت بتائی تو وہ بڑے آرام سے بولے۔

”سیدھی سی بات ہے تم اس کی ذات میں کافی حد تک انوالو ہو چکی ہو اور جب انسان کسی ایسے شخص کے بارے میں کچھ ایسا دیکھتا ہے جس کے لیے دل میں ہمدردی یا چاہت ہو تو فطری طور پر دکھ ہوتا ہے۔“ میں نے حیرت سے دیکھا، وہ کتنے آرام سے میری تکلیف کو سمجھ گئے تھے۔ میں نے محبت اور ممنونیت سے ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

اور پھر واقعی میں نے خود اپنا تجزیہ کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اک طرف دل کو یہ خبر سن کر شدید دھچکا لگا ہے۔ فوزیہ سے شدید نفرت محسوس ہو رہی ہے اور دوسری طرف دل چاہ رہا ہے کہ اسے اس کی کم عمری، نادانی اور حماقت کی رعایت دے دوں۔ مگر عورت ہو کر اتنی سنگ دلی کہ اپنی ہی ہم صنف کا گھر اجاڑ کر خود اپنا گھر بسالیا۔ بس یہی کشمکش جاری تھی۔ ایک دو دن تو میرے اسی پریشانی میں گزرے۔ مگر پھر میں نے خود کو اس پرانی آگ سے یہ سمجھا کر نکالا کہ ”اپنی نیلے تو۔“



آہستہ آہستہ حالات پھر نارمل ہونے لگے۔ کچھ دن اور بہتے تو میں واقعی اس سے کچھ اور بدظن رہی۔ مگر اس کی محبت اور خوش اخلاقی سے باوجود مصروف ہونے کے وہ بھی کچھ پکار بھیج دیتی۔ کبھی فون پر میری خیریت دریافت کرنے لگتی۔ ایک دن اس نے فون کر کے کہا۔ ”بائی! آگے کا نیا فیشن لابی ہوں، بڑا اچھا زلٹ ہے، دیکھیے گا کیسے چہرہ چمک اٹھے گا۔ احمد بھائی تو نڈا ہی ہو جائیں گے۔“

میرا دل چاہا کہ اسے کہوں۔ ”مرد کا کیا ہے وہ تو ہر دم نڈا ہونے کو تیار رہتا ہے۔ یہ تو عورت ہی کو بھلانا پڑتا ہے۔“ مگر میں خود پر ضبط پاکر بات ختم کر گئی۔ لیکن ہوا یہ کہ بہت عرصے تک میں خود کو اس سے روک نہیں پائی اور دوبارہ میرا میل جول کافی بڑھ گیا اور چونکہ اب دل کو کید لگ چکی تھی تو یوں چلا کہ فوزیہ اور اس کے شوہر کی ملاقات بھی تب



ہوئی، جب فوزیہ اپنے دو کھنسل سینٹر کے ہاشل میں بھی اور اس کا شوہر حبیب پروڈکٹ مینجر یہ ملاقات کب دل کی واردات میں بدل گئی، پتا ہی نہ چلا اور جب احساس ہوا تو دونوں نے اپنے خاندان سے بغاوت کر کے شادی کر لی!

میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو ہسلا لیا کہ کم عمر لڑکیاں اسی طرح شکاریوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ جو ہوا برا ہوا مگر جو بھی ہے اب تو شرافت سے دونوں اس شادی کو نبھا رہے ہیں اور اس کا ثبوت ان کے باجی بچے ہیں۔ مگر کبھی کبھار یہ پھاس ضرور دل کو تنگ کر گئی کہ اس کے شوہر سے پوچھوں کہ کبھی اس کو اپنے پہلے دو بچے یاد نہیں آئے۔ مگر افتاق کی بات ہے کہ میری کبھی حبیب سے ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ ہی میں نے اسے بھی دیکھا تھا اس کی ایک وجہ تو پارلر اس کے گھر سے بالکل علیحدہ تھا اور دوسرا وہ کوئی میری بہت قریبی پڑوسن نہ تھی۔

\*\*\*

فوزیہ کے گھر سے کھیر آئی تھی۔ خالی برتن کافی دن کے آئے رکھے تھے۔ اس دن میں نے کڑھی بنائی تو سوچا کہ اس بہانے چکر بھی لگ جائے گا اور برتن بھی دیے آؤں گی۔ جب میں گئی تو فوزیہ پارلر میں نہیں تھی۔ پارلر سامنے والے پورشن میں تھا اور رہائشی حصہ پیچھے! میں نے پارلر میں ملازم لڑکی کو ڈونگہ لٹھایا اور فوزیہ کی بابت دریافت کیا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی کہ بابی بس ابھی آ رہی ہیں۔ میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کافی ریش تھا۔ سب ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھیں۔ زیادہ تر خواتین اپنی کالونی کی ہی تھیں۔ اسی لیے کوئی اجنبیت اور گھبراہٹ نہیں محسوس ہوئی تھی۔ میں جس صوفے پر بیٹھی تھی وہاں سے پورچ نظر آتا تھا۔ میں نے اس دن حبیب کو پہلا بار دیکھا اور میرا دل تاسف سے بھر گیا۔

لمبا ترنگا، پملوانوں جیسے جنھے کالماک موٹے موٹے نقوش سیاہ رنگت، سر صاف لگ رہا تھا کہ دگ جاتی

ہوئی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ گنجا تھا۔ گدلی اور سرخ آنکھیں جیسے کسی عادی شرابی کی ہوتی ہیں۔ وہ مجھے پہلی نظر ہی میں اچھانہ لگا۔

اسے دیکھ کر خواتین میں تسخر خانہ چہ گولیاں شروع ہو گئیں۔ میرے دل کو ایک اور شدید دھچکا لگا تھا کہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی نے کیا سوچ کر اس آدمی کے لیے اپنے گھر والوں سے مخالفت مول لی۔ ایک عورت کا گھر اجاڑا۔ بچوں سے ان کا باپ جیہیں لیا۔ اتنے میں فوزیہ آتی دکھائی دی تو سب جیسے موضوع بدل گئیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی دراصل اک سزا ہی تو ہے کہ لوگ اس کا جرم معاف کرنے پر تیار نہیں!

مج تو یہ ہے کہ حبیب کو دیکھ کر اس کے جرم کی نوعیت کچھ اور بھی شدید محسوس ہوتی تھی۔ میں اس دن زیادہ دیر فوزیہ کے پاس نہیں بیٹھ سکی۔ گھر آکر بھی مجھے اک ملال نے گھیرے رکھا۔ بھی فوزیہ پر ترس آتا کہ کیسے وہ اس شکاری مرد کے ہتھے چڑھ گئی اور کبھی نفرت اور بدگمانی جنم لے لیتی۔ میں نے احمد سے بھی بڑی افسردگی سے تذکرہ کیا تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”بھئی دل ہے اب گدھی بلکہ گدھے پر آجائے تو کیا، کیا جائے خواتین کو یوں ہی تو احمق نہیں کہا جاتا۔“

ان کے اس جواب پر میں بھنا گئی اور ہماری اپنی بحث چھڑ گئی۔

گوکہ حبیب کو دیکھ کر مجھے شاک لگا تھا۔ دل اک بار پھر بدگمان ہوا تھا۔ مگر میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تعلقات کو آخری حد تک جا کر موقع دیتے ہیں۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ کسی کی ظاہری صورت سے اس کی سیرت کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اتنی خوبیوں کا مالک ہو کہ فوزیہ جیسی اچھی خاصی خوب صورت اور بظاہر مضبوط عورت اس کی گرویدہ ہو گئی۔ مگر اس کی ان دیکھی خوبیوں پر اس کی پہلی بیوی اور بیٹے اک پھاس کی طرح پیچھے لگتے ہیں پھر یوں

ہوا کہ مجھے اک مزید کرید سی لگ گئی۔

\*\*\*

اس دن فوزیہ کا فون آیا۔ وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ اپنی صفائی والی کو کچھ دن کے لیے اس کی صفائی کا بھی کہہ دوں کہ اس کی کام والی چھٹی پر بھی۔ کالونی میں وہ میرے ساتھ کافی مروت اور اعتماد و خلوص سے پیش آتی تھی کہ میرا رویہ شاید اس کو معقول لگتا تھا۔ گوکہ کہ دوسری خواتین بھی بظاہر تو کام کی خاطر بہت خوشامد انداز اختیار کرتیں مگر جو گفتگو بیٹھ جیسے ہوتی اس کی کچھ نہ کچھ خبر تو اسے بھی ہو ہی جاتی ہوگی جبکہ میں کوشش کرتی تھی کہ اس ”چٹلی پروگرام“ سے بچنے کی کوشش کروں۔ کالونی میں میرا کوئی بہت زیادہ دوستانہ بھی نہ تھا۔ خوشی غم کے موقعوں پر اکٹھے ہو جاتے یا پھر جب سے فوزیہ کی طرف چکر لگتا تو وہاں کبھی کبھار کسی سے ملاقات ہو جاتی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے مجھے کہا تھا کہ میں اسے کچھ بے ضرر لگی تھی۔ مگر کیا کیا جائے وہ بے خبر تھی کہ اس کے بارے میں میں بھی بری طرح تجسس میں مبتلا تھی۔

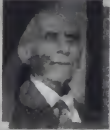
اس دن جب میری ماسی اس کے گھر سے صفائی کر کے آئی تو میں نے سرسری سا ذکر اس کے سامنے چھیڑ دیا اور وہ تو شروع ہی ہو گئی۔

”با جی! آپ کو کیا بتاؤں۔ تو یہ تو یہ فوزیہ با جی اوپر سے کتنی اخلاق والی بنتی ہے۔ مگر ماں کو کیسے گھر سے دکھی کر کے نکالا اور فون پر بھی کتنی لڑائی ہوئی۔“ میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

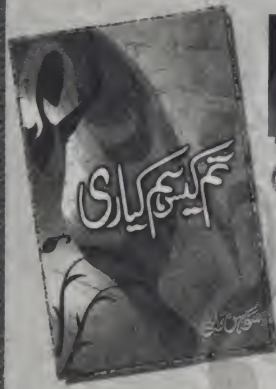
”مگر میں نے تو سنا ہے کہ اس کے ماں باپ نہیں ملتے اس سے چھوڑ دیا ہے انہوں نے اسے۔“ وہ گویا جھکتے ہوئے راز دار سی بولی۔

”وہ با جی جی! جب فوزیہ کا بیٹا ہوا تھا نا تو ماں باپ آخر ماں باپ ہوتے ہیں معاف کر دیتا تھا انہوں نے۔ مگر اب وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ تم اپنے میاں کو گھر بٹھا کر کھلانے کی عادت نہ ڈالو۔ اسے کہو کہ کام کرے۔ کب تک تم اسے مفت کی روٹیاں تڑواؤ گی۔“

برطانیہ میں مقیم سات شعری مجموعوں کے خالق تخیلوں کے خوش نوا شاعر



فکر حسین



کتاب: گنگنیم کیاری، مصنف: فخر حسین، سال: 2012ء

سویٹن راہی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کیڑوں کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے ٹرنگیت کے سوتوں سے گیت کی نئی دنیا میں تخلیق کی ہیں۔

افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں پیش نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب سویتن راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فخر حسین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمر ان ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London

63 - Hamilton Avenue Surbiton, Surrey, KT67PW. U.K.  
Phone: 0044-0208-397-0974



بچوں کا ساتھ ہے۔ اس کو اتنا نہ بگاڑو، کل کو تمہیں بھی دھکا مار کر چلا گیا تو مگر توبہ! فوزیہ باجی نے جوانی ماں کی بے عزتی کی ماں کس دھکی دل سے گھر سے گئی۔ بس تو وہ کہتی ہے کہ جس کو میرا میاں نہیں اچھا لگتا وہ میرا کچھ نہیں ہمارے معاملے میں کوئی نہ بولے۔ فون پر بھی یہی بات چل رہی تھی۔ اللہ معاف کرے ایسی اولاد سے۔“

وہ تو اور بھی جانے کیا بولتی رہی مگر مجھے جو اس کے متعلق جاننے کا جتنس تھا اب لگا کہ میں کچھ اور الجھ گئی ہوں۔ فوزیہ کی شخصیت اک الجھی ریشی تھی کی مانند تھی جس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ کبھی وہ اک رنگین و نادران تنی کی مانند لگتی۔ معاشرے و روایات کی باغی جو ہر خطرے سے بے خیر ڈال پر اپنے پھول کے ہمراہ مست و مگن ہو کر اڑتی پھرتی تھی۔

کبھی یہ رنگین تنی اک خون آشام چمگادڑ کا روپ دھار لیتی جو کہ مظلوم عورت کے ارمانوں کا خون کر گئی تھی۔ کبھی وہ مظلوم لگنے لگتی۔ اک ایسی روح جس نے اپنے تمام دکھ، رنج اور تکلیف کو اپنے اندر اتار کر خوشنما پردہ لٹکا رکھا تھا، ایسا قیدی جو اپنے شکاری کی محبت میں مبتلا تھا۔

اور کبھی وہ اک ایسی آن بان والی عورت کے روپ میں نظر آتی جو اپنے شوہر، گھر، بچوں کی حفاظت کے لیے پوری طرح سیدہ سپر تھی۔ جو حالات کا ہر جبر سے اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتی تھی اور اس کی خاطر اپنے ماں باپ کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتی۔

کبھی مجھے وہ ایسی خود سر اور باغی بافرمان اولاد لگنے لگتی جسے اس کے ماں باپ کی ناراضی، تحصار میں لے لیا تھا مگر ہنوز وہ اپنی شکست اور غلطی تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی۔

مگر جو بھی تھا، حبیب کے بارے میں مجھے کوئی شک شبہ نہ رہا۔ اس کے کردار میں کوئی ابہام نہ تھا۔ اسے

میں نے جیسا سمجھا، ویسا ہی پایا۔ اس نے بلاشبہ ایک سونے کی چڑیا، پھانسی تھی اور اس کے نبھانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ فوزیہ اسے پال رہی تھی۔ مجھے الجھن یہ نہیں تھی کہ فوزیہ اس کے ساتھ کیوں اور کیسے نباہ کر رہی تھی۔ وہ اپنی تمام تر غلطیوں، حماقتوں اور خود غرضیوں کے باوجود ایک شریف عورت تھی۔ پانچ بچوں کی ماں تھی۔ اسے اس شادی کو ہر حال میں نبھانا ہی تھا۔

مجھے الجھایا اس بات نے تھا کہ آخر وہ کیا شے تھی۔ وہ کون سا ایسا جذبہ تھا جو فوزیہ کو اس بیج تک لے گیا۔ اس کی شادی کوئی اتنی زیادہ عمر میں نہ ہوئی تھی کہ بھوک اور نفسانی جذبے بیج اور غلطی کی تیز مٹا دیں۔

میری الجھن یہ تھی کہ میں فوزیہ کی شخصیت کو بالکل دو مخالف اور متوازی خانوں میں کیسے رکھوں؟ اک خانہ کہ جس میں وہ ایک نادان، جذباتی، کم عقل اور مظلوم و مجبور عورت نظر آتی تھی جو اپنی غلطی کا خمیازہ بڑی خوشی سے بھگت رہی تھی۔ وہ اپنے شکاری کی محبت میں مبتلا تھی یا سب کو باور کرواتی تھی۔

دوسرا خانہ بالکل الگ، غلیظ رنگوں سے اٹا ہوا، عفونت بھرے جذبات کی کشافت لیے ایک ایسے خود غرض انسان کا جو گرد و پیش سے بے خبر صرف اپنی ذات کو اہم جاننا ہے اور اپنے منہ زور جذبول کے آگے معاشرے کی ہریت و روایت کو روند ڈالتا ہے۔

میں الجھن میں ہوں کہ فوزیہ کو میں ان دونوں خانوں میں بیک وقت کیسے رکھوں۔ مگر وہ بھول بھلیوں میں بھٹکتے مسافر کی طرح کبھی ایک خانے سے دوسرے خانے میں سرایت کر جاتی ہے اور میں سمجھ ہی نہیں پاتی کہ وہ کہاں ہے۔ کیا ہے۔ آپ سمجھ جائیں تو مجھے ضرور اس الجھن سے نکالے گا!





جوگیرہ قاضی

## انصافِ حلالہ

”ساجدہ! اور ساجدہ!“  
وہ تنور پر روٹیاں پکار کر سینے سے شرابور کپڑے  
سکھانے کے لیے ابھی چارپائی پر بیٹھی ہی تھی کہ اماں  
کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔  
”جی اماں۔“ اس کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔  
”سہراب کے کپڑے دھو لیے؟“ سہراب اس کے  
بڑے بھائی کا نام تھا۔

مکمل ٹائون





”ایک سوٹ ہی دھونا تھا۔ اس میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔“ اماں اس کے لیے تمام کاموں کو نظر انداز کر کے آرام سے کہہ رہی تھیں۔  
 ”چل اب جلدی سے دھو دے۔“  
 ”وہ اماں۔“ اس نے ایک نظر انتہائی دلچسپی سے ڈی دیکھتی سونیا پر ڈالی اور ہنسی سے ہونے لگی۔  
 ”اماں! آپ سونیا سے کہہ دیں۔ وہ دھو دے گی۔ میں تھک گئی ہوں۔“

اس کی اس بات پر سونیا نے خاصی ٹیڑھی نگاہ سے اسے دیکھا۔ سونیا اس سے دو سال چھوٹی تھی اور یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ وہ جتنی بد صورت تھی۔ سونیا اتنی ہی خوب صورت واقع ہوئی تھی۔ لانا قد، سرخ و سفید رنگت، انتہائی متناسب سراپا، گہری جھیل جیسی آنکھیں اور اس پر گھنے سیاہ بال اس سب کے ساتھ اسے اپنے حسن کا احساس بھی بہت تھا۔ ساجدہ کو تو وہ کسی خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی ذرا سی بات پر بے نقط سنا دیتی تھی اور ساجدہ سر جھکا کر سب سن لیتی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا گھر بھر کا چیتا ہونا بھی تھا۔ اب تو تھے ہی حسن پرست، لیکن اماں بھی اس کا بہت خیال کرتی تھیں۔

”پتا تو ہے وہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی اور دیے بھی ابھی تو وہ کالج سے نکلی باری آئی ہے۔“ اماں کی بات پر وہ بالکل چپ ہو گئی البتہ سونیا کے ساتھ بیٹھ کر بیوی دیکھنا وہی چپ نہیں رہ سکا۔  
 ”اماں! سونیا کو آئے ہوئے ایک گھنٹے سے اوپر ہو چکا ہے اور تھکے ہوئے کی بھی خوب کمی، تپا بھی تو تھکی ہوئی ہیں۔ ابھی اتنی گرمی میں تور پر روٹیاں لگا کر آ رہی ہیں۔“

”تم چپ کرو۔“ سونیا نے اسے ڈانٹا۔ ”تم سے کس نے کہا ہے بولنے کو۔“  
 ”کیوں کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے۔ گھر کا سارا کام آپا کرتی ہیں۔“ نہیں بھی تو کچھ ان کی مدد کروانی چاہیے۔  
 ”نہیں اگر ان کا اتنا ہی خیال ہے تو کروادہ کرونا

اس کے ساتھ گھر کا کام۔ چلو مستقبل کی بھی پرمیش ہو جائے گی۔“ سونیا نے لاروائی سے کہا۔  
 ”میرے نہیں اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ تم کیا کرو گی مستقبل میں۔“ تو می تپ کر بولا۔  
 ان دونوں کی لڑائی طویل پکڑتی جاری تھی۔ ساجدہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کپڑے دھونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے پتا تھا کہ کپڑے آخر کار اسے ہی دھونے پڑیں گے۔ سونیا گھر کے کسی کام کو ہاتھ لگانا کسر شان سمجھتی تھی۔

وہ کپڑے دھورہی تھی جب اماں گھر میں داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں خوبائی اور آلو بخاروں کی تھیلیاں تھیں۔

”السلام علیکم ابا! اس نے بہت جذب سے ابا کو سلام کیا جس کا جواب انہوں نے سر ہلا کر دیا۔ وہ اماں سے بہت پیار کرتی تھی یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن ابا اس سے کتنا پیار کرتے تھے اور جانے کرتے بھی تھے کہ نہیں یہ بات وہ کوشش کے باوجود کبھی بھی نہیں جان سکتی تھی۔

سونیا ابا کو دیکھ کر فوراً ٹی وی دیکھنا چھوڑ کر باہر آئی اور ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر ابا کے پاس آئی۔

”السلام علیکم ابا! اس نے پانی کا گلاس ابا کی طرف پڑھایا۔ ایسے موقعوں پر وہ بہت فرماں بردار بن جاتی تھی۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو، خوش رہو بیٹا۔“ اماں نے خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگے۔ نجائے کیوں ساجدہ کے اندر ڈھیر ساری لاشکی اثر آئی۔

”دیکھا، خوبانیوں اور آلو بخاروں کو دیکھ کر کیسے باہر آئی ہے۔“ نعمان نے فوراً ”سونیا پر چوٹ کی۔

”تم چپ کرو۔ میں تو لے کر ہی اپنی بیٹی کے لیے آیا ہوں۔“ اماں نے پیار سے سونیا کی طرف دیکھا۔

سونیا کی گردن فخر سے مزید تن گئی۔ اس نے جتنا ہی ہوئی نظروں سے نعمان کو دیکھا۔ نعمان ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

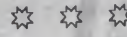
ساجدہ نے ایک نظر سب کو دیکھا۔ نعمان اور سونیا خوبائیاں اور آلو بخارے کھارے تھے اور ابا ان دونوں کو کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ نجائے کیوں ساجدہ کا دل چاہنے لگا کہ ابا اسے آواز دے کر کہیں ”ساجدہ! چل بس کر کپڑے دھونا۔ تو بھی اگر کھالے۔“ لیکن۔۔۔

”اب بس بھی کر سونیا! ساجدہ کب سے کام میں لگی ہے۔ اسے بھی دینے ہیں تھوڑے سے سہراب کے لیے بھی رکھوں گی۔“ وہ کپڑے تار پر پھیلائے کے بعد واش مین پر ہاتھ دھورہی تھی جب اس نے اماں کو سونیا سے کہتے سنا۔

”لیں۔ نہیں کھاتی میں۔“ سونیا غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی ”دے دیں سارے آپ اپنی چیت کی۔“  
 وہ زور زور سے پاؤں پچختی اندر جانے لگی اور ابا فوراً ”بے چین ہو گئے۔

”کھانے دیتیں تم سونیا کو۔ ساجدہ کے لیے میں اور لے آتا۔“ وہ اماں سے مخاطب ہو کر بولے پھر سونیا کو آوازیں دینے لگے۔

ساجدہ جب چاب اندر پلٹ گئی۔ اسے کسی نے رکنے کے لیے کہا بھی نہیں تھا۔



وہ دوپٹے پر کوشش کی نیکل بنا رہی تھی جب اسے بیرونی دروازہ کھلنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں، اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ سونیا کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ وہ تھڑا ہیر کی اسٹونڈ۔ تھی غالباً ”یہ لڑکیاں اس کے ساتھ کالج سے گھر آئی تھیں کیونکہ انہوں نے کالج یونیفارم پہن رکھے تھے۔ سونیا انہیں لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جس میں وہ لوگ عام طور پر مہمانوں کو بٹھاتے تھے۔

”کون ہیں یہ؟“ تھوڑی دیر بعد سونیا اس کے کمرے میں آئی تو ساجدہ نے دھیرے سے پوچھا۔  
 ”یہ۔ یہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی ہیں۔ کب

سے کہہ رہی تھیں، سونیا تمہارے کھر چلتے ہیں۔ میں ہی انہیں ٹال رہی تھی لیکن آج تو انہوں نے اتنا اصرار کیا کہ لے کر آنا ہی پڑا۔“ سونیا نے کمر پر ہاتھ رکھے جلدی جلدی تفصیلات بتائیں۔

”تم انہیں ٹال کیوں رہی تھیں؟“ اس کا موڈ اچھا دیکھ کر ساجدہ نے ایک اور سوال بھی کر لیا۔

”بس گھر کی کنڈیشن کی وجہ سے ہی ٹال رہی تھی۔ اب دیکھو نا ہمارا گھر اس قابل ہے کہ ہم اس میں کسی اچھے اور بڑے گھر کے افراد کو بلا سکیں۔“

”کیوں، گھر میں کیا خرابی ہے؟ اتنا اچھا تو ہے۔“ ساجدہ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

”بس رہنے دو۔“ نہیں کیا پتا، اچھا اور بڑا گھر کے کہتے ہیں۔ تمہاری تو ساری زندگی کنویں کے مینڈک کی طرح اسی گھر میں گزری ہے نا۔“ سونیا نے استہزاء سے انداز میں کہا اور ساجدہ نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

سونیا ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ وہ بھلا کب کسی کے گھر جاتی تھی۔ وہ تو کھانے میں بھی بہت کم جاتی تھی۔ ”نیز میں یہ کہنے آئی تھی۔ اچھی سی چائے تو بنا دو اور ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی ہو۔ یہ نوئی کہاں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے

**فائرہ افکار کے 4 خوبصورت ناول**

آئینوں کا شہر	قیمت - 500/- روپے
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قیمت - 500/- روپے
یہ گلیاں یہ چوہارے	قیمت - 300/- روپے
بھلاں دے رنگ ہزار	قیمت - 250/- روپے

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، راکھی - فون نمبر: 32735021



ہے۔ اسی سے کچھ کھانے کے لیے منگوا لیتی ہوں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی ادھر ادھر دیکھا۔

”نئی گھر نہیں ہے۔“ ساجدہ نے بتایا۔

”اُدھ تو پھر بازار کون جانے گا؟“

”تم فکر مت کرو۔ میں چائے کے ساتھ کباب تل لیتی ہوں اور بسکٹ اور نمکواں گھر میں۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ میں اپنی دوستوں کے ساتھ جا کر بیٹھتی ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد خود ہی آکر سب کچھ لے جاؤں گی۔“ وہ سر ہلا کر اندر چلی گئی۔

اس نے کچن میں جا کر کباب تلنے چائے بنائی پھر ٹرے میں ساری چیزیں سیٹ کر کے سونیا کا انتظار کرنے لگی لیکن جب سونیا نہیں آئی تو وہ چائے اور کباب ٹھنڈے ہونے کے خیال سے ان کے کمرے کی طرف گئی۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ بند تھا اور ایک کھلا ہوا تھا۔ اندر سے سونیا کی اور اس کی دوستوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ”سونیا!“

”یہ کون ہیں؟“ شاید اس کی کسی دوست نے مجلس انداز میں پوچھا تھا۔

”ساجدہ ہوگی۔“ سونیا کی آواز آئی۔

”ساجدہ۔ تمہاری بڑی بہن۔ تو انہیں اندر بلاؤنا۔“ اس کی دوست نے کچھ حیرت سے کہا۔

”آجائیں نا پلیز۔ آپ باہر کیوں کھڑی ہیں؟“ سونیا کی ایک اور سہیلی نے اسے آواز دی۔

”ساجدہ! آجاؤنا۔“ سونیا کو بالکل خواستہ کرنا پڑا۔

وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور ٹرے ٹیبل پر جا کر رکھ دی۔ پھر دھیرے سے کانپتے ہوئے لہجے میں انہیں سلام کیا: ”السلام علیکم!“

وہ دونوں ہی بہت ماؤزن قسم کی لڑکیاں تھیں لیکن اس وقت دونوں ہی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن نظر آرہی تھیں۔

”یہ یہ تمہاری بہن ہے۔ میرا مطلب ہے ساجدہ۔“ سونیا کی ایک دوست نے انکے ہوئے پوچھا۔

”ہاں!“ سونیا شرمندہ نظر آرہی تھی۔ ”ساجدہ تم

کیوں لے کر آئیں۔ میں نے کہا تھا میں خود آکر لے جاؤں گی۔“ سونیا تنفر سے بولی۔

”آپ بیٹھیں نا۔“ سونیا کی دوسری دوست نے بڑے ”اخلاق“ سے کہا۔

”نہیں۔“ مہم میں چلتی ہوں۔“ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکل آئی۔

اپنی دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد سونیا سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔ ”بہت شوق ہے لوگوں کو خود کو دکھانے کا۔“

”سونیا!“ اس نے دکھ سے کہا۔ ”میں صرف چائے اور دوسری چیزیں ٹھنڈی ہونے کے خیال سے لے کر گئی تھی۔“

”اگر چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی تو یہ میرا مسئلہ تھا لیکن تمہیں وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ تم ان لڑکیوں کو نہیں جانتی ہو، اب یہ بات پورے کالج میں پھیلنا دیں گی۔“

”تو۔“ تو کیا ہو جائے گا۔“ ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ”کیا میری بد صورتی اتنا بگاڑا ہے کہ جس کا لوگوں کو پتا چل جائے سے تم بدنام ہو جاؤ گی۔ لوگ تم پر باتیں کرنا شروع ہو جائیں گے۔“

”آخر میں نے ایسا کیا کبھی دیا ہے کہ تم روزنا شروع ہو گئی ہو۔“ سونیا نے بے حد الجھن سے اس کو دیکھا روتے ہوئے تو وہ اور بڑی لگ رہی تھی۔

”کو کچھ“ سمجھتی کچھ ہو تم۔ تم سے توبت کرنا ہی فضول ہے۔“ وہ پیر جھٹتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

چھٹی کا دن تھا گلاس کے لیے ہفتے کا کوئی دن چھٹی کا نہیں ہوتا تھا۔ اور چھٹی کے دن تو اس کے کاموں میں کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس دن گھر کے سارے افراد اپنی اپنی مرضی کا ناشتا اور ایک پر تکلف بیچ کرنا چاہتے تھے۔ اس دن اسے تمام گھر والوں کے کپڑے بھی دھونا ہوتے تھے۔ جس میں شاید سب سے زیادہ کپڑے سونیا کے ہی ہوتے تھے لیکن وہ گھر

کے تمام کاموں سے مکمل طور پر بے نیاز تھی۔

آج دوسرے کے کھانے میں وہ کربلے کوشت اور پلاؤ بنا رہی تھی۔ پلاؤ بنانے کی فرمائش صبح سہرا ب کر کے گیا تھا۔ وہ اپنے کسی دوست کی فیکٹری میں سپر وائزر تھا اور معقول تنخواہ پاتا تھا لیکن آدھی تنخواہ وہ اپنے اوپر خرچ کرتا تھا اور باقی آدھی اماں کو دیتا تھا۔ البتہ سونیا کو اپنا حصہ وصول کرنا خوب آتا تھا۔ وہ مختلف جیلوں، عمارتوں سے اس سے رقم انیشیٹو رہتی تھی اور ساجدہ سوچتی تھی کہ یہ دنیا صرف خوب صورت اور چالاک لوگوں کے لیے ہے۔ اس جیسے بد صورت، کم اعتماد اور بزدل لوگوں کی شاید اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

”السلام علیکم خالہ!“ وہ واشنگ مشین سے کپڑے نکال کر بائی میں ڈال رہی تھی جب خالہ صغریٰ اندر داخل ہوئیں۔ اسے خالہ اچھی لگتی تھیں کیونکہ وہ اس سے ہمیشہ پیار سے بات کرتی تھیں۔ دوسروں کے برعکس ان کی آنکھوں میں اس کے لیے حقارت یا ترم کے نہیں بلکہ خلوص کے جذبات موجزن ہوتے تھے۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ سامنے ہی سونیا پر آمدے میں کو لنگر کتخت پر نیم دراز گئی ڈائجسٹ پڑھنے میں مصروف تھی۔ نعمان واک مین چڑھائے شاید گانے سن رہا تھا جبکہ سہرا ب موبائل پر مگنی سے پگھلے ہاتھوں میں مصروف تھا۔

”اماں کہاں ہے تمہاری؟“ اماں کے نظرنہ آنے پر انہوں نے پوچھا۔

”اماں اندر کمرے میں ہیں۔ بلاؤں انہیں۔“ ساجدہ نے مستعدی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ نہیں۔ میں اندر چلی جاتی ہوں، وہیں بات کر لوں گی۔“ خالہ صغریٰ نے انناشل کاک برقع اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اندر چلی گئیں۔ ساجدہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر انہیں اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اماں سے کیا بات کریں گی۔ خالہ صغریٰ رشتے کرانے کا کام کرتی تھیں اور اماں نے

ان کے ذمہ ساجدہ کے رشتے کی تلاش کا کام لگایا تھا اس سے پہلے ثریا آپا جو ساجدہ اور سہرا ب سے بھی بڑی تھیں کجا رشتہ بھی انہوں نے ہی کروایا تھا اور آج وہ اپنے گھر میں اپنے دو بچوں کے ساتھ خوش تھیں۔

وہ اپنے کام سے پوری طرح مخلص تھیں لیکن ساجدہ کی بد صورتی یہاں بھی آڑے آرہی تھی جو لوگ ساجدہ کو دیکھنے آتے تھے وہ سونیا کو پسند کر کے چلے جاتے تھے اور ساجدہ کو ان لوگوں سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ بھلا اندھیرے اور اجالے میں سے کس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اجالے کا اور سونیا روشنیاں بکھیرنے والا اجالا ہی تو تھی اور وہ سر تپا اندھیرا۔

”سارا دن کولہو کے تیل کی طرح کام میں جتی رہتی ہے۔“ وہ کسی کام سے اس کمرے کے پاس سے گزری تو اسے خالہ صغریٰ کی آواز آئی۔ ”کچھ تو احساس کرو اس کا۔ کیا تمہاری کچھ نہیں لگتی وہ۔“

”ارے تو گھر کے کام بچاں ہی کرتی ہیں۔ مجھ سے تو اب کام نہیں ہوتا۔ ساری زندگی کام کیا ہے۔“ اماں برا مان گئی تھیں شاید۔

”اس گھر میں صرف ساجدہ ہی لڑکی نہیں ہے۔ میں سونیا کی بات کر رہی ہوں۔ اس بھی گھر کے کاموں میں کچھ دلچسپی لینی چاہیے۔“

”وہ کالج میں پڑھتی ہے نا۔ پڑھائی کی وجہ سے ٹائم ہی نہیں ملتا اسے کہ وہ گھر کے کاموں میں حصہ لے۔ پھر باب کی بھی بہت لاڈلی ہے وہ۔ وہ ذرا سختی نہیں کرنے دیتے مجھے اس پر۔“

”معاف کرنا صرف باپ کی ہی نہیں مجھے تو وہ تمہاری بھی بہت لاڈلی لگتی ہے اور پڑھائی کی بھی خوب کمی میں تو جب بھی آؤں وہ با تو روز سالہ پڑھ رہی ہوتی ہے یا پھر لی وہ دیکھ رہی ہوتی ہے اور آج تک اسے کبھی اتنی توفیق تو نہیں ہوئی کہ مجھے سلام ہی کر لے۔“ خالہ صغریٰ کو سونیا سے بہت سی شکایتیں تھیں۔

”بھی بچی۔“ ہے نا۔ سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ۔“ اماں نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی۔ ”تم



بتاؤ وہ جو کام میں نے تمہارے ذمہ لگایا تھا اس کا کیا بنا؟“ ساجدہ جانتی تھی کہ اماں کون سے کام کے بارے میں استفسار کر رہی ہیں۔ اس کا بی ایک دم اجاڑ ہو گیا وہ مڑ کر جانے لگی لیکن اسی وقت خالہ کی آواز آئی۔

”ساجدہ! ایک گلاس پانی لانا۔“

”اچھا خالہ لاتی ہوں۔“ اس نے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی اور اسے گلاس میں انڈیلنے لگی پھر کچھ سوچ کر اس نے روح افزا کی بوتل نکال کر شربت بنا لیا۔

”کیسے لوگ ہیں؟“ وہ کمرے میں گئی تو اماں خالہ سے پوچھ رہی تھیں اس نے شربت کا گلاس خالہ کی طرف بڑھایا۔

”ایسے ہی متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ لڑکا کسی ٹیکسٹری میں کام کرتا ہے شاید۔“ خالہ نے کچھ چونک کر شربت کو دیکھا پھر گھونٹ گھونٹ پینے لگیں۔

اس نے دوسرا گلاس اماں کی طرف بڑھایا جو انہوں نے فوراً لے لیا اور اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ صاف ظاہر تھا اماں اس موقع پر اس کی غیر حاضری چاہتی تھیں۔

وہ کمرے سے تو باہر آگئی۔ لیکن آگے جانے کے بجائے وہیں دروازے کے ساتھ ٹھہری رہی۔

”وہ لوگ ساجدہ کو پسند کر لیں گے؟“ اماں کی آواز سنائی دی۔

”کہہ تو رہے تھے کہ ہمیں خوب صورت نہیں خوب سیرت لڑکی کی تلاش ہے جو خاندان والوں کے ساتھ مل جل کر رہے اور گھر کا کام کاج کرنا بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“

”نہنے کو سب ہی کہہ دیتے ہیں۔“ اماں کی آواز تلخ ہو گئی۔ ”لیکن یہاں آکر اور ساجدہ کو دیکھ کر ان کے تیور ہی بدل جاتے ہیں۔“

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ساجدہ کی شادی کیسے ہوگی۔“ اماں نے ٹھنڈی آہ بھری ”کیا ساری زندگی وہ ایک بھاری پتھری طرح ہمارے سینے پر دھری رہے گی۔“

ساجدہ نے قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن وہ تو بالکل سن ہو چکے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو تھینا اور واشنگ مشین کے قریب جا کر اس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس کے ذہن میں اماں کے الفاظ کسی تھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

”بھاری پتھر۔۔۔ بھاری پتھر۔۔۔“

”اچھا بیٹی! میں جارہی ہوں۔“ وہ مڑ نکال رہی تھی جب خالہ واپسی کے لیے جاتے ہوئے اس کے پاس سے گزریں۔

”خالہ!۔۔۔“ وہ اس نے خالہ کو پکارا۔ خالہ جاتے جاتے رک گئیں اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”خالہ!۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔“ وہ خالہ سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ رشتہ دیکھنے کے لیے آنے والوں کو منع کر دیں اس میں اب مزید مسترد ہونے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔

”خالہ! وہ آپ پلیر کھانا کھا کر جائے گا۔ بس تیار ہونے والا ہے۔“ آخر اس نے فقرہ مکمل کر ہی لیا لیکن ان الفاظ سے نہیں جن سے وہ مکمل کرنا چاہتی تھی۔

”نہیں بیٹی! دیر ہو رہی ہے پھر کبھی کھالوں کی۔ جیتی رہ خوش رہ بیٹا۔“ انہوں نے جاتے جاتے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اسے لگا خالہ نے اسے دعا نہیں بلکہ بددعا دی ہو۔

جس دن رشتہ دیکھنے والوں نے آنا تھا اس دن اماں نے ثریا آکھوایا تھا۔ اپنے ساتھ وہ ساجدہ کے لیے اپنے جیز کا ایک گھسا پٹا اور آؤٹ آف فیشن قسم کا سوٹ لائی تھیں جو اماں نے ان سے لانے کے لیے کہا

تھا۔ کیونکہ ساجدہ کے پاس ایک بھی ایسا ڈھنگ کا سوٹ نہیں تھا جسے وہ رشتہ دیکھنے کے لیے آنے والے والوں کے سامنے پہن سکتی۔ پہلے اماں نے سوینا سے اس سلسلے میں مدد چاہی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس کے اتنے ”مارٹ اسمارٹ“ سے

کپڑے بھلا ساجدہ جیسی ”چھٹی خاصی“ لڑکی کو کہاں پورے آسکیں گے۔ نتیجتاً ”ثریا“ آپا سے اس سلسلے میں مدد چاہی گئی تھی اور وہ اپنے ساتھ بقول ان کے اپنے جیز کا سب سے اچھا سوٹ لائی تھیں۔ یہ بلیک کلر کا ریشمی سوٹ تھا جو کڑھائی سے بالاب بھرا ہوا تھا۔

اسے پہن کر ساجدہ اچھی تو لگتی تھی مگر خیر کتنے لگی۔ اور جب اماں نے مہمانوں کے آنے سے کچھ دیر پہلے سوینا سے کہا کہ وہ میزوں میں چلی جائے تو وہ

سمسخرانہ نظروں سے ساجدہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا میرے یہاں سے چلے جانے سے وہ لوگ ساجدہ کو پسند کر لیں گے؟“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے سوینا! تم یہاں سے جاؤ۔“ اماں نے رکھائی سے کہا۔

”اچھا بابا! جاتی ہوں۔ ناراض کیوں ہوتی ہیں۔“ اماں کے تیور خطرناک دیکھ کر اس نے مصالحتانہ انداز اختیار کیا پھر ذرا جھک کر آہستہ سے بولی۔ ”اگر تھوڑے سے پیسے دے دیں تو اچھا ہو گا۔ اب ساتھ والوں کے گھر کیا میں خالی ہاتھ بیٹھی رہوں گی۔“

اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”ابھی دو دن پہلے ہی تم نے اپنے باپ سے اچھے خاصے پیسے اٹھائے ہیں۔ وہ کہاں گئے ہیں۔“

”وہ۔۔۔ وہ تو خرچ ہو گئے ہیں۔“ سوینا نے شہانہ انداز سے کہا۔

آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے ان سے پیسے مانگے تو وہ کتنا غصے میں آگئے تھے۔

”کیا میں کسی خزانے پر بیٹھا ہوا ہوں جب دیکھو پیسے مانگتے آ جاتی ہو۔“

”آپ کو بتایا تو تھا کہ ساجدہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔“ اماں نے بتایا۔

”بتا ہے مجھے۔ ہر دو تین ہفتے کے بعد یہی ڈراما ہوتا ہے۔ لیکن کیا کبھی اس کا کوئی نتیجہ بھی نکلا ہے؟ تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسے لوگ صرف کھانے پینے کے لیے آتے ہیں اور بس۔“

”تو آپ ہی بتائیں مجھے کہ میں کیا کروں۔ رشتہ کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ دعا کریں کہ آج آنے والے ساجدہ کو پسند کر لیں۔“

”میں تو کروں گا دعا۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو گا۔ سہر حال یہ پیسے لو اور میری جان چھوڑو۔ پیسے لیے بغیر کہاں ملو گی تم۔“ اماں نے کہا تو کیا احسان کیا اور اماں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

اماں سے تھوڑی بحث کے بعد سوینا برا منہ بناتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اماں نے ساجدہ سے کہا کہ وہ تیار ہو جائے۔ صبح سے کام کر کے وہ خاصی تھک چکی تھی۔ ویسے تو ثریا آپا اس کی مدد کے خیال سے صبح جلدی آگئی تھیں لیکن یہاں آکر انہوں نے سوائے اپنی ساس مندوں کی برائیوں کے اور کچھ نہیں کیا تھا۔

اور اسے کون سا کوئی آج کل کی لڑکیوں کی طرح تیار ہونا آتا تھا۔ منہ صاف سے دھو کر ثریا آپا کے لائے کپڑے پہنے۔ بالوں کی لمبی سی چوٹی بنائی اور اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ کس کے چوٹی کیے اور بے حد لمبا اور کھلا بلیک کلر کا بالاب کڑھائی سے بھر اسوٹ پہنے وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہی تھی اور اسی مضحکہ خیز حیلے میں وہ مہمانوں کے سامنے آئی۔ مہمانوں میں ایک بڑی بی اور ان کی دو بیٹیاں شامل تھیں لڑکیوں نے جی بھر کر منہ پر میک اپ ٹھوپا ہوا تھا اور کڑھائیوں والے کرتے پہن رکھے تھے اور وہ خود کو ملکہ حسن سے کم



مجھے پر تیار نہیں تھیں۔

اماں مہمانوں کے سامنے پیچھی جارہی تھیں۔ موضوع گفتگو ساجدہ کی تعریفیں تھیں۔ تینوں خواتین اماں کی باتیں سننے سے زیادہ کھانا کھانے میں مصروف تھیں۔

”توبہ ہے آپ کی بیٹی۔“ ساجدہ کے سامنے آنے اور سلام کرنے پر بڑی بیٹی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”ہاں یہی ہے ساجدہ۔ گھر کا سارا کام یہی کرتی ہے اور یہ سارا کچھ بھی اسی نے بنایا ہے۔“  
خالہ صفری نے ان کو بتایا تھا کہ لڑکی خوب صورت نہیں ہے بلکہ قبول صورت ہے یعنی عام سی۔ لیکن وہ تو عام درجے سے بھی خاصی کمتر تھی۔ اور جس قسم کے کپڑے اس نے پہنے ہوئے تھے اس قسم کے کپڑے تو آج کل مایاں بھی پہننا پسند نہیں کرتیں۔ انہیں ایک دم ماسی صفری پر پیش آنے لگا جنہوں نے ایسی فضول اور بد صورت لڑکی ان کے ”مہیرا“ جیسے بیٹے کے لیے پسند کی تھی۔

ساجدہ ان کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور سر بالکل جھکا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا چھوڑا بہت اعتماد بھی رخصت ہو جاتا تھا اور وہ شکل سے ہی حواس باختہ لگنے لگتی تھی۔

”یہ یہ فروٹ چاٹ ہیں نا آپ۔ بہت اچھی بنائی ہے ساجدہ نے۔“ اماں کو ان کے چہرے کے تاثرات خوف زدہ کر رہے تھے۔ اسی لیے وہ گڑبڑا کر بولیں۔

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔“ بھلا کھانے سے کیا دشمنی تینوں نے ہی اپنی پلیٹیں فروٹ چاٹ سے بھر لیں واقعی بہت مزے کی بکری ہوئی تھی۔ باقی ساری چیزیں بھی بہت اچھی بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے پوری طرح انصاف کیا۔ اماں درمیان میں ساجدہ کی تعریفیں کرتی رہیں لیکن بھلا ایسی احمق اور بد صورت لڑکی کا انہوں نے اچھا ڈالنا تھا۔ سنی ان سنی کر کے بیٹھی رہیں۔

”آپ کی تیسری بیٹی بھی تو ہے وہ کہاں ہے؟“ خوب جی بھر کر کھانے کے بعد فیشن کی ستانی ہوئی فری مائل لڑکی نے اماں سے پوچھا۔ اس کا رنگ

گہرا سائلا تھا لہکن، میک اپ اور ہلکی ہلکی جیولری کی وجہ سے کچھ ہتھ لگ رہی تھی۔

”ہاں ہے تو۔“ اماں انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ ”لیکن وہ اپنی دوست کے گھر گئی ہوئی ہے۔“ اسے پتا نہیں تھا کہ گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔ ”دوسری لڑکی نے اعتراض کیا۔ وہ فیشن کے معاملے میں اپنی بہن سے بھی چار ہاتھ آگے تھی۔ اس کا ٹراؤزر جنٹوں سے خلاصا اونچا تھا۔ اور اوپر انتہائی چھوٹی اور تنگ سی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

”پتا تو تھا اسے لیکن کام بہت ضروری تھا۔ ٹولس لینے تھے اس نے۔“ اب کی بار ثریا تپانے کہا۔

”اچھا کون سی جماعت میں پڑھتی ہے وہ؟“  
”تھرڈ ایر میں۔“ ثریا تپانے بتایا۔

”اچھا۔ اچھا۔“ لڑکی کی سمجھ میں آیا یا نہیں لیکن اس نے سر ضرور ہلایا۔

”اور۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ پڑھتی ہیں؟“ اب کی بار روئے سخن ساجدہ کی طرف تھا۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں تو نہیں پڑھتی۔“ ساجدہ نے ہٹکا کر کہا۔

اماں کا جی چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لیں۔ اس کے انداز اور اس کی بات پر۔ اس نے نوٹس کلاس میں پڑھائی چھوڑ دی تھی لیکن وہ خود کو میزنگ بھی تو ظاہر کر سکتی تھی۔ وہ کون سا جا کر تحقیق کرتے۔

”توبہ ہے یہ تو بھلی بھی ہے۔“ بڑی بیٹی نے کوفت سے سوچا۔

”بس جاری ہیں آپ؟ کچھ دیر اور رک جاتیں۔“ اماں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔ بس چلتے ہیں دیر ہو رہی ہے۔“ ان کی بے زاری ان کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

”اچھا پھر کب آئیں گی آپ؟“ اماں نے ایک امید سے پوچھا۔

”ہم صفری کو جواب دے دیں گے۔“ بڑی بیٹی نے ایک اور اے بے نیازی سے کہا۔ اور کچھ کسے نے بغیر باہر نکل گئیں ان کی دونوں فیشن زدہ نیٹیاں بھی ان کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

اماں دل تھام کر رہ گئیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں ساجدہ پسند نہیں آتی ان کی ٹائپینڈیگی ان کے روکھے انداز سے صاف ظاہر ہو رہی تھی اور اگلے دن اس بات کی تصدیق خالہ صفری نے انکر کر دی۔

”بڑی باتیں سنائیں جی انہوں نے مجھے۔“ خالہ صفری کا چہرہ بچھا ہوا تھا۔ ”کہہ رہی تھیں کہ ہمارے بیٹے کے لیے کیا یہ کالی بد صورت ہی رہی گئی تھی۔“

”اچھا تو وہ ایسا کہہ رہی تھیں۔“ اماں غصے سے بولیں۔ ”خود وہ کیا کہہ قاف کی پریاں تھیں۔“

”بس جی۔ کیا بتاؤں اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔“ خالہ صفری کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ خود ان کی بھی بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ ساجدہ کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔

”تمہیں ایسے فضول لوگوں کو لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”لو جی مجھے کیا پتا تھا؟ خالہ صفری کچھ برا مان گئیں۔ ابا کو بتا چلا تو انہوں نے فوراً اماں کو حتمیا۔

اماں جواب میں چپ رہیں۔ البتہ ان کی باتوں کا غصہ بعد میں انہوں نے ساجدہ پر نکالا کہ اللہ نے ایسی بد صورت اور احمق بیٹی ان کے ہی نصیب میں لکھی تھی۔ ساجدہ جواب میں صرف آنسو ہی بہاتی رہی وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہندی لگا کے رکھنا  
ڈول سجا کے رکھنا

ساتھ والی روینہ خالہ کے بیٹے سمیر کی شادی تھی۔ اس لیے شادی والے گھر سے بہت زور زور سے ڈیک سے گانوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ سمیر روینہ خالہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ کسی بڑس فرم میں ایک اچھی پوسٹ پر ملازمت کرتا تھا۔ دوران ملازمت ہی اس کا اپنے پاس کی بیٹی سے کوئی چکر چلا تھا جس کے نتیجے میں اس کی شادی اب اپنے پاس کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ روینہ خالہ نے بڑے فخر سے پورے محلے کو بتایا تھا کہ ان کے بیٹے کی شادی کتنے اونچے گھرانے میں ہو رہی ہے۔ شادی کسی بڑے مین جہاں میں ہو رہی تھی۔ اماں سے ان کی خاصی جنتی تھی۔ اس لیے وہ ان لوگوں کو بطور خاص انوائٹ کر کے گئی تھیں۔

سونیا اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے خاصی برجوش تھی اسے ویسے بھی ایسی تقریبات میں شرکت کرنے کا بہت شوق تھا۔

ساجدہ کا شادی میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ اس وقت حیران رہ گئی جب اماں نے اس سے بھی شادی میں چلنے کے لیے کہا۔

”کیا میرا جانا ضروری ہے؟ میں نہیں جاؤں گی۔“ ساجدہ نے صاف انکار کر دیا۔

”تو کیا گھر میں ایسی بیٹھی رہو گی۔ تمہارے ابا اور سراب بھی آج کہیں والی ہال بیچ دیکھنے جا رہے ہیں۔“ اماں ایسے ساتھ والوں کے گھر چلی جاؤں گی۔“ ساجدہ نے راہ فرار ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

”وہ لوگ بھی شادی پر جا رہے ہیں۔“ اماں نے



اسے بتایا پھر کچھ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔ ”نجانے تم کیوں لوگوں سے چھپتی پھرتی ہو۔ ہمیں دو چار لوگ اٹھنے دیکھ لو۔ فوراً ہونق بن جاتی ہو۔“

”ماں! وہ۔۔۔“ ساجدہ نے اپنی صفائی میں کچھ کمنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔

”بس رہنے دو۔“ ماں نے بیزاری سے اس کی بات کاٹی۔ ”جاؤ جا کر تیاری کرو۔“

اسے شادیوں کے لیے تیاری کرنا کہاں آتا تھا۔ تیاری کرنا تو سونیا کو آتا تھا۔ وہ ایسے تیار ہوتی تھی کہ اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے تھے اب بھی وہ پوری دل جمعی سے اپنے آپ کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔

وہ لوگ شادی والے گھر پہنچے تو وہ لوگ بارات لے جانے ہی والے تھے ماں رو بہ رو بینہ خالہ کو مبارک باد دینے کے لیے آگے بڑھ گئیں۔ جبکہ وہ اور سونیا سمیر کی بہن صوفیہ کی پاس آگئیں۔

”ہائے سونیا! آج تو تم بہت پاری لگ رہی ہو۔“ صوفیہ نے سونیا کو دیکھتے ہی چمکتے ہوئے کہا۔

”صرف آج؟“ سونیا نے اداے خاص سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں وہ تو ہمیشہ سے ہی ہو۔ لیکن آج تو کچھ زیادہ ہی لگ رہی ہو۔ ہمیں نظر نہ لگ جائے۔“

”نہیں لگتی۔“ سونیا نے کندھے جھٹکے۔

”وہ کیوں بھی۔ کیا نظر کا تعویذ باندھ کر لے جا رہی ہو۔“ اس نے شوخی سے پوچھا۔

”نہیں بھی یہ ساجدہ جو میرے ساتھ ہے اس کے ہوتے ہوئے نظر لگ سکتی ہے مجھے۔“

اس کی بات پر صوفیہ نے قہقہہ لگایا اور۔۔۔ سونیا ہنسنے لگی۔

ساجدہ کو اچانک وحشت ہونے لگی۔ وہاں پر موجود خوب صورت اور بنے سنورے لڑکے لڑکیوں سے۔

اسٹیج پر موجود رومالداہن سے وہاں پر چلنے والے گانوں اور ان کے بولوں سے

اس کے لیے وہاں کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ اس نے چپکے سے سونیا کو بتایا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہے، ابھی آجائے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اعتراض کرتی وہ وہاں سے چلی آئی۔ شادی کا سارا انتظام ایک بڑے ہال میں تھا۔ ہال سے باہر ایک کھلا احاطہ تھا۔ وہاں پر اکاؤنٹانٹ موجود تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باہر چپ چاپ کسی کونے میں بیٹھ رہے گی سو وہ تیزی سے چل رہی تھی جب کسی سے ٹکرائی۔ وہ کوئی لڑکا تھا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھلائی پھر سنبھل گئی۔

”یالہ خیر۔“ لڑکے نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”یہ شادی کی تقریب میں چڑیلین کہاں سے آگئیں۔“ مگر کچھ اس نے یہ بات سرگوشی کے سے انداز میں کہی تھی لیکن اس کی سرگوشی اتنی بلند ضرور تھی کہ پاس کھڑے کچھ لوگوں نے سن لی۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے دانت نکل آئے اور کچھ نے فمائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

ساجدہ کا مارے خفت اور شرمندگی کے برا حال ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لہلہاں بھر گئیں اور قریب تھا کہ وہ چھلک جاتیں کہ اس نے ایک آواز سن۔

”آپ کو لڑکیوں سے بات کرنے کے مہینہ نہیں ہیں؟“ ساجدہ نے دیکھا وہ ایک نازک سی لڑکی تھی جو اس لڑکے سے سخت لمبے میں کہہ رہی تھی۔

”آپ کی تعریف؟“ لڑکے نے خاصی دلچسپی سے اس کے خوب صورت سراپے کو جانچا تھا۔

”میری تعریف کو آپ چھوڑیں۔ ابھی جو آپ کی تعریف میں کروں گی وہ آپ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“

”جی؟“ لڑکے نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”پہلے آپ خود کو تو آئینے میں دیکھ لیں پھر دوسروں کو بددھیں کہتے پھر لے گا۔“

”آخر آپ ہیں کون۔ اور خواہ مخواہ میرے گلے کیوں پڑ رہی ہیں؟“ لڑکے نے جھنجھلا کر کہا۔

”وشٹ اپ مجھے کیا ضرورت ہے آپ کے گلے پڑنے کی۔“ اس کی صبیح پیشانی پر غصے کے مارے بل

پڑ گئے۔

اس سے پہلے کہ بات مزید بڑھتی۔ اس لڑکے کو اس کا کوئی دوست اندر لے کر چلا گیا اور وہ غصے سے بددھانا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ارد گرد کے لوگ بھی وہاں سے نود گیارہ ہو گئے۔

”ایسے لوگوں سے نمٹنا مجھے خوب آتا ہے۔“ لڑکے کے وہاں سے رخصت ہونے اور لوگوں کے وہاں سے نود گیارہ ہونے کے بعد اس لڑکی نے ساجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ساجدہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اسے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔

”آپ۔۔۔ آپ نے خواہ مخواہ میری وجہ سے تکلیف کی۔“ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

”ارے نہیں تکلیف کیسی۔ وہ تو اندر چلا گیا اور نہ میں نے اسے اور بھی سنائی تھیں۔۔۔ ویسے۔۔۔“ وہ تیز بولتے بولتے اچانک رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ تکلیف اگر آپ خود کرتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں۔۔۔ اس سے یہ سب کتنی بچا۔“

”ہاں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی لیکن بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ شاید یہ اس کا اعتماد تھا جو اسے خوب صورت بنا رہا تھا۔

”مجھ میں اتنی ہمت کہاں؟“ وہ بے چارگی سے بولی اور پھر میں کس کس کی زبان روکوں گی۔ لوگ یہ سچ اکثر بولتے ہی رہتے ہیں۔ جب مجھے اللہ نے بنایا ہی ایسا ہے تو اب کہا ہو سکتا ہے۔“

”لوگوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کی انسلٹ کریں اور مذاق اڑائیں۔“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”اور معاف کیجئے گا۔ اللہ نے آپ کو ایسا نہیں بنایا۔ آپ خود ایسی بن گئی ہیں۔ آپ احساس کمتری کا شکار ہیں۔“

”تو ایسی شکل پہ میں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں گی تو کیا احساس برتری کا شکار ہوں گی۔“ ساجدہ

نے تنہی سے کہا۔

”خیر چھوڑیں آپ اس موضوع پر پھر کبھی بات کر لیں گے۔ مجھے فائزہ کہتے ہیں۔ اور آپ کو؟“ اس کا انداز خاصا دوستانہ تھا۔ ساجدہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔

”ساجدہ!“

یہ فائزہ سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ فائزہ تھوڑی ہی دیر میں اس سے بے تکلف ہو گئی اور آپ سے تم پر آگئی۔ ساجدہ کو وہ بہت اچھی لگی۔ سادہ اور پر خلوص۔

اس نے جاتے ہوئے ساجدہ سے اس کے گھر کا ایڈریس لیا اور کہا کہ وہ اس کے گھر آئے گی۔ لیکن ساجدہ کو یقین تھا کہ وہ اس کے گھر کبھی نہیں آئے گی۔ شاید شادی کی تقریب سے واپسی کے بعد اسے یاد بھی نہ رہے کہ وہ بھی ساجدہ نام کی کسی لڑکی سے ملی بھی تھی۔ لیکن ساجدہ کے دل نے فائزہ سے ایک مرتبہ پھر ملنے کی تمنا ضرور کی تھی۔ اور اس بات کی بھی کہ کاش وہ بھی فائزہ جیسی بن سکتی!

\*\*\*

لیکن پہلی بار ساجدہ کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ شادی کے صرف دو دن بعد فائزہ ان کے گھر آدھمکی لگی۔ کال بیل بجنے کی آواز پر دروازہ ساجدہ نے کھولا تھا اور فائزہ کو سامنے پا کر وہ تھوڑی دیر کے لیے ہونق بن گئی۔

”ساجدہ!“ فائزہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ”کیا بت بن گئی ہو۔ اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“

”نہیں نہیں۔۔۔ اندر۔۔۔ اندر آؤنا۔“ وہ مرتلش آواز میں بولی اور اس کو اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔

”وہ دراصل مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔“ فائزہ کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس نے وضاحت کی۔

”کس بات کا یقین؟“ فائزہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔



”کیوں؟ میں تمہارے گھر نہیں آسکتی کیا؟ تمہارے گھر آنے سے پہلے اپنا منٹ لیتا پڑتا ہے؟“ وہ مسکرائی تو اس کے سفید دانت جھلک کر نظر آئے۔

”نہیں نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ گھر کر وضاحت کرنے لگی۔ ”اس دن آپ نے میرے گھر کا ایڈریس لیا تو میں سمجھی کہ آپ ایسے ہی لے رہی ہیں۔ گھر نہیں آئیں گی۔“

”کم آن۔ ساجدہ ڈارلنگ! میں ایسے ہی کوئی کام نہیں کرتی۔“ اس نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اور یہ تم مجھے آپ آپ کہنا چھوڑو، اتنی بڑی نہیں ہوں میں تم سے۔“

ساجدہ نے جواب میں مسکراتے کی کوشش کی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ وہ ایک دلو اور کم اعتماد لڑکی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک کوئی لڑکی اس کی دوست تو کیا شائسا بھی نہیں بن سکی تھی اور کبھی اس کے گھر صرف اسی سے ملنے تو کوئی بھی لڑکی نہیں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے تو لازمی تھے۔

”آئی! میرا مطلب ہے تمہاری امی کہاں ہیں؟“ فائزہ نے پوچھا۔

”اماں؟ وہ اندر کمرے میں بیٹھی ہیں۔“ ساجدہ نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں اماں بیٹھی ہوئی تھیں۔

”اچھا چلو، پہلے انہیں ہی سلام کرتی ہوں۔“ فائزہ اس کمرے کی طرف بڑی تو ساجدہ جلدی سے بچن میں آکر اس کے لیے شربت بنانے لگی جلدی جلدی الشا سیدھا شربت بنا کر وہ اس کمرے میں آئی تو فائزہ اماں کے ساتھ بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی اماں کے چہرے پر حیرانی صاف نظر آرہی تھی۔ ساجدہ سے ملنے کے لیے پہلی بار کوئی لڑکی آئی تھی۔

”اف ساجدہ! تم نے شربت میں اتنی چینی ڈال دی۔“ فائزہ نے شربت کا ایک گھونٹ لے کر منہ بنایا۔ ”وہ درد۔ دراصل جلدی میں بنایا ہے، تا تو اس لیے

شاید۔“ ساجدہ حسب عادت گھبرا گئی۔

”اس کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بھال ہے جو کبھی کوئی کام دیکھ بھال کر کیا ہو۔“ اماں بولے بغیر نہیں رہ سکیں۔

”شس اوکے آئی! میرے ساتھ بھی اکثر ایسا ہو جاتا ہے، میں بھی زیادہ تر کام اٹے سپدھے ہی کرتی ہوں۔“ فائزہ نے بات سنبھالی۔

فائزہ کو شرمندگی ہونے لگی تھی۔ ”سوری ساجدہ! میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری امی ایسے ری ایکٹ کریں گی۔“ وہ دوسرے کمرے میں آکر بیٹھی تھیں۔ جب فائزہ نے کچھ شرمندہ سے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ چھپکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

”آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ اماں تو بس ایسے ہی۔“

”پھر وہی آپ؟“ فائزہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”ارے بابا! میں تمہاری دوست ہوں۔ جب میں تمہیں۔۔۔ تم کہتی ہوں تو تم بھی تم کہا کرو نا۔“

”یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھتی ہیں۔“

”جی۔۔۔ اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔“ ساجدہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

”اچھا چھوڑو! ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟“ فائزہ نے اس کے موڈ کو محسوس کرتے ہوئے ٹانگ تبدیل کر دیا۔

”بس گھر کے کام کرتی ہوں۔ صفائی ستھرائی کرنا، کھانا پکانا، پڑے دھونا وغیرہ۔“

”اچھا بس۔ سارا دن یہی کرتی رہتی ہو۔“ وہ دونوں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ جب تھوڑی دیر بعد سونیا کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے

ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔ فائزہ کو دیکھ کر وہ کچھ حیرت زدہ سی ہو گئی۔ پھر کندھے اچکا کر بولی۔ ”ہیلو۔“ ایک ہیلو فائزہ کی طرف پھینک کر وہ ساجدہ کی طرف متوجہ

ہوئی۔

”ساجدہ! اماں کہہ رہی ہیں جلدی سے کھانا بناؤ۔ سب لوگوں کو بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔“

ساجدہ نے شرمندگی سے فائزہ کو دیکھا۔ وہ حیرت سے سونیا کو دیکھ رہی تھی۔

”سونیا! ساجدہ نے آہستگی سے کہا۔ ”تم جاؤ، میں ابھی کھانا بنا رہی ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا جلدی کرو۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ تمہاری تو باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہیں۔“

مہمان کا لحاظ کیے بغیر وہ بولتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”تمہاری بہن تم سے بہت مختلف ہے۔“ سونیا کے جانے کے بعد فائزہ نے کہا۔

”ہاں۔ وہ بہت خوب صورت ہے اور میں بہت بد صورت۔“

”نہیں ساجدہ! میرا مطلب یہ نہیں تھا، تمہارے مقابلے میں وہ اخلاق، تمیز، تہذیب سے کوسوں دور ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے اخلاق و کردار سے ہوتی ہے۔“

”آپ پڑھاتی ہیں نا۔ اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“ فائزہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ”ورنہ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ لوگ صرف شکل و صورت کو دیکھتے ہیں۔ کردار اور اخلاق کو کوئی نہیں دیکھتا۔“ اس کی آواز میں تلخی آگئی۔ ”اور میں دوسروں کی شکایت کیا کروں۔ میرے اپنے گھر والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔“

ساجدہ کو واقعی دکھ ہوا تھا آج سونیا اور اماں کے رویے سے۔ صرف آج اگر وہ خود کھانا بنالیتییں یا بازار سے منگوا لیتییں تو کیا فرق پڑ جاتا۔

”جو لوگ تمہاری طرح اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر بیٹھ جائیں اور تمام خرابیوں کا ذمہ دار قسمت کو سمجھنے لگیں، ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

ساجدہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ ساجدہ ڈیر کہ اپنا حق زینا سے لیتا پڑتا ہے۔ کوئی پلیٹ میں سجا کر پیش نہیں کرتا۔“ ”مجھے ایسا کہاں کرنا آتا ہے۔“ وہ آزدگی سے بولی۔

”اچھا چلو، فی الحال تم اٹھو اور کھانا بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری ملکہ حسن بہن سونیا دوبارہ انٹری دے دے۔“ فائزہ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

ساجدہ نے شرمندگی سے اسے دیکھا۔ ”اور۔۔۔ آہ۔۔۔“ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس تمام عرصے وہ کیا کرے گی۔

”میں؟ میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور ہم لوگ مل کر کھانا بنائیں گے۔“

”نہیں فائزہ جی۔ میں پہلے ہی آپ سے شرمندہ ہوں۔ مجھے مزید شرمندہ مت کریں۔“

”کوئی بات نہیں، تھوڑی سی شرمندگی اور سہ لو۔“ وہ ہنس کر بولی۔ پھر وہ اس کے روکنے کے باوجود فائزہ اس کے ساتھ بچن میں آکر کھانا بنانے میں اس کی مدد کرنے لگی اور پھر ان دونوں نے مل کر بہت اچھا کھانا بنایا۔

کھانے میں آلو گوشت تھا اور ساتھ میں سلاد اور چاول۔

فائزہ نے ساجدہ کے منع کرنے کے باوجود اس کے ساتھ دسترخوان پر کھانا لگانے میں بھی اس کی مدد کی اور جب وہ کھانا سو کر رہی تھی تو اس نے سونیا اور اماں کے چہرے پر واضح شرمندگی محسوس کی۔

اماں نے کچھ شرمندہ سے انداز میں کہا۔ ”بیٹا! تمہیں کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔“

”کوئی بات نہیں آئی! ساجدہ کاموں میں لگ گئی تھی تو میں وہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کھیاں مارتی اور ویسے بھی۔ فائزہ نے کن اٹھیں سے سونیا کی طرف دیکھا۔ ”گھر کا کام کرنے سے کون انسان کی شان میں کمی آ جاتی ہے۔“

فائزہ نے بظاہر ٹھنڈے بیٹھے انداز میں کہا تھا۔ لیکن جس پر اس نے طنز کیا تھا وہ اچھی طرح سمجھ گئی



تھی۔ تب ہی سونیا کی پیشانی پر ہل پڑ گئے تھے۔  
فائزہ کے سامنے تو وہ کچھ نہیں بولی۔ لیکن اس کے  
جانے کے بعد اس نے اماں اور ساجدہ کے سامنے اس  
کی جی بھر کر برائیاں کیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکالی  
تھی۔

☆☆☆

”ارے اس لڑکی کی فکر تو مجھے کھائے جا رہی ہے۔  
نہ جانے کیا ہوگا اس کا۔ ابھی تو ہم اس کے سر پر ہیں۔  
کل کو ہم نہ ہوں گے تو کس کے سہارے زندگی  
گزارے گی۔“

ثریا آپا آج چھٹی کے دن ان کے گھر آئی ہوئی  
تھیں اور اماں ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں  
کر رہی تھیں۔ موضوع گفتگو ساجدہ تھی۔

ساجدہ نے دوسرے کا کھانا تیار کرنا تھا۔ وہ چکن میں آکر  
سالن پکانے لگی۔ وہ کوئی نئی باتیں نہیں کر رہی تھیں  
کہ جن کو سن کر وہ اپنا جلا ہوا دل مزید جلا کر اپنا وقت  
ضائع کرتی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ان ہی لوگوں نے شور  
کرنا تھا کہ اتنی بھوک لگی ہوئی ہے اور کھانا ابھی تک  
تیار نہیں ہوا۔ کیونکہ کھانا تیار کرنا تو صرف اسی کی ذمہ  
داری تھی۔

”بڑی خوشبو میں آ رہی ہیں بھی۔ کیا پک رہا ہے  
آج؟“

وہ فریق سے آنا نکال کر اس کے پیڑے بنا رہی تھی،  
جب نومی اندر داخل ہوا، پھر اس کے جواب کا انتظار  
کے بغیر اس نے دیکھی کا ڈھکن ہٹا کر پکا ہوا خوراک  
کرنا چاہا۔ لیکن ڈھکن سے نکلنے بھاپ نے اس کا ہاتھ  
جلا دیا اور اس نے ”سی“ کر کے ڈھکن چھوڑ دیا جو  
زوردار آواز کے ساتھ عازم فرش ہو گیا۔

ساجدہ بیٹنے لگی۔ ”بے وقوف! کیا ضرورت تھی  
تمہیں گرم گرم ڈھکن کو ہاتھ لگانے کی۔ اب جل گیا  
ہاتھ تمہارا۔“

”چلیں آپ اس ہمانے نہیں تو سی۔ قسم سے  
مدت ہو گئی ہے آپ کو اس طرح کھکھلا کر بیٹنے

ہوئے دیکھے۔“ وہ اپنا جلا ہوا ہاتھ سنک کے نیچے لے کر  
کھڑا ہو گیا۔

”نومی!“ وہ ڈھکن اٹھا کر دوبارہ سے دیکھی پر دیکھ  
گئی۔ ”تم مجھے آج فائزہ کے گھر لے جاؤ گے؟“  
”فائزہ؟“ نومی نے پر خیال نظروں سے اسے  
دیکھا۔ ”چھا وہ آپ کی نئی دوست۔“

”ہاں ویسی بتایا تو تھا میں نے تمہیں اس کے بارے  
میں۔“  
”چلیں ٹھیک ہے، کھانا کھانے کے بعد چلیں گے  
ہم ان کے گھر۔“

”نومی! تم بہت اچھے ہو، سب سے اچھے۔“ ساجدہ  
نے تشکر سے اسے دیکھا۔

”وہ تو خیر میں ہوں۔“ اس نے کار اکر لائے۔ ”بس  
کچھ لوگ ہیں جو اس بات کو نہیں مانتے۔ اچھا میں  
ابھی ٹی وی پر بیچ دیکھنے جا رہا ہوں۔ جب کھانا پک  
جائے تو مجھے بلا دیجئے گا۔“

ساجدہ نے اثبات میں سر ہلایا اور جلدی جلدی کھانا  
بنانے لگی۔ پھر سب کے کھانا کھانے کے بعد اس نے  
اماں سے جانے کی اجازت مانگی۔

”واہ بھی، اب تو ساجدہ کی بھی دوستیں بننے لگی  
ہیں۔ خدا خیر ہی کرے۔“ سونیا کا انداز مسخرانہ تھا۔

”کیوں جب ہر فضول لڑکی تمہاری دوست بن سکتی  
ہے تو ایک معقول لڑکی ساجدہ آپا کی دوست کیوں نہیں  
بن سکتی۔“ نومی نے توجہ انداز میں کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا تم ہر بات میں میری  
مخالفت کرنے کے لیے کیوں پہنچ جاتے ہو۔“ سونیا نے  
بد مزگی سے کہا۔

”تم بات ہی ایسی کرتی ہو۔“

”کیسی کیا بات کر رہی ہیں میں نے۔ تھوڑا سا مذاق  
ہی تو کیا تھا میں نے۔“

”مذاق کرنے کے لیے تمہیں ساجدہ آپا ہی ملی ہیں  
اور کسی کے ساتھ مذاق کرنا تو تمہیں پتا چلے۔“

”تم سونیا کے ساتھ خواہ مخواہ مت الجھا کر۔“  
ساجدہ نے راستے میں نومی سے کہا۔

”جب وہ آپ کے ساتھ بد تمیزی سے پیش آتی  
ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔“

”جانے ہو گب وہ اب اسے شکایت کرے گی۔“

”تو کون سا پہلی بار کرے گی؟ اس کی تو عادت ہی ایسی  
ہے۔ اوسے ابابو بھی ہمیشہ اسی کی ہی سائیز لیتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ ابابو سونیا سے بہت پیار ہے۔“ ساجدہ کے  
انداز میں لڑکھی سی بات آئی تھی۔

نعمان اسے لڈریس کے مطابق فائزہ کے گھر چھوڑ  
کر یہ کہہ کر اپنے کسی دوست کے پاس چلا گیا کہ وہ  
ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اسے لینے کے لیے آئے گا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے بھی۔ آج تو بڑے بڑے لوگ  
ہمارے گھر آئے ہیں۔“ فائزہ نے اسے دیکھتے ہی شوخی  
سے فقرہ اچھلا۔

”کیسی ہو؟“ اس سے گرم جوشی سے گلے ملتے  
ہوئے فائزہ نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے تم  
کیسی ہو؟“ فائزہ کے گھورنے پر جلدی سے اس نے  
آپ کو تم میں بدلا۔

وہ اسے لے کر اندر آگئی۔ وہ بائیں طرف مرے کا چھوٹا سا  
گھر تھا۔ لیکن بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔  
برآمدے میں پھولوں سے سج گئے رکھے ہوئے تھے۔  
کمروں میں دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز سجی  
ہوئی تھیں۔ ہر ایک چیز سے اس گھر کے کمینوں کی  
نفاست اور ذوق حسن کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے۔“ ساجدہ نے  
کمرے کی تزئین و آرائش کا بغور جائزہ لیا۔

”آخر گھر کا کس ہے۔“ فائزہ نے فخریہ کالر  
اکرائے۔

”ہوں واقعی۔ یہ بات توجہ ہے۔“ ساجدہ نے زور  
شور سے سر ہلایا۔

”گھر میں اور کون کون ہوتا ہے۔“ ساجدہ نے  
پوچھا۔

”بس میں اور میری امی۔“

”اور تمہارے ابو، تمہارے بہن، بھائی، وہ  
سب۔۔۔“

”میرے ابو کی بہت پہلے میرے بچپن میں ہی فوتہ  
ہو گئی تھی۔ بہن، بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔ میرے ابو کی  
فوتہ کے بعد امی نے دوسری شادی نہیں کی۔ بس میں  
اور امی اکیلے رہتے ہیں۔“

”اوسے یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے۔“ ساجدہ  
افسردہ ہو گئی۔

”ہاں ہے تو۔۔۔ لیکن یہ زندگی ہے۔ اس میں بہت  
کچھ سنا اور برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اپنی محرمیوں اور  
دکھوں کو بھلا کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا ہی پڑتا  
ہے۔ ورنہ انسان وقت اور زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے  
رہ جاتا ہے۔“

”تمہیں اور تمہاری امی کو اکیلے رہتے ہوئے ڈر  
نہیں لگتا؟“

”نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ جب اوپر والا ہماری  
حفاظت کے لیے موجود ہے تو ہمیں ڈرنے کی کیا  
ضرورت ہے۔“

”لیکن پھر بھی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“ ساجدہ  
بات ادھوری چھوڑ کر فائزہ کو دیکھنے لگی جو اس کی طرف  
دیکھ کر سننا شروع ہو گئی تھی۔

”اویار! تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے یا میری امی  
کو بالکل بھی ڈر نہیں لگتا، بلکہ سچ بتاؤں۔“ وہ اپنی  
ہنسی روک کر اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو  
پوچھنے لگی۔ ”اٹنا لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ پتا ہے  
جب میں باہر جاؤں تو مجھے دیکھ کر لڑکے پیچھے ہٹ  
جاتے ہیں اور آپس میں کہتے ہیں۔ اوئے ہٹ جاؤ،  
فائزہ آ رہی ہے۔ میں بلیک ہیٹ ہو لڈر ہوں۔ جوڈو  
کرائے کی ماہر۔“

تب ہی کمرے میں ایک گرلیں فل سی خاتون  
داخل ہوئیں۔

”ارے فائزہ! تم۔۔۔ باہر گٹ کھلا چھوڑ کر اندر آ کر  
بیٹھ گئی ہو۔ بڑی لاپرواہی جا رہی ہو۔“ بات کرتے



کرتے ان کی نظر ساجدہ پر پڑی۔ انہوں نے استفہامیہ نظروں سے فائزہ کی طرف دیکھا۔

”ہی! یہ ساجدہ ہے، میری دوست۔ میں نے آپ کو بتایا تھا اس کے بارے میں اور ساجدہ! یہ میری امی ہیں۔“

”السلام علیکم! ساجدہ نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔  
”وعلیکم السلام! جتنی رہو۔ خوش رہو بیٹا۔“ انہوں نے پیار سے اس کی پیشانی چومی۔ ساجدہ نے حیرت سے دیکھا۔ اس کی پیشانی تو کبھی اس کی اماں نے نہیں چومی تھی۔ تو پھر۔

”تم لوگ باتیں کرو۔ میں تم لوگوں کے لیے چائے بنا کر لائی ہوں۔“ رسمی حال احوال پوچھنے کے بعد فائزہ کی اماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اور امی! چائے کے ساتھ بسکٹ، سموسے اور چکن روٹز بھی ہوں۔“ فائزہ نے ہانک لگائی۔

”ارے بابا! سب کچھ لاؤں گی۔ کیا مجھے نہیں پتا؟ آخر تو ساجدہ ہمارے گھر پہلی بار آئی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔

”تمہاری امی بہت اچھی ہیں فائزہ! آج تم بہت خوش قسمت ہو۔“ ساجدہ نے رشک سے کہا۔

”ہاں۔ وہ تو ہیں ہوں۔“ فائزہ کھل کر مسکرائی۔  
”تم سناؤ، تمہارے گھر والے کیسے ہیں اور وہ تمہاری مغرور بہن سونیا، ویسے بائی داوے اس دن میرے جانے کے بعد اس نے میرے بارے میں کیا کیا تبصرہ فرمایا تھا؟“

”وہ ایسے ہی فضول باتیں کرتی ہے۔ دراصل اماں کی بہت لاذلی ہے وہ۔ اس لیے شاید۔“ ساجدہ نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”خیر اب ایسا بھی کیا لاؤ پیار کہ انسان دوسروں کو اپنے سامنے بالکل ہی حقیر سمجھنے لگے۔ تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو اب تک وہ سیدھی ہو چکی ہوتی۔“

”ہاں۔ وہ تو میں جان چکی ہوں۔“ ساجدہ مسکرائی۔  
”ویسے ساجدہ! تم نے ابھی تک اپنی کوئی فکیشن کے بارے میں نہیں بتایا؟“ فائزہ کے سوال پر ساجدہ

نے اچھے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔  
”میرا مطلب ہے تعلیم، تمہاری تعلیم کتنی ہے؟“ فائزہ نے وضاحت کی۔

”میں نے نويس کلاس میں پڑھائی چھوڑ دی تھی۔“  
”مگر کیوں ساجدہ! جانتی ہو تم نے کتنا غلط کیا؟“

ساجدہ سر جھکا کر بیٹھ گئی پھر آہستہ سے بولی۔  
”میں نے تو اور بھی بہت کچھ غلط کیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے اس دنیا میں آکر بھی بہت بڑی غلطی کی ہے۔“

”فضول باتیں مت کرو ساجدہ! خیر تم یہ بتاؤ، تم نے پڑھائی کیوں چھوڑ دی تھی؟ کیا تمہیں شوق نہیں تھا پڑھنے کا؟“

”مجھے بہت شوق تھا پڑھنے کا۔ لیکن یہاں بھی میری بد صورتی آڑے آئی۔ وہاں اسکول میں بھی کسی لڑکی نے مجھ سے دوستی نہیں کی۔ پھر کاروبار بھی ایسا ہی تھا۔ آٹھویں میں نے جیسے تیسے پاس کی لیکن نویں کلاس میں جو پچتر آئیں ان کا رویہ تو میرے ساتھ بہت اہانت آمیز تھا اور میرے اسکول چھوڑنے کا اصل سبب بھی شاید وہی تھیں۔“

”وہ کیسے؟“

”میں شاید بد صورت لوگ پسند نہیں تھے اور میں تو شاید انہیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی کلاس میں بھی مجھے بمشکل برداشت کر رہی ہیں۔ ان کے اسی رویے کی وجہ سے میں پڑھائی میں بالکل صفر ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر سے جو سبق یاد کر کے جاتی تھی وہ ان کے سامنے بالکل ہی بھول جاتا تھا۔“ ساجدہ گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر کے پھر سے اواس ہو گئی۔

فائزہ نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔ ”ان ہی پچترز نے اس شعبے کا تقدس باطل کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن تمہارے گھر والوں نے تمہیں اس موقع پر سپورٹ نہیں کیا؟“

”سپورٹ۔“ وہ تکی سے ہنسی۔ ”بلکہ وہ تو میرے اسکول چھوڑنے پر خوش ہوئے۔ اب اس بات پر کہ اب

انہیں میری پڑھائی پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا اور اماں اس بات پر کہ اب میں گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گی۔“

”ہوں۔ میں اندازہ کر سکتی ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بہر حال میرا تمہیں مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی پڑھائی دوبارہ سے شروع کرو۔ صرف یہی ایک چیز ہے جس سے تم اس دنیا میں اپنے آپ کو منوا سکتی ہو۔“

”یہ اب کیسے ممکن ہے؟“ ساجدہ نے اچھبے سے اسے دیکھا۔ ”تین سال ہو چکے ہیں مجھے پڑھائی چھوڑے ہوئے، اور اب میں اس عمر میں پڑھتے ہوئے اچھی لگوں گی۔“

”پڑھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ انسان اپنی ساری زندگی کچھ نہ کچھ پڑھتا اور کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ تمہیں پتا ہے امریکا میں ایک ستر سالہ خاتون نے کالج میں داخلہ لیا ہے پڑھنے کے لیے کیونکہ جوانی میں وہ کسی وجہ سے اپنی اسٹڈیز مکمل نہیں کر سکی تھی۔“

”ستر سال کی عمر میں؟“ ساجدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ستر سال کی عمر میں جب وہ ستر سال کی عمر میں اپنی اسٹڈیز دوبارہ سے شروع کر سکتی ہے تو تم بایں تیس سال کی عمر میں کیوں نہیں۔ گھر والوں کا رویہ تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔ کیا اسی طرح ساری زندگی دوسروں کی جھڑکیاں کھاتی اور دوسروں کے کام کرتی رہو گی۔“

”لیکن پڑھنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ کیا پڑھنے سے میری بد صورتی خوب صورتی میں بدل جائے گی؟ میرے گھر والوں کا رویہ مجھ سے بدل جائے گا یا دنیا والے میری بد صورتی کا مذاق اڑانا بند کر دیں گے؟“ ساجدہ نے بحث کی۔

”پڑھنے سے تمہیں اتنا فائدہ ہوگا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ پڑھنے سے تمہیں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوگا۔ تمہیں خود پر اعتماد پیدا ہوگا۔ منفی سوچوں سے چھٹکارا ملے گا اور سب سے بڑھ کر زندگی گزارنے کا مقصد مل جائے گا۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے فائزہ! لیکن۔“ ساجدہ کہتے

کے تے رک گئی۔  
”کیا لیکن؟“

”یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ گھر والے نہیں مانیں گے اور پھر اتنے عرصے کے بعد دوبارہ سے پڑھائی شروع کرنا۔ یہ بھی بہت مشکل ہے۔“

”کوئی مشکل نہیں ہے اگر انسان کسی کام کرنے کا سچا عزم کرے اور پوری لگن اور پورے حوصلے سے کر لے تو راہ کی مشکلیں اور رکاوٹیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ اما دیوی کو جانتی ہو؟“

فائزہ نے کہتے کہتے رک کر اس کی طرف دیکھا پھر ساجدہ کے نفی میں سر ہلایا۔ ”اما دیوی پر پولی“ اما دیوی برصغیر کی ایک بہت ہی معروف گلوکارہ اور اداکارہ تھیں۔ لیکن جانتی ہو، وہ بالکل بھی خوب صورت نہیں تھیں۔ وہ بہت بد صورت تھیں۔“

ساجدہ نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھا ”کیا واقعی؟“

”ہاں لیکن اسے اپنی بد صورتی پر کسی قسم کی شرمندگی اور احساس کمتری نہیں تھا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن وہ ان کی باتوں کو سیریس نہیں لیتی تھی اس کے ماں باپ مر گئے تھے اور وہ اپنے چچا کے ہاں رہتی تھی جو انتہائی غریب شخص تھا۔ اسے فلموں میں گانا گانے اور اداکاری کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے راہ میں آنے والی ہر مشکل کا ہمت اور بہادری سے مقابلہ کیا اور بالآخر وہ اپنے مقصد کو پانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور ٹن ٹن کے نام سے مشہور ہوئی۔“

”اوہ یہ تو واقعی بہت حیرت انگیز ہے۔“ ساجدہ نے حیرت سے کہا۔

”صرف اما دیوی ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں بھی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ مائیکل جیکسن کا نام تو تم بھی جانتی ہو گی۔ وہ امریکا کا ایک مشہور پاپ سٹار تھا لیکن وہ بھی بہت غریب اور سیاہ فام تھا۔ اسی طرح مشہور کامیڈین چارلی چپلن بھی بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اتنی شہرت



اور دولت حاصل کی صرف اور صرف اپنے عزم و حوصلے کی بدولت۔۔۔

بتاؤ ساجدہ! کیا ہوتی ہو؟“ فائزہ نے اسے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو فائزہ! میں اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کر دلی اور اس دنیا کو اور اس میں بسنے والے لوگوں کو یہ بتا دوں گی کہ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں۔“ ساجدہ نے ایک عزم سے کہا۔

”یہ ہوئی نابات۔“ فائزہ نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

”اب گلی ہونا میری سہیلی۔“

”ہی! اس نے ہانک لگائی۔“ یہ چائے بن رہی ہے پیائے۔“

”ابھی لا رہی ہوں بیٹا!“ انہی کی آواز آئی۔ فائزہ مسکرا کر ساجدہ کو دیکھنے لگی اور پھر وہ دونوں ساجدہ کی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کے بارے میں ضروری باتیں دسکس کرنے لگیں۔



گھر والوں نے اس کی پڑھائی دوبارہ شروع کرنے کی بات بہت حیرت سے سنی تھی۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں اس بات پر تبصرہ کیا تھا۔ سب لوگوں کے تبصرے حوصلہ شکن تھے سوائے نعمان کے، صرف وہی تھا جس نے اس کی ہمت بندھائی تھی اور اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ فائزہ چاہتی تھی کہ وہ ریگور تعلیم حاصل کرے تاکہ اس کے اندر اعتماد پیدا ہو۔

اس مقصد کے لیے پہلے اس نے اپنے اسکول میں بات کی تھی انہوں نے حسب توقع صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اتنی ایجنڈ لڑکی کو داخلہ نہیں دے سکتے۔ پھر اس نے ایک عام سے گورنمنٹ اسکول میں بات کی تھی۔ اس کی ہیڈ مسٹر بیس اس کی ای کی جاننے والی تھیں اس لیے انہوں نے کچھ تذبذب کے بعد داخلہ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

یہ ساری باتیں فائزہ نے نعمان کے سیل فون پر فون کر کے بتائی تھیں۔

ساجدہ! اسکول جانے کا سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

”فائزہ! کیا ضروری ہے کہ میں اسکول جاؤں۔ میں گھر پر رہ کر بھی تو پڑھ سکتی ہوں۔“

”ہاں۔“ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم ریگور تعلیم حاصل کرو۔ کچھ دیر کے لیے تو تم اس گھر سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لے سکو گی۔ پھر گھر میں تمہیں پڑھنے کو ن دے گا۔ گھر کا سارا کام تو تم ہی کرتی ہو اور کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔“

”لیکن فائزہ! اتنا عجیب لگے گا کہ اتنی ایجنڈ لڑکی اسکول جایا کرے گی۔ اور پھر لوگ کیا کہیں گے؟“

”کوئی عجیب نہیں لگتا۔ اس اسکول میں گئی ہوں میں۔ یہ سرکاری اسکول ہے۔ اس میں بڑی بڑی انج کی لڑکیاں بھی پڑھ رہی ہیں اور پتا ہے وظیفہ بھی ملتا ہے۔“

اسکول سے آنے کے بعد تم میرے پاس بیٹھو پڑھنے کے لیے آجانا۔ میں کور کروادوں گی۔“

”لیکن فائزہ! گھر والے میرے اسکول جانے اور پھر وہاں سے واپسی پر تمہارے گھر بیٹھنے پر بالکل راضی نہیں ہوں گے۔“

”یہ تمہارے گھر والوں کا نہیں، تمہاری زندگی کا معاملہ ہے تمہیں اس بات پر اسٹینڈ لینا ہی پڑے گا ورنہ ساری زندگی اسی طرح دوسروں کی جھڑکیاں اور طعنے سہتی رہو گی۔“ فائزہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ ساجدہ خالی اسکرین کو سختی رہ گئی۔

”آپ کی دوست بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا! نعمان جو اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ فون بند ہونے کے بعد بولا۔“ آپ کو اسٹینڈ لینا ہی ہو گا۔ اور میں اس معاملے میں آپ کا پورا ساتھ دوں گا۔“

ساجدہ نے تشکر سے اسے دیکھا۔ ”تم میرے بہت اچھے بھائی ہو۔“

گھر والوں نے حسب توقع وہی رد عمل ظاہر کیا تھا۔ جیسا اس نے سوچا تھا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ اب اس عمر میں تم اسکول جاؤ گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ ماں نے غصے سے کہا

”لوگ، ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں ماں! مجھے ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔“ ساجدہ نے سکون سے کہا۔ ”آپ اپنی بات کریں۔“

”مگر گھر والے ساتھ ہوں تو کسی کی جرات نہیں ہوتی بات کرنے کی اور پھر ساجدہ آپ کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہیں۔ پڑھائی دوبارہ شروع کر رہی ہیں۔“ آپ کی بار نعمان نے کہا تھا۔

”چھ! تو تم اس کے وکیل بن کر آئے ہو۔“ ماں نے کچھ طنزیہ انداز میں کہا۔

”حالانکہ بیٹا تو آپ کو چاہیے تھا۔ آپ ان کی ماں ہیں۔ ہم سب بھی تو جانتے ہیں پڑھنے، سونیا بھی تو جانتی ہے کانج۔“

”میرا نام بیچ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سونیا جوان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ نعمان کی بات کاٹتے ہوئے بولی ”میں کانج جانتی ہوں اسکول نہیں۔ اور میں نے ساجدہ کی طرح بیچ میں پڑھائی نہیں چھوڑ دی تھی۔“

”مجھے پتا ہے یہ بی بی کس نے پڑھائی ہے۔ جب سے یہ اس گھر کی فائزہ کے گھر سے آئی ہے تب ہی سے اس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔“ سونیا نے گل افشانی کی۔

”دیکھو سونیا! تم مجھے جو کچھ کہہ لیتی ہو میں برداشت کر لیتی ہوں لیکن فائزہ کے خلاف میں ایک لفظ بھی برداشت نہیں کروں گی۔ سمجھیں تم!“

ساجدہ کے سخت اور دو ٹوک انداز پر جہاں سونیا ہکا بکا رہ گئی وہیں ماں بھی جی رانی سے اس کا منہ سختی رہ گئیں۔

”اور ماں! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری پڑھائی پر آپ کا کوئی خرچہ نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ لوگ وظیفہ بھی دیں گے۔ اور گھر کے کام بھی جہاں تک مجھ سے ہو سکا کروں گی۔ آپ اب اسے بات کر لیں۔ خرچہ نہ ہونے کا سن کر وہ شاید راضی ہو جائیں۔“

”بڑی زبان چلائی آگئی ہے تمہیں۔ کبھی ماں پر باتیں کر رہی ہو کبھی باپ پر طنز۔ وہ دونوں اس لڑکی سے کیا

ملیں۔ تمہیں تو تمیز ملحوظ ادب سب کچھ بھول گیا ہے۔“

”ماں! پلیز آپ میری باتوں کا غلط مطلب مت لیں۔“ ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں نے آپ سے کبھی کسی بات کے لیے ضد نہیں کی۔ کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔ کیا آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں؟“

بی بی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور بولیں ”اچھا تم روؤ مت میں تمہارے ابا سے بات کروں گی۔“

”یا ہو۔“ نعمان نے زور سے نعرہ لگایا۔ ساجدہ مسکرانے لگی اور سونیا ”ہو نہ ہو“ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اور پھر بتا نہیں ماں نے ابا سے کیا بات کی اور کس طرح کی لیکن بہر حال اسے اسکول جانے کی اجازت ضرور مل گئی۔

فائزہ نے نہ صرف اس کا ایڈمیشن کروا دیا تھا بلکہ اس کے لیے کتابیں اور یونیفارم بھی اسی نے لا کر دیے تھے۔ اور آج اس کا اسکول میں پہلا دن تھا۔

اسکول۔ جس سے اس کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں اور جسے چھوڑے ہوئے اسے چھ سات سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت گھبراہٹ کا شکار تھی۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اس لیے فائزہ اسے لے کر جاری بھی اور ساجدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دوبارہ سے وہی چھوٹی بی بی بن گئی ہو جو اسکول جاتے ہوئے بے حد گھبراتی تھی۔ کیونکہ اس اسکول میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔

”کچھ آتا جاتا نہیں ہے اسے ایسی تالائق ہند ذہن اور بد صورت لڑکی میں نے پہلی بار دیکھی ہے اور ڈھیٹ اتنی ہے کہ روز مار کھاتی ہے لیکن بھال ہے جو اتنی مار کا کبھی اس پر کوئی اثر ہوا ہو۔“ اس کی کلاس ٹیچر مس روینہ کہہ رہی تھیں اس نے بے اختیار اپنے



ملیں۔ تمہیں تو تمیز ملحوظ ادب سب کچھ بھول گیا ہے۔“

”ماں! پلیز آپ میری باتوں کا غلط مطلب مت لیں۔“ ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں نے آپ سے کبھی کسی بات کے لیے ضد نہیں کی۔ کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔ کیا آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں؟“

بی بی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور بولیں ”اچھا تم روؤ مت میں تمہارے ابا سے بات کروں گی۔“

”یا ہو۔“ نعمان نے زور سے نعرہ لگایا۔ ساجدہ مسکرانے لگی اور سونیا ”ہو نہ ہو“ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اور پھر بتا نہیں ماں نے ابا سے کیا بات کی اور کس طرح کی لیکن بہر حال اسے اسکول جانے کی اجازت ضرور مل گئی۔

فائزہ نے نہ صرف اس کا ایڈمیشن کروا دیا تھا بلکہ اس کے لیے کتابیں اور یونیفارم بھی اسی نے لا کر دیے تھے۔ اور آج اس کا اسکول میں پہلا دن تھا۔

اسکول۔ جس سے اس کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں اور جسے چھوڑے ہوئے اسے چھ سات سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت گھبراہٹ کا شکار تھی۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اس لیے فائزہ اسے لے کر جاری بھی اور ساجدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دوبارہ سے وہی چھوٹی بی بی بن گئی ہو جو اسکول جاتے ہوئے بے حد گھبراتی تھی۔ کیونکہ اس اسکول میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔

”کچھ آتا جاتا نہیں ہے اسے ایسی تالائق ہند ذہن اور بد صورت لڑکی میں نے پہلی بار دیکھی ہے اور ڈھیٹ اتنی ہے کہ روز مار کھاتی ہے لیکن بھال ہے جو اتنی مار کا کبھی اس پر کوئی اثر ہوا ہو۔“ اس کی کلاس ٹیچر مس روینہ کہہ رہی تھیں اس نے بے اختیار اپنے

ملیں۔ تمہیں تو تمیز ملحوظ ادب سب کچھ بھول گیا ہے۔“

”ماں! پلیز آپ میری باتوں کا غلط مطلب مت لیں۔“ ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں نے آپ سے کبھی کسی بات کے لیے ضد نہیں کی۔ کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔ کیا آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں؟“

بی بی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور بولیں ”اچھا تم روؤ مت میں تمہارے ابا سے بات کروں گی۔“

”یا ہو۔“ نعمان نے زور سے نعرہ لگایا۔ ساجدہ مسکرانے لگی اور سونیا ”ہو نہ ہو“ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اور پھر بتا نہیں ماں نے ابا سے کیا بات کی اور کس طرح کی لیکن بہر حال اسے اسکول جانے کی اجازت ضرور مل گئی۔

فائزہ نے نہ صرف اس کا ایڈمیشن کروا دیا تھا بلکہ اس کے لیے کتابیں اور یونیفارم بھی اسی نے لا کر دیے تھے۔ اور آج اس کا اسکول میں پہلا دن تھا۔

اسکول۔ جس سے اس کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں اور جسے چھوڑے ہوئے اسے چھ سات سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت گھبراہٹ کا شکار تھی۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اس لیے فائزہ اسے لے کر جاری بھی اور ساجدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دوبارہ سے وہی چھوٹی بی بی بن گئی ہو جو اسکول جاتے ہوئے بے حد گھبراتی تھی۔ کیونکہ اس اسکول میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔

”کچھ آتا جاتا نہیں ہے اسے ایسی تالائق ہند ذہن اور بد صورت لڑکی میں نے پہلی بار دیکھی ہے اور ڈھیٹ اتنی ہے کہ روز مار کھاتی ہے لیکن بھال ہے جو اتنی مار کا کبھی اس پر کوئی اثر ہوا ہو۔“ اس کی کلاس ٹیچر مس روینہ کہہ رہی تھیں اس نے بے اختیار اپنے



پانڈول اور کندھوں کی جانب دیکھا جس پر مس کی مار کھا  
کھا کر نشانات پڑ چکے تھے لیکن مس پھر بھی کہہ رہی  
تھیں کہ اس پر مار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔  
”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ مس راشدہ نے ان  
کی تائید کی۔ ”آپ اس کے پیرٹس سے بات کیوں  
نہیں کرتیں؟“

”آپ کی بیٹی بہت کمزور ہے انتہائی نالاں ہے، کچھ  
آتا جاتا نہیں ہے اسے۔“ کنگل مظفر میں مس روینہ  
امان سے کہہ رہی تھیں جو ان کی فرمائش پر اسکول آئی  
تھیں۔

”چھا مگر گھر میں تو یہ سارا وقت بڑھتی رہتی  
ہے۔“ امان نے حیرت سے ساجدہ کی طرف  
دیکھا۔ امان ٹھیک کہہ رہی تھیں لیکن مس کے  
سامنے نہ جانے کیوں سبق اٹلے اور بھولے لگ جاتا  
تھا۔

”خاک پڑھتی ہے۔“ انہوں نے دانت  
میسے۔ ”بہر حال میرا آپ کو مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے  
گھر بٹھا کر گھر کا کام کاج سکھائیں۔ یہ پڑھنا تو بڑھتا اس  
کے بس کا لوگ نہیں ہے۔“

اور امان کو ان کا مشورہ اتنا بھایا کہ انہوں نے گھر  
جاتے ہی اسے حکم دیا ”بس بہت بڑھ لیا تم نے۔ تمہارا  
پڑھنے والا داغ ہی نہیں ہے اب گھر بیٹھو اور گھر کے  
کام کاج سیکھو۔“

لوں اس کی پڑھائی کا خاتمہ ہو گیا۔  
”کیا سوچ رہی ہو؟“ فائزہ نے اسے سوچ میں گم  
دیکھ کر پوچھا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ پتا نہیں میں اسکول میں  
ایڈجسٹ کر بھی سکوں گی یا نہیں۔“ ساجدہ نے  
ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”کیوں۔ کیا مسئلہ ہے تمہیں ایڈجسٹ کرنے  
میں؟“

”ایک نہیں، کئی مسئلے ہیں۔ اتنے عرصے بعد دوبارہ  
پڑھائی شروع کرنا اپنے سے چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ  
پڑھنا اور سب سے بڑھ کر میری بد صورتی۔“

”پہلی بات تو یہ کہ ماحول انسان خود بناتا ہے۔  
دوسری بات یہ کہ اگر انسان میں کوئی ایک خالی ہو تو  
اس خالی کو دھوپا جاسکتا ہے اپنی وہ دوسری خویوں کو اجاگر  
کر کے۔“

”وہ کیسے؟“ ساجدہ نے حیرت سے پوچھا۔  
”جو لوگ تمہاری بد صورتی کا مذاق اڑاتے ہیں ان  
کے ساتھ نمٹنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ جو لوگ  
ایسا کریں تم ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ اور اینٹ کا  
جواب پتھر سے دو۔“

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم ان کی بد تمیزی کے  
باوجود ان سے پیار محبت سے پیش آؤ۔ یہاں تک کہ وہ  
تمہارے حسن سلوک سے متاثر ہو کر تمہارے گرویدہ  
ہو جائیں اور ان کے نزدیک تمہاری بد صورتی یا خوب  
صورتی کی کوئی اہمیت نہ رہے اب یہ تم پر ہے کہ تم ان  
میں سے کون سا طریقہ اپنائی ہو۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“  
”میرا مشورہ یہی ہے کہ تمہارے لیے بلکہ دنیا کے  
کسی بھی شخص کے لیے دوسرا طریقہ ہی مناسب ہے۔  
محبت سے پتھر کو بھی رام کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم اپنی  
کلاس فیلوز، اسکول فیلوز اور دوسرے لوگوں سے محبت  
سے پیش آؤ گی تو وہ بھی تمہارے گرویدہ ہو جائیں  
گے۔ اگر تم ان سے سختی سے پیش آؤ گی ان کی باتوں پر  
اور ری ایکٹ کرو گی تو تمہاری یہ خالی اور اجاگر ہوگی۔  
تمہاری زندگی میں تلخیاں مزید بڑھیں گی۔ اس لیے  
بہتر یہی ہے کہ خل اور بردباری سے کام لیتا۔ تم میری  
بات سمجھ رہی ہو نا؟“

فائزہ نے ساجدہ کی طرف تصدیق طلب نظروں  
سے دیکھا۔ ساجدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں۔ میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات۔“

”مگر میری ایک بات یاد رکھنا سب لوگ ایک  
جیسے نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ پیار محبت کی زبان نہیں  
سمجھتے۔ ایسے کم طرفوں پر اپنا احسان کبھی ضائع نہیں  
کرنا۔ ازات کیئر؟“

ساجدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسکول کا گیٹ آگیا

تھا وہ دونوں گیٹ کر اس کرنے لگیں۔ ساجدہ نے اپنا  
دایاں پاؤں اندر رکھا اور بسم اللہ کہہ کر اندر چلی گئی۔  
اسے بڑھتا تھا اور بہت آگے جاتا تھا آخر اس دنیا میں  
اس کے آنے کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد تھا۔

☆ ☆ ☆  
اچھی دوست اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ اسے  
اب بتا چکا تھا۔ تعلیم کی انسان کی زندگی میں کتنی اہمیت  
ہے اس کا صحیح معنوں میں اندازہ اسے اب ہوا تھا۔

شروع شروع میں اسے اسکول میں ایڈجسٹ  
کرنے میں بہت دشواری پیش آئی تھی۔ اسکول میں  
پڑھنے والی لڑکیوں کا انداز اس کے ساتھ تسخیرانہ تھا۔  
بچپڑ اسے عجیب نظروں سے دیکھتی تھیں۔ گھر والوں  
کے ساتھ ساتھ مکے والوں نے بھی اس کے دوبارہ  
اسکول ”جو اُن“ کرنے کی خبر کو بڑی مشکل سے ہضم  
کیا تھا۔ لیکن فائزہ کا بتایا ہوا دوسرا طریقہ بہت فائدہ  
مند ثابت ہوا تھا۔

اس کا حسن سلوک محبت، زوداداری اور مستقل  
مزاجی آخر رنگ لائی تھی اور صرف چار پانچ ماہ میں ہی  
سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب اسکول میں لڑکیاں اسے  
ساجدہ کے بجائے ساجدہ باجی کہتی تھیں۔

بچپڑ اب اسے عجیب نہیں بلکہ مشفقانہ نظروں  
سے دیکھتی تھیں کیونکہ وہ ان کی سب سے زیادہ  
تاجدار اور مودب اسٹوڈنٹ تھی۔

اور جہاں تک گھر والوں کی بات تھی انہوں نے بھی  
جیسے جیسے سمجھو تا کر ہی لیا تھا۔ سب سے زیادہ

تکلیف اس کے اسکول جانے سے سونیا کو ہوئی تھی  
کیونکہ پہلے گھر کا کام کلی طور پر ساجدہ ہی کرتی تھی۔

اب اسکول جانے اور پھر وہاں سے فائزہ کے گھر ٹیوشن  
پڑھنے جانے کی وجہ سے سونیا کو بھی گھر کے کاموں میں

ٹھوڑا بہت حصہ لینا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا  
ساجدہ کے ساتھ رویہ اور بھی اہمیت آمیز ہو گیا تھا اکثر وہ  
گھر والوں کے سامنے اس بات کا ردنا دیتی رہتی تھی کہ

ساجدہ کے اس عمر میں اسکول جانے کی وجہ سے اسے

اپنی دوستوں اور مکے والوں کے سامنے کتنی شرمندگی کا  
سامنا کرنا پڑتا ہے۔

”ماں! آپ ساجدہ کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں،  
کیوں اسکول جاکر ہمارا اور اپنا مذاق بنوا رہی ہے۔“

لوگ ہنستے ہیں یا نہیں کرتے ہیں اس پر۔ آپ کو پتا ہے  
وہ جو میری دوست راجہ ہے وہ کہہ رہی تھی کہ اس عمر  
میں ساجدہ کو شادی کر کے خود اپنے بچے سنبھالنے  
چاہیے تھے لیکن وہ تو خود کی بن گئی ہے۔

”تو خود ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن کوئی رشتہ بھی  
آئے تب تک پڑھائی کرتی رہے۔“ امان نے کندھے  
اچکائے۔

”پڑھائی تو وہ گھر میں بھی کر سکتی ہے۔ اسکول جانا  
ضروری تو نہیں۔ آپ اسے اسکول جانے سے منع  
نہیں کر سکتیں؟“ سونیا نے تب کر کہا۔ وہ اور امان صحن  
میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں جبکہ ساجدہ اندر کمرے  
میں ہوم ورک کرتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی  
تھی۔

”کیسے منع کروں۔ وہ بھی میری بیٹی ہے۔ البتہ اگر  
اس دوران اس کا کوئی اچھا رشتہ آگیا تو پھر میں اس کی  
شادی کروں گی۔ پھر اس کی کوئی بات نہیں سنوں  
گی۔“

”چھا رشتہ اور ساجدہ کا؟“ سونیا نے استہزائیہ  
انداز اختیار کر لیا۔ ”میرا معجزہ کم از کم اکیسویں صدی میں تو  
ہوتا ہوا مجھے دکھائی نہیں دیتا اگلی صدی میں ہو جائے تو  
میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“ وہ اٹھ کر وہاں سے جانے  
لگی۔

”سونیا! تو جا کر برتن تو دھو دے پھر ساجدہ اٹھ کر  
رات کا کھانا بنا دے گی۔“ امان نے اسے آواز دی۔

”جب آپ کی پڑھا کو بیٹی پڑھنے سے فارغ ہو کر  
رات کا کھانا بنائے گی تو اسے کیسے گاہر بن بھی دھو لے  
کیونکہ میرا صبح ٹیسٹ ہے، مجھے اس کی تیاری کرنا  
ہے۔“ وہ پاؤں دھوئے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

”بہت بد تمیز ہو گئی ہے۔“ کسی کلام کو ہاتھ نہیں  
لگاتی۔ سب اس کے باپ کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔



نکمی کہیں گی۔“

اماں غصے سے بڑبڑا کر رہ گئیں اور ساجدہ ٹھنڈی سانس لے کر دیوار سے ہوم ورک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ نہ جانے سونیا اس سے اتنی خاریوں کھائی تھی۔

\*\*\*

وہ پڑھائی میں دل و جان سے مصروف تھی اور جاتی آنکھوں سے سینے بننے لگی تھی۔ کچھ کر دکھانے کے آگے جانے کے

معاشرے میں ایک اعلا اور باوقار مقام پانے کے

اور اس کے لیے اسے بہت محنت کرنا تھی۔

وہ اب اتنا مصروف رہتی تھی کہ اسے صحیح معنوں میں سر کھانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ گھر کے کام زیادہ تر اب بھی وہی کرتی تھی۔ لیکن اس مصروفیت سے اسے ٹھکن نہیں ہوتی تھی۔

سب ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک دن ثریا آپا نے اگر پرسکون پانی میں پتھر پھینک کر پچھل جھادی۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ وہ جلدی جلدی دوسرے کا کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ تاکہ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے ٹیٹ کی تیاری کر سکے۔ وہ سالن بھون کر پانی ڈال کر کسی کام سے برآمدے میں آئی تو ثریا آپا پر جوش طریقے سے اماں کو تار رہی تھیں۔

”اماں! آپ ساجدہ کے رشتے کے لیے پریشان تھیں نا۔ تو بس اب آپ کی پریشانی ختم ہوئی۔ ساجدہ کے لیے رشتہ مل گیا ہے۔“

”ارے۔ کیا واقعی؟“ اماں نے خوش ہو کر پوچھا۔

”جی اماں بالکل۔“ ثریا آپا نے سر ہل کر تصدیق کی۔ ”وہ جو میری مند فمیدہ ہے نا۔ اس کے جینے محبوب حسین کو تو جاتی ہیں آپ۔“

”محبوب حسین۔“ اماں سوچ میں پڑ گئیں۔

”اچھا۔۔۔ وہ جس کی بیوی پچھلے سال فوت ہوئی ہے اور اس کے تین بچے بھی ہیں۔“

”جی اماں! وہی۔ انہوں نے میری مند فمیدہ کے ذریعے کھلوا دیے۔“

”تمہارا مطلب۔۔۔؟“

”جی اماں! وہ ساجدہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کل میری مند فمیدہ میرے پاس آئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں آپ سے پوچھ لوں اگر ہم لوگ راضی ہوں تو وہ باقاعدہ پیغام لے کر آئیں۔“

ساجدہ حیرت اور تاسف سے ثریا آپا کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ محبوب حسین سے واقف تھی۔ وہ پینتالیس پچاس سال کی عمر کا ایک کرخت صورت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہی سفاکی اور کینکی ٹپکتی تھی۔

ابھی پچھلے سال ہی اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہ اپنی بیوی پر بے دریغ تشدد کرتا تھا۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ اس بیوی کے مرنے کی وجہ بھی وہ تشدد تھا جو اس نے مرنے سے کچھ روز پہلے اس بے چاری پر کیا تھا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہتی ہیں۔

”تمہاری نند کو شرم نہیں آئی یہ سب کہتے ہوئے۔“ اس نے اماں کو کہتے ہوئے سنا۔ ”اس منحوس کے لیے کیا میری بیٹی ہی رہ گئی تھی۔ مجھے تو تمہاری عقل پر حیرانی ہو رہی ہے یہ رشتہ لے کر آئی ہو تم اپنی بہن کے لیے؟“

”کیوں؟ کیا ہوا ہے میری عقل کو۔“ ثریا آپا پر اماں گئیں۔ ”خود ہی تو کہتی تھیں کہ ساجدہ کا رشتہ نہیں مل رہا۔ ساجدہ کا رشتہ دھونڈ کر لاؤ۔ اب میں ایک رشتے کا بتا رہی ہوں تو آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے اس کا رشتہ نہیں مل رہا اور میں اس وجہ سے پریشان بھی ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکا دے دوں۔“ اماں اس وقت بات کرتے ہوئے لقمی باری لگ رہی تھیں۔

”اماں! آپ جذباتی ہو کر سوچ رہی ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور کریں۔ محبوب

حسین اتنا برا آدمی نہیں ہے۔ جتنا اسے لوگوں نے مشہور کر دیا ہے۔ اچھا خاصا پیسہ ہے اس کے پاس۔ ساجدہ اگر اس کے ساتھ پیار محبت سے رہے گی تو وہ بھی ساجدہ سے پیار محبت سے ہی پیش آئے گا۔ اور جہاں تک اس کے بچوں کی بات ہے تو وہ سب بڑے بڑے ہیں۔ ساجدہ کو تنگ نہیں کریں گے اور پھر یتیم بچوں کو پالنے کا تو ذمہ ہی بڑا ثواب ملتا ہے۔“ ساجدہ خاصی حیرانی سے ثریا آپا کو محبوب حسین کی وکالت کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”جن لوگوں کی فطرت ہی خراب ہو وہ کبھی نہیں سدھرتے چاہے کوئی کتنا ہی ان کے ساتھ اچھا رہے۔“

”اچھا آپ ابا سے تو ایک مرتبہ بات کر لیں۔ اتنی جلد بازی سے کلامت لیں۔ کچھ دن غور کر لیں پھر جواب دے دیجئے گا۔“ بات کرتے کرتے ان کی نظر ساجدہ پر پڑی تو وہ کہتے کہتے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”تم یہاں کھڑی کھڑی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر کھانا بناؤ۔ ابھی بچے بھوک بھوک کا شور مچا رہے گے۔“

ساجدہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا اور پاؤں پٹختے ہوئے پن میں آ گئی۔

”ہو نہ ہو۔ بڑی آئیں رشتہ کرانے والی دیکھتی ہوں کیسے کروائی ہیں؟ وہ ناگواری سے سوچ رہی تھی۔

\*\*\*

”اچھا تو تمہاری ثریا آپا تمہارے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں اور وہ بھی ایک اجڑا اور وحشی انسان کا جو تین بچوں کا باپ ہے۔ خوب!“

فائزہ نے طنزیہ انداز میں ساجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ دونوں اس وقت مارکیٹ میں آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ فائزہ نے کچھ شاپنگ کرنی تھی اس لیے وہ ساجدہ کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

”لیکن اماں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ اماں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ایسے فضول اور ٹھٹھا شخص سے نہیں کریں گی۔“ ساجدہ نے خوش ہو کر بتایا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اپنا ارادہ بدل لیا تو پھر۔۔۔ پھر کیا کرو گی؟“ فائزہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔ کبھی بھی نہیں۔“ ساجدہ نے جھرجھری لی۔ ”اماں ایسا کبھی نہیں کریں گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا چلو اب سامنے والی بیکری سے کچھ کھانے کو لیتے ہیں میں تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں اور بھوک سے مرنے کے قریب ہوں۔“ فائزہ نے سامنے والی بیکری کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیکری شاپ میں گھس گئیں۔ فائزہ نے اس کے اور اپنے لیے ایک ایک بڑا اور ایک ایک سینڈویچ لیا۔ پھر وہیں مارکیٹ میں ہی کھانا شروع کر دیا۔

”ارے تم تو سب کے سامنے ہی کھانا شروع ہو گئی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ ساجدہ نے اسے ٹوکا۔

”کیا کہیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ لڑکی کو بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ تو تم بھی کھاؤ۔“

فائزہ نے کہا پھر اس کی ہونٹوں جیسی شکل دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”اب دیکھو نایا را! ہم جیسے لوگ یونی عام سی بیکری سے لے کر راستوں میں کھاتے ہیں۔ اب ہم ان جیسے بڑے ہوٹلوں میں جانا تو افورڈ نہیں کر سکتے نا؟“ فائزہ نے سامنے نئے شہر کے مشہور اور مہنگے ترین ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تب ہی ان کی نظروں کے سامنے ایک سیاہ مرسیڈز آ کر رکی۔ اس کی دونوں سائیڈوں کے دروازے کھلے اور ساتھ ہی ساجدہ کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک انتہائی اسمارٹ ماڈرن لڑکا برآمد ہوا جبکہ دوسری طرف سے زرد اور میوٹا انٹراج کا سوٹ پہنے اور آنکھوں پر گلاؤز



چڑھائے انتہائی مسائل سے چلتی وہ یقیناً سونیای تھی۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خراں خراں اسی ریٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔  
”یہ۔ یہ تمہاری بہن سونیای تھی نا؟“ فائزہ نے جی رانی سے اسے مخاطب کیا۔

”ہاں۔“ ساجدہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”یہ سونیای تھی۔“  
”لیکن وہ لڑکا کون تھا؟ اور سونیا اس کے ساتھ کیا کر رہی تھی؟“

”مجھے نہیں پتا۔ میں تو خود پہلی بار دیکھ رہی ہوں گھر سے تو سونیای یہ کہہ کر نکلی تھی کہ وہ اپنی دوست سے ملنے کے لیے جا رہی ہے۔ میرے سامنے اس نے اٹھ کھڑا تھا۔“ ساجدہ نے اٹھے ہوئے انداز میں کہا۔  
”چلو چھوڑو۔ گھر جا کر پوچھ لینا کہ کون ہے یہ سنی الٹال نہیں دیر ہو رہی ہے۔ گھر پہ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

فائزہ کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ لیکن اس کا دل بے بدستور سونیا اور اس لڑکے میں الجھا ہوا تھا۔

\*\*\*

گھر آکر بھی وہ سونیا اور اس لڑکے کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ جانے وہ لڑکا کون تھا۔ کس کسٹر کا مالک تھا اور جس طرح سونیا لڑکے کے ساتھ سرعام ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پکڑ رہی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اٹھنے سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مغرب کا وقت ہونے والا تھا اور سونیا ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھنے کے پاس دوسرے کمرے میں گئی۔ اور انہیں سب کچھ بتا دیا۔ اٹھ بھونچکا رہ گئیں۔

”کیا تم نے خود سونیا کو اس لڑکے کے ساتھ مریدیز سے اترتے اور ہوٹل میں جاتے ہوئے دیکھا ہے؟“  
”نہ صرف میں نے بلکہ فائزہ نے بھی دیکھا ہے۔ وہ بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھ رہی تھی۔“

”آئے دو اس سونیا منحوس کو۔ پوچھتی ہوں اس سے پچھلے کئی دنوں سے میں اس کے رنگ ڈھنگ بدلتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ روزانہ کلن سے دیر سے گھر سے آتا عسلیلوں کے گھروں کے چکر لگانا بن ٹھن کر گھر سے نکلتا اور قیمتی قیمتی گفت لاکریہ کہنا کہ یہ تو میری فلاں دوست نے دیا ہے اور وہ والا گفت میری اس دوست نے دیا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا“ اندری اندری چکر چل رہا ہے۔“

”اٹھ! جب آپ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں تو آپ کو اس سے اس بات پوچھنا چاہیے تھا۔“ ساجدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”پوچھنا تھا میں نے ایک دو دفعہ اس سے۔ لیکن وہ تو سستے سے ہی اکھڑ گئی۔ کہنے لگی۔ آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں۔ تم تو جانتی ہو۔ کتنی خود سر ہے وہ۔“  
وہ دونوں ابھی باتیں کر رہی تھیں کہ سونیا اندر داخل ہوئی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس اس نے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

”نہاں سے آ رہی ہو تم؟“ اٹھنے کے سخت لمحوں پر وہ حیرت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ بتایا تھا آپ کو کہ میں اپنی دوست سائہ سے ملنے جا رہی ہوں۔ پھر آپ مجھ سے اس انداز میں کیوں پوچھ رہی ہیں۔“  
”پچھا تو دوست تمہیں کار میں بٹھا کر کھانا کھلانے ہوٹل میں بھی لے گئی تھی؟“ اٹھنے نے طنز پر انداز میں پوچھا۔

سونیا کے چہرے کا رنگ واضح طور پر بدلا تھا۔ ”تک کیا مطلب؟“ وہ گڑبڑا کر بولی۔  
”سونیا! سوچو! وہ لڑکا کون ہے اور اس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟“  
”کون سا لڑکا؟ کس لڑکے کی بات کر رہی ہیں آپ؟“

”وہی جس کے ساتھ آج تم سیاہ مریدیز میں بیٹھ کر ہوٹل میں گئی تھیں۔ تاؤ۔“ اٹھنے نے غصے سے کہا۔  
سونیا کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل رہا تھا۔

”اٹھ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“  
”کیا اس بند کو۔“ اٹھنے نے دھاڑ کر کہا۔ ”ساجدہ نے خود تمہیں اس لڑکے کے ساتھ ہوٹل میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب مگر جاؤ کہ یہ جھوٹ ہے۔“

”چھا تو یہ ساری اٹھ اس کی لگائی ہوئی ہے۔“ وہ ساجدہ کو زہریلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔  
”آپ نے اس سے نہیں پوچھا کہ یہ وہاں کیا کر رہی تھی۔“

”اس سے جو پوچھنا تھا وہ میں نے پوچھ لیا ہے جو تم سے پوچھ رہی ہوں تم اس کا جواب دو۔“  
”پچھلیں اچھا ہوا۔ آپ کو پتا چل گیا۔“ اب اس کے چہرے پر سکون نظر آ رہا تھا۔ ”میں آپ کو خود اس کے بارے میں بتانے والی تھی۔ وہ نشان ہے۔ انتہائی دولت مند فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ اس کی ڈھٹائی پر اٹھنے کے منہ میں آگئی تھی۔

”تک سے چل رہا ہے یہ چکر؟“  
”جب سے بھی چل رہا ہو۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔  
”شرم نہیں آتی تمہیں یہ سب کرتے ہوئے۔“  
”کسی کو پسند کرنا اور اس سے شادی کا سوچنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔“ وہ جھجھکی بولی۔

”تمہارے تایا تائی کئی بار کہہ چکے ہیں۔ ناصر اچھا اور ذہین لڑکا ہے۔ اور جاب بھی اچھی ہے اس کی۔ میں تو صرف اس لیے چپ تھی کہ پہلے ساجدہ کا رشتہ تمہیں ہو جائے تب تمہاری بات چلاؤں۔ لیکن اگر تمہیں ہی جلدی پڑ گئی ہے تو ٹھیک ہے پہلے تمہاری شادی کر لی ڈے گی۔“

”مجھے کسی ناصر واصر سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے صرف نشان سے ہی شادی کرنا ہے۔“  
”آپ! وہ قطعیت سے کہتی ہوئی اٹھ گئی اور اپنا

پرس اٹھا کر دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ جاتے جاتے رکی اور ساجدہ سے مخاطب ہو کر زہر خند لیے میں بولی۔

”اور تم۔“ نہیں تو میں دیکھ لوں گی۔ بڑی اسما رٹ بننے کو شش کر رہی ہوتا تم ایسا پھنسو کی کہ ساری زندگی یاد رکھو گی۔“ وہ ساجدہ کو وارننگ دینے کے انداز میں کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ساجدہ خالی خالی نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

\*\*\*

”آپ سے سعادت بھائی نے سونیا اور ناصر کے رشتے کی کوئی بات کی ہے؟“ رات کو ابا کے گھر آنے اور کھانا وغیرہ کھا کر فاسٹ ہونے کے بعد اٹھنے نے ابا سے بہت سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”ہاں۔ بالکل۔ اشاروں اشاروں میں تو وہ کئی دفعہ مجھ سے کہہ چکے ہیں۔ بلکہ دو تین دن پہلے تو وہ واضح الفاظ میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ وہ سونیا کا رشتہ مانگنا چاہتے ہیں ناصر کے لیے۔“ ابا نے بتایا۔

”تو آپ ناصر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“  
”جی پوچھو تو میں جب بھی سونیا کے رشتے کے بارے میں سوچتا ہوں مجھے ناصر سے بہتر اور کوئی نہیں لگتا۔ اپنا خون ہے، شریف اور ایمان دار ہے۔ اچھی جاب کر رہا ہے۔ اگر تم کہو تو میں انہیں باقاعدہ رشتہ لانے کا کہہ دیتا ہوں۔“

”میں تو خود بخوبی چاہتی ہوں۔ لیکن آپ کی بیٹی کچھ اور چاہتی ہے۔“ اٹھنے کے طنز پر ابا نے چونک کر اٹھنے کی طرف دیکھا۔  
”کیا مطلب؟“

”مطلب تو آپ سونیا سے ہی پوچھیں۔ ہمیں تو وہ کسی کھانے میں ہی نہیں گنتی۔“  
”یہ تم کیا پیلیاں بجھا رہی ہو۔ صاف صاف بات کرو۔“

”صاف بات یہ ہے کہ وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“



ابا حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ”یہ تم سے سونیا نے کہا ہے؟“

”صرف یہی نہیں اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔“ ابا کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ سونیا صاحبہ کوئی زیادہ دور نہیں تھیں۔ دروازے سے ہی چپکی ان کی باتیں سن رہی تھیں اور اب بے قرار ہو کر آخر کار کمرے میں ہی انٹری دے دی تھیں۔

”آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ آپ ابا کو بدھا چڑھا کر بتا رہی ہیں۔“ سونیا نے ناک چڑھا کر کہا۔ ”تم یہاں کس لیے آئی ہو؟ تم سے کس نے کہا ہے کہ ہماری باتوں میں دخل دو۔“ ابا نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”آپ میرے رشتے کے بارے میں تو اب اسے تبادلہ خیال کر رہی ہیں۔ ساجدہ کے رشتے کے بارے میں نہیں کر سکتی۔“ سونیا نے مکاری سے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”ساجدہ کا رشتہ کیا مطلب؟“ ابا نے الجھ کر اسے دیکھا۔ ”کیوں ابا! آپ نے ابا کو نہیں بتایا کہ ثریا آپ ساجدہ کے لیے اپنی نند فہمیدہ کے جیٹھ کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔“

ابا نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔ وہ یہ بات ابا کو نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ثریا کو بھی یہ بات بتانے سے منع کیا تھا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ابا اس رشتے پر تنبیہ کی سے غور نہ کرنے لگ جائیں۔

”یہ کیا چکر ہے آخر؟“ صبح جب میں اس گھر سے گیا تھا اس وقت تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی؟“ ابا نے ابا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ تم دونوں آپس میں ہی الجھ رہی ہو۔ کبھی سونیا کے رشتے پر تو کبھی ساجدہ کے رشتے پر؟“

”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ اسی سے پوچھیں جو آپ کو سب باتوں کی خبر دے رہی ہے۔ اسے اتنی شرم نہیں ہے کہ لڑکیاں ایسے معاملات میں نہیں بولتیں۔“

”تم کچھ بتا رہی تھیں سونیا کے بارے میں؟“ ابا نے ابا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”پوچھیں اپنی لاڈلی سے۔“ آخر وہ کون نشان ہے جس کی محبت کا یہ دم بھر رہی ہے اور جس کے ساتھ یہ ہولٹوں میں گھومتی پھر رہی ہے۔ پوچھیں اس سے۔“ ابا نے غصے سے کہا۔

”سونیا! اب کی بار ابا کا لمحہ واقعی سخت تھا۔“ یہ کیا سن رہا ہوں میں؟ اگر میں نے تمہیں باہر آنے جانے اور اپنی دوستوں کے گھر جانے کی آزادی دے رکھی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔“

”ابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ سونیا کا انداز اب دھیمہ ہو گیا تھا۔ ”میں نے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ لیکن کسی سے محبت کرنا اور اس سے شادی کی خواہش کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔“

”تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے۔“ ابا کو اس کی بات سے واقعی شاگ پڑ گیا تھا۔ اس کے اس انداز پر جہاں چوٹھ سے لگی، ان کی باتیں سنتی ساجدہ حیران رہ گئی تھی وہیں ابا بھی بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”ناصر میں کیا برائی ہے؟ ہینڈ سم ہے، اتنا پردھا لکھا ہے، اچھی جاب ہے اور پھر سب سے بڑھ کر وہ دیکھا بھلا ہے۔“

”جتنی خوبیاں آپ نے ناصر میں گنوائی ہیں، اس سے کہیں زیادہ خوبیاں نشان میں ہیں اور جتنی دولت نشان کے پاس ہے۔“ اس کا انداز گھڑی ہو گیا۔ ”تمہی تو ناصر بھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ اس کی تو گاڑی کے پیٹروں کا خرچ بھی ناصر کی کل تنخواہ سے زیادہ ہے۔“

سونیا توں کی ایک بات یہ ہے کہ میں صرف نشان سے ہی شادی کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ ابا کا انداز شکست خوردہ تھا۔ ”تو پھر اس سے کہو کہ وہ ہمارے گھر رشتہ لے آئے۔“ ”جج ابا! وہ خوش ہو کر بولی۔“ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ آپ میری کوئی بات کبھی نہیں ٹال سکتے۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم اب جاؤ۔“ ابا نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھائی رہی پھر اچانک ابا نے پوچھا۔ ”یہ ساجدہ کے رشتے کا کیا چکر ہے؟ اور اگر اس کا کوئی رشتہ آیا ہے تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

ابا کی اس بات پر باہر کھڑی ساجدہ کا دل بڑی تیزی سے دھڑکا تھا۔ عین اسی لمحے سونیا نے فائن خانہ اور کچھ جتنا ہی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

\*\*\*

ساجدہ پریشان تھی۔ ابا نے ابا سے رشتے کے بارے میں سننے کے بعد ثریا یا کو بلا بھیجا تھا کہ وہ اس سلسلے میں انہیں تفصیلات سے آگاہ کر سکیں۔ وہ سارا دن اسکول میں بھی یہی سوچ کر پریشان ہوئی رہی کہ اب نہ جانے کیا ہو۔ کہیں ابا مان ہی نہ جائیں۔ وہ اسکول سے واپس گھر گئی تو ثریا آیا آئی ہوئی تھیں۔ غالباً ”ان کی ابا سے بات ہو گئی تھی کیونکہ وہ اسی سلسلے میں ابا سے ڈسکس کر رہی تھیں۔“

”ارے ابا! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ساجدہ کا کہیں رشتہ ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔“ ثریا پا دل سوزی سے ابا سے کہہ رہی تھیں۔

”ارے خاک دھول ایسے رشتے پر۔ ایسا شخص جس کے تین ہوتے بچے ہیں۔ اور جو اتنا ظالم اور سفاک ہے۔ میں کیسے اس سے اپنی بیٹی کی شادی کروں۔“

ساجدہ یونیفارم اتار کر کھانا گرم کرتے ہوئے تشویش سے ابا اور ثریا کی باتیں سن رہی تھی۔

”تو ابا! مجبوری ہے۔ کتنے عرصے سے آپ ساجدہ کے رشتے کے لیے کوششیں کر رہی ہیں لیکن آپ خود بتائیں کہ کہیں کوئی بات نی؟ اور محبوب حسین اتنا برا نہیں ہے ابا! وہ کہتے ہیں ناکہ بد اچھا بدنام برا۔ تو بس وہ بدنام ہو گیا ہے اور جہاں تک اس کا اپنی بیوی

کو ہارنے پینے والی بات ہے تو اس کی بیوی بھی کم نہیں تھی۔ فہمیدہ بتا رہی تھی کہ بہت زبان چلائی تھی اپنے میاں سے جب پتا ہو کہ بندہ آگے سے تھوڑا غصے والا ہے تو انسان کو احتیاط کرنی چاہیے۔ اتنی زبان نہیں چلائی چاہیے۔“

”اچھا۔ بس کرو اب اس کی تعریفیں۔“ ابا نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”وہمیں یہاں اتنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔“

”ابا نے بلایا تھا۔ میں کیسے انکار کرتی۔ اور آپ اتنی حیران نہ ہوں۔ ابھی ابا نے صرف رشتہ لانے کو ہی تو کہا ہے کون سا رشتہ قبول کر لیا ہے، ایک دفعہ آپ ان لوگوں سے ملیں۔ بات وغیرہ کر لیں پھر جو جواب آپ دیں آپ کی مرضی۔“

”جس گلی جانا نہیں، اس کے کوس گننے کا کیا فائدہ۔ تم بس ان لوگوں کو منع کر دینا۔“ ابا کے قطعیت پر ساجدہ نے ایک طویل اطمینان بھر اس اس لیا۔

”لیکن ابا! ابا ناراض ہوں گے۔ انہوں نے مجھے خودیلا کر کہا ہے۔“ ثریا اپنے منہ بنا کر کہا۔

”تم ان کی ناراضی کو چھوڑو۔ میں ان سے خود بات کر لوں گی۔ ویسے ہی آج کل ان کا دلغ سونیا کے مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔“

”کیوں؟ کیا ہوا ہے سونیا کو؟“ ثریا اپنے چونک کر پوچھا۔ ابا اسے سونیا کے ”مسئلے“ کے بارے میں اچھا کرنے لگیں۔

”وہ اچھا تو یہ بات ہے۔“ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔ ”ویسے ابا! اگر رشتہ اچھا ہے تو آپ لوگ ضد میں نہ آئیں۔ اس کی شادی وہیں کر دیں جہاں چاہتی ہے ورنہ آپ کو تو پتا ہے وہ ضد کی کتنی پی ہے۔“

”وہ جانے اور اس کا پاب جانے۔“ ابا نے سر جھٹکا۔ ”میری تو وہ ویسے بھی کوئی بات نہیں سنتی۔“

وہ دونوں اب سونیا کے مسئلے کے بارے میں ڈسکس کرنے لگی تھیں۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر آگئی۔

\*\*\*



”ابا! وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ تقریباً  
ڈیڑھ ہفتے کے بعد سونیا نے ابا سے جھجکتے ہوئے  
کہا تھا۔

”وہ کون؟“ ابا نے پوچھا۔

”ڈیڈن۔ ڈیڈن آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں  
انہوں نے آپ کو کے ایف سی میں بلایا ہے۔“ سونیا  
نے ایک مشہور ہوٹل کا نام لیا۔  
”لیکن میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے کہو کہ اپنے  
ماں باپ کو لے کر رشتہ لینے کے لیے آئے کیا تم نے  
اسے نہیں بتایا؟“

”وہ اسی سلسلے میں تو آپ سے ملنا چاہتے ہیں اس  
کے پیر میں نہیں ہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“  
سونیا ڈیڈن کے لیے بھی ”اس“ تو کبھی ”ان“ کا صیغہ  
استعمال کر رہی تھی۔

”اگر ماں باپ نہیں ہیں تو کوئی دوست بھی نہیں  
ہے کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے؟“ ابا نے چبھتے  
ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”اور وہ مجھ سے ہوٹل میں کیوں  
ملنا چاہتا ہے؟“

”وہ آپ سے رشتہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا  
ہے۔“

”ناغ ٹھیک ہے تمہارا؟“ ابا نے غصے سے اس کی  
بات کاٹ دی۔ ”کیا رشتوں کی باتیں ہوٹلوں میں طے  
کی جاتی ہیں۔ ہمارے گھر آنے میں اسے کوئی مسئلہ  
ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن آپ خود سوچیں ہمارا  
گھر کتنا معمولی اور چھوٹا سا ہے اور ہمارے محلے کا  
ماحول بھی کیسا فضول اور عامیانه سا ہے۔ جب یہاں  
کی بچی کی گلیوں سے اتنی بڑی مرسلین گزرتی ہوئی  
ہمارے گھر کے سامنے رکے گی تو یہاں کے  
چھوٹے لوگ کتنی باتیں بنائیں گے۔ آپ کو  
معلوم ہے نا؟“

ابا نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں جمعہ جمعہ  
آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ڈیڈن سے ملے ہوئے اور  
تمہیں یہ گھر یہ محلہ اور اس محلے میں بننے والے لوگ

سب برے لگنے شروع ہو گئے ہیں۔“  
”ابا! آپ میری بات کو غلط رنگ مت دیں۔“ سونیا  
نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”لیکن آپ یہ بتائیں کہ  
آپ کو اس سے ہوٹل میں ملنے سے کیا مسئلہ ہے۔ جو  
بات یہاں ہوگی وہ وہاں بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ہو سکتی ہے۔ لیکن رشتہ طے کرنے کے  
کچھ اصول ہیں۔ رشتے گھروں میں بڑے بزرگ آپس  
میں مل بیٹھ کر بات کر کے طے کرتے ہیں اسے کہو کہ  
اگر اس کے والدین نہیں ہیں تو کسی اور رشتہ دار کو  
رشتہ لینے کے لیے لے کر آئے میں اس سے ملوں  
گ۔ بات کر دوں گا۔ پھر اس کے بارے میں کوئی چھان  
بین کرواؤں گا معلومات کرواؤں گا۔ جب مجھے پوری  
طرح اطمینان ہو جائے گا تب ہی میں ہاں کر دوں گا۔  
ایسے ہی تو یہ سب نہیں ہو سکتا۔“

”ابا! آخر اس سب کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ سونیا  
نے منہ بنا کر کہا۔ ”ڈیڈن بہت اچھا ہے۔ میں اسے  
اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”تم جپ کر دو۔“ ابا نے اسے ٹوک دیا۔ ”تم ابھی  
بچی ہو۔ تمہیں ان باتوں کا نہیں پتا۔ آج کی دنیا میں  
لوگ اپنے منہ پر کئی نئی نقاب چڑھائے پھرتے ہیں۔  
باہر سے کچھ ہوتے ہیں اندر سے کچھ۔“

سونیا کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ان باتوں سے  
کوئی زیادہ متفق نہیں ہے۔ پھر وہ بادل غراستہ بولی۔  
”ابا! آپ بعد میں یہ سب کچھ کر لیجئے گا آپ فی الحال  
اس سے کل ہوٹل میں تول لیں اس نے کل کے لیے  
ٹیلر ریز رو کر والی ہے۔“

”کیا وہ ہمارے گھر نہیں آسکتا؟“ ابا نے ناراضی  
سے پوچھا۔

”آسکتا ہے۔ کیوں نہیں آسکتا۔ لیکن فی الحال تو  
آپ اس سے کل ہوٹل میں مل لیں۔ پلیز ابا! میری  
خاطر۔“ اب کی بار اس نے لجاجت سے کہا تھا اور ابا  
اس کے لہجے کے سامنے بس ہو کر رہ گئے۔



”تمہارا مطلب ہے تمہارے ابا ڈیڈن سے ملنے



خود ہوٹل گئے ہیں اور وہ بھی رشتہ کی بات کرنے؟“  
فائزہ نے حیرت سے ساجدہ کی طرف دیکھا۔ ساجدہ  
نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس وقت یوشن پڑھنے فائزہ  
کے گھر آئی ہوئی تھی۔  
”واؤ! اس کا مطلب ہے تمہارے ابا بڑے روشن  
خیال ہیں۔ ہے نا؟“

”وہ روشن خیال نہیں ہیں۔“ ساجدہ نے نفی میں  
سر ہلایا۔ ”بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ سونیا کی بات  
نہیں ٹال سکتے۔ سونیا نے انہیں مجبور کیا ہے کہ وہ  
ذیشان نامی اس لڑکے سے ہوٹل میں جا کر ملیں۔“  
”اور تم؟“ فائزہ نے پر خیال نظروں سے اس کی  
طرف دیکھا۔ ”تم اگر کسی چیز کے لیے ان سے ضد کرو  
تو کیا وہ تمہاری بات بھی مان لیں گے؟“



وہ گھر پہنچی تو ماحول خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ گھر کے  
سارے افراد برآمدے میں بیٹھے کسی اہم مسئلے پر گفتگو  
کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ثریا آیا بھی اپنے دونوں  
بچوں سمیت وہاں موجود تھیں۔ ماحول کچھ کشیدہ سا نظر  
آ رہا تھا۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو سب کی نظریں  
اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ سب کو اپنی طرف دیکھتا پار  
کچھ گڑبڑاسی گئی۔

”السلام علیکم! اس نے ممننا ہی ہوئی آواز میں  
سب کو سلام کیا۔ اس کے سلام کا جواب صرف اماں  
نے دیا باقی سب خاموش رہے۔  
”کہاں سے آ رہی ہو تم؟“ ابانے سخت انداز میں  
پوچھا۔

ساجدہ نے گہرا کر ابا کی طرف دیکھا وہ اچھی طرح  
جانتے تھے کہ وہ اس وقت فائزہ کے گھر سے یوشن پڑھ  
کر واپس آئی ہے تو پھر وہ کیوں پوچھ رہے تھے۔  
”کیا بہری ہوئی ہو؟ سنا نہیں تم نے کہ کہاں سے  
آ رہی ہو تم؟“ اب کی بار ابا چاڑھ کھانے والے انداز میں  
بولے۔

”ابا! وہ میں فائزہ کے گھر سے واپس آ رہی

ہوں۔ وہ اماں! کوسہ پتا ہے۔“ اس نے انک ایک  
کر کہتے ہوئے مدد طلب نظروں سے اماں کی طرف  
دیکھا۔

”تو کیا روز روز تمہارا اپنی سہیلی کے گھر جانا ضروری  
ہے۔ نا تم دیکھا ہے تم نے؟ جو ان لڑکیاں اتنی دیر گھر  
سے باہر رہتے ہوئے اچھی لگتی ہیں؟“

ساجدہ کی کانٹیں کانپنے لگیں۔ نجائے ابا اس سے  
بات کرتے ہوئے اتنے سرد اور سفاک کیوں ہو جاتے  
تھے۔

”بس بھی کریں سہراب کے ابا! اماں اس کی بدد کو  
آئیں۔ انہوں نے ساجدہ کی غم ہوتی آنکھیں دیکھ لی  
تھیں۔“ نغصہ کس کا ہے اور نکال کس غریب پر رہے  
ہیں۔“ انہوں نے ساجدہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ  
کاچنی ٹانگوں کے ساتھ برآمدے سے ملحقہ کمرے میں  
آگئی۔

”ہاں۔ پڑھ لکھ کر تو یہ پروفیسر بن جائے گی۔ ملک و  
قوم کا نام روشن کرے گی۔“ ابا کی طنزیہ آواز اسے  
کمرے میں بھی سنائی دی۔

”ابا! آپ چھوڑیں اس بات کو۔“ سہراب نے ان  
سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بات زیادہ اہم ہے جو ہم  
اس سے پہلے کر رہے تھے۔“

”کیا انہوں میں؟“ ابا کی آواز اب دھیمی ہو گئی تھی۔  
”مجھے اس لڑکے سے مل کر سخت مایوسی ہوئی ہے۔ وہ تو  
مجھ سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے مجھ پر کوئی احسان کر رہا  
ہو۔“

”آپ کو وہاں پر جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ سہراب  
کے چہرے پر تناؤ نظر آ رہا تھا۔ ”کیا ہمیں یہ زنب دیتا  
ہے کہ ہم لوگ ہوٹلوں میں جا کر رشتوں وغیرہ کی باتیں  
کریں اور مجھے تو حیرت اس بات پر ہے آپ لوگوں نے  
بالا ہی بالا اس بات کا فیصلہ کر لیا اور مجھے اس بات کی خبر  
ہی نہیں ہونے دی۔ اور اگر آج بھی اماں مجھے نہ  
بتاتیں تو مجھے تو اس بات کا پتا ہی نہ چلتا۔“ سہراب کے  
انداز میں شکوہ نظر آ رہا تھا۔

ساجدہ اس کی بات سن کر دروازے کی جھری سے

جھانک کر دیکھنے لگی۔ سونیا بھی وہیں موجود تھی۔ اس  
کے چہرے پر گمبیدگی نظر آ رہی تھی۔  
”میں تو خود اس بات کے حق میں نہیں تھی لیکن تم  
تو جانتے ہو تمہارے ابا اور سونیا جب کسی بات کا فیصلہ  
کر لیں تو پھر ان کو روکنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ اب  
کی بار اماں نے کچھ غصے سے کہا تھا۔

”اور سونیا! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“ اب کی  
بار سہراب نے سونیا سے مخاطب ہو کر ناگواری سے  
کہا۔ ”مگر میں نے پانوی نے کبھی تم سے روایتی  
بھائیوں جیسا سلوک نہیں کیا کبھی تم پر سختی یا روک  
ٹوک نہیں کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس قسم کی  
گھٹیا حرکتیں کرتی پھو۔“

”ایسا کیا کر رہا ہے میں نے کہ آپ اسے گھٹیا  
حرکتوں میں شام کرنے لگے ہیں۔“ سونیا بجائے کسی  
شرمندگی کا اظہار کرنے کے دوبارہ جواب دینے پر اتر  
آئی۔

”تو اور کیا کرنا چاہتی ہو تم؟“ وہ تلخی سے بولا۔ ”کیا  
کوئی سرورہ گئی ہے۔“

”سہراب! ابکو اس بند کر دیا۔“ اب کی بار ابا غصے  
سے چلا اٹھے۔ ”یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو تم۔ کیا  
تم بھول گئے ہو کہ تم اس وقت کسی اور سے نہیں اپنی  
ہمن سے بات کر رہے ہو۔“

”ہمن کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بڑے بھائی سے تمیز  
سے بات کرے۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”دیکھو سونیا! اب کی بار ابا سونیا سے مخاطب  
ہوئے۔“ میں صرف تمہاری خوشی کی خاطر اس لڑکے  
سے ملنے چلا گیا تھا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک  
انتہائی مغرور اور بد تمیز لڑکا ہے۔ اسے تو بڑوں سے بات  
کرنے کے آداب تک معلوم نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے  
یوں بات کر رہا تھا جیسے میں تمہارا ابا نہیں کوئی تھرڈ  
کلاس پولیس آفیسر ہوں۔ جس کے سوالات کے  
جواب دینا اس کے لیے انتہائی ناگواری کا باعث ہوں  
اور میں نے اپنی امارت کے بل بوتے پر چپ کرنا چاہتا  
ہو۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔“  
سونیا نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب ذیشان اس بارے  
میں کیا کہتا ہے۔ یہ بھی تو معلوم کرنا پڑے گا۔“  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ سہراب اس کی بات سن  
کر بھڑک اٹھا۔ ”تمہیں ابا کی بات کا اعتبار نہیں ہے۔  
تمہارے خیال میں ابا جھوٹے ہیں۔“

”میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ منہ ہٹا کر  
بولی۔ ”میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ  
ابا کو جو محسوس ہوا ہے اصل میں ایسا نہ ہو۔ ہو سکتا  
ہے اس دن وہ کچھ تھکا ہوا ہو یا کسی بات پر اس کا موڈ  
آف ہو۔ شاید اسی لیے وہ کچھ ایسا ہی ایکٹ کر گیا ہو۔  
پھر ایک ملاقات سے کسی شخص کے اچھے یا برے  
ہونے کے بارے میں اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی  
شخص کو مکمل جاننے کے لیے کم از کم تین چار ملاقاتیں  
تو ہونی چاہئیں۔“

”یعنی ایک بار کی بے عزتی پر تیری تشفی نہیں ہوئی۔  
تو چاہتی ہے کہ تیرا باپ تین چار بار بے عزت  
ہو۔“ اماں نے اسے غصے سے لتاڑا۔

”سونیا! میں کوئی بچہ نہیں ہوں جسے تم ادھر ادھر کی  
باتیں کر کے ہمارا ہی ہو۔“ اب کی بار ابا کالجہ تیز تھا۔  
”اک دنیا دیکھی ہے میں نے اور اسے دیکھتے ہی میں  
سمجھ گیا ہوں کہ وہ شخص قابل اعتبار نہیں ہے۔  
تمہاری خاطر اگر میں اپنی بے عزتی نظر انداز کر بھی  
دوں تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں انہیں میں کیسے  
نظر انداز کروں۔ اس لڑکے کا نہ تو کوئی رشتہ دار ہے  
اور نہ کوئی ایسا خاص دوست ہے جو اس کی تقدیر  
کر سکے اور نہ ہی وہ خود تانے کو تیار ہے۔ اس شرمش  
وہ بالکل نیا ہے پہلے کس شہر میں تھا۔ وہ کیا کرتا تھا اس  
بارے میں نہ تو وہ خود بتانے کو تیار ہے اور نہ ہمیں  
معلوم ہے۔ ایسے مشکوک شخص کو میں اپنی بیٹی کا ہاتھ  
کیسے تھما سکتا ہوں۔“

”ابا! یہ سب آپ کے واپس ہیں۔ بے بنیاد اندیشے  
ہیں۔ آپ جانب دار ہو کر سوچ رہے ہیں کیونکہ ذیشان  
کے مقابل آپ کے بھائی کا بیٹا ہے۔ اسی خواہش کو



پورا کرنے کے لیے آپ جواز تلاش کر رہے ہیں۔  
دلیلیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں صرف ذیشان سے شادی  
کروں گی صرف ذیشان سے۔“  
محبت واقعی اندھی ہوتی ہے یہ اندازہ سونیا کو دیکھ کر  
بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دماغ کو طاق میں رکھ صرف  
اپنے دل سے سوچ رہی تھی۔  
”کیواس بند کرو اپنی۔“ سراب غصے سے چلا کر  
بولی۔

”تم اتنی بے حیا ہو گئی ہو کہ باپ اور بھائیوں کے  
سامنے جو منہ میں آ رہا ہے بولے چلی جا رہی ہو۔ ایک  
بات یاد رکھو تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں ہم لوگ  
چاہیں گے۔ سمجھیں تم! وہ قطعیت سے کہتا وہاں  
سے اٹھ کر چلا گیا۔  
سونیا نے فریادی نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔  
”دیکھا ابا! آپ نے۔ سراب بھائی مجھ سے کس انداز  
میں بات کر رہے تھے۔“

”تو اور کیسے کرتا۔ تمہارے اس کارنامے پر تمہیں  
شائبہ دیتا۔“ اب کی بار اماں نے اسے لتاڑا۔  
”سونیا! کچھ ہوش کے ناخن لو۔ ہم تمہارے اپنے  
ہیں۔ ہم تمہارے بارے میں برا کیسے سوچ سکتے  
ہیں۔“ ثریا اپنے رسانیت سے کہا۔ سونیا نے جواب  
میں کچھ نہیں کہا اور برا سامنہ بنا کر بیٹھ گئی۔  
”ارے یاد آیا۔ ثریا! ابا نے اچانک چونک کر ثریا  
آپا کی طرف دیکھا۔ ”تم نے محبوب حسین کے گھر  
والوں کو رشتہ لانے کو کہا تھا؟ کوئی آیا نہیں پھر ان کے  
گھر والوں میں سے۔“

”وہ دراصل۔۔۔ ابا۔۔۔“ ثریا آتے گھر اکراماں  
کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اماں کے کہنے پر۔  
اپنی منہ فہمہ کو انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب ان کی  
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابا کو یہ بات کیسے بتائیں۔  
”ثریا نے ان سے کہہ دیا تھا لیکن اب ان لوگوں کا  
خودی ارادہ تبدیل ہو گیا ہے۔“ اماں نے اتنے اطمینان  
سے جھوٹ بولا کہ وہاں بیٹھی ثریا آتا اور اندر ہڑی  
ساجدہ بھی حیران رہ گئی۔ سونیا نے بھی چونک کر ان کی

طرف دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟“ ابا نے حیرانی سے کہا۔

”مطلب یہ کہ وہ لوگ اب یہاں رشتہ نہیں کرنا  
چاہتے۔ وہ لوگ کہیں اور بر تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں  
نے ہم سے معذرت کر لی ہے۔“ اماں نے سکون سے  
ایک اور جھوٹ بولا اور ان کے اس جھوٹ پر ساجدہ کا  
دل چاہا کہ وہ انہیں کم از کم سونے کا ایک میڈل ضرور  
پہنا دے۔

”عجیب لوگ ہیں۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پہلے بات  
کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ ابا نے کچھ ترشی سے  
کہا۔

”چلیں جو ہوا اچھائی ہو۔ اب آپ خود ان سے  
کوئی اس سلسلے میں بات کرنے لگ جائیے گا۔ اچھا  
نہیں لگے گا۔“ اماں نے نصیحت کی۔

”ارے دماغ خراب ہو گیا ہے میرا کہ میں ایسے  
فضول لوگوں سے کوئی بات کروں گا۔ میری طرف سے  
بھاڑ میں جائیں۔“ ابا غصے میں لگ رہے تھے۔

”ارے اماں! آپ نے تو مکمل کر دیا۔“ ابا کے  
جانے کے بعد ثریا اپنے خوش ہو کر اماں سے کہا۔  
”کیسے بات کو سنبھالا۔ ورنہ میں تو ڈر رہی تھی کہ  
میں ابا کو منع کرنے والی بات بتاؤں گی تو ابا کیس ناراض  
ہی نہ ہو جائیں۔“

”اماں! آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت اچھی۔“  
ساجدہ نے شکرگزاری سے ان کی طرف دیکھا۔  
”بات تو میں نے بنا دی ہے۔ لیکن اب کوشش کرنا  
کہ یہ بات تمہارے ابا کو پتا چلے۔“ انہوں نے کہہ  
کر خاموش بیٹھی سونیا کی طرف دیکھا۔

”سونیا! یہ بات تمہارے ابا کو پتا نہیں چلی  
چاہے۔ سن رہی ہونا یہ بات۔“ انہوں نے قدرے  
تخت کچے میں سونیا سے کہا۔ سونیا نے بے زاری سے  
اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

گھر میں کشیدگی کی فضا تھی۔ سونیا اپنی ضد پر اڑی

ہوئی تھی۔ وہ کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔  
ساجدہ نے بھی ایک دو بار موقع پا کر اسے سمجھانے کی  
کوشش کی تھی۔ اسے فائزہ کی یہ بات بھی پتائی تھی کہ  
اس نے ذیشان کو کسی اور لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے  
دیکھا ہے لیکن وہ اس کی یہ بات سن کر اور بھڑک اٹھی  
تھی، اس کا خیال تھا کہ ساجدہ اور فائزہ دونوں حسد میں  
اس قسم کی باتیں کر رہی ہیں کیونکہ ان دونوں سے یہ  
بات بھڑم ہی نہیں ہو رہی کہ اس کی شادی اتنے پینڈیم  
اور دولت مند لڑکے سے ہو رہی ہے۔ اس نے سچ  
لجے میں ساجدہ سے کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور  
اپنی فکر کرے اس کی فکر کرنا چھوڑ دے۔

اور صرف دو دن بعد اسے اپنی فکر کرنا پڑ گئی جب ابا  
نے دکان سے گھر آنے کے بعد غصے سے اماں کو ان کا وہ  
ذہانت بھرا جھوٹ بتایا جو انہوں نے بڑی صفائی سے  
گھڑا تھا۔

”شرم نہیں آئی تم لوگوں کو جھوٹ بولتے ہوئے  
رشتے سے منع تم لوگوں نے خود کیا اور نام لگا دیا ان  
لوگوں کا بڑی چالاکیاں کرنا آگئی ہیں تم لوگوں کو۔“ ابا  
خاصے غصے میں لگ رہے تھے۔

”آپ۔۔۔ کو کس نے بتایا؟“ اماں نے گھبرا کر  
پوچھا۔ ان کی بات سن کر سامنے پر آمدے میں بیٹھی  
سبزی بنائی ساجدہ بھی گھبرا گئی تھی۔

”محبوب حسین خود آیا تھا میری دکان پر۔ شکوہ کر رہا  
تھا کہ ہم نے بغیر کوئی بات کہے سنے رشتہ سے صاف  
انکار کر دیا ہے۔ جب میں نے اس سے کہا کہ رشتہ لے  
کر آئے گا کہہ کر وہ لوگ خود ہی پیچھے ہٹے ہیں تو وہ تو  
حیران رہ گیا اور اس نے مجھے قسم کھا کر یقین دلایا کہ  
انکار انہوں نے نہیں بلکہ ہم لوگوں نے کیا ہے۔ کیا  
بتاؤں کتنی شرمندگی ہوئی ہے مجھے۔ کیا سوچنا ہو گا وہ  
ہمارے بارے میں۔“

”جو سوچتا ہے سوچتا رہے۔ اس کے سوچنے نہ  
سوچنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اماں اب  
سنبھل گئی تھیں۔  
”یعنی تمہیں اپنے جھوٹ پر ذرا بھی شرمندگی

نہیں ہے؟“ ابا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔  
”اس وقت مجھے جو مناسب لگا میں نے کہہ دیا اور  
ویسے بھی اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تو آپ کو بھی پتا  
چل چکا ہو گا کہ مجھے یہ رشتہ ذرا بھی پسند نہیں ہے۔ اگر  
وہ لوگ رشتہ لے کر آ بھی جاتے تو بھی ہم نے انکار ہی  
کرنا تھا۔“

”کیوں انکار کر دیتے؟ تمہاری اطلاع کے لیے  
عرض ہے کہ میں یہ رشتہ قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا  
ہوں۔ میں نے محبوب حسین کو تقریباً ہاں کہہ دی ہے  
اور اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ دونوں میں رسمی طور پر بھی  
رشتہ لینے کے لیے اپنے گھر والوں کو بھیج دے۔“ ابا  
نے بہت اطمینان سے کہا۔

ساجدہ کے ہاتھ سے چھری گر گئی۔ وہ وہیں مارے  
صدے کے قن دن رہ گئی تھی۔ اماں بھی حیرت اور  
شاک کے عالم میں ابا کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ خود ہی  
کر لیا۔ میرا خیال نہیں آیا آپ کو؟“

”جب تم مجھ سے پوچھے بغیر ان لوگوں کو ناں کہہ  
سکتی ہو تو میں انہیں ہاں کیوں نہیں کہہ سکتا۔ اور مجھے  
تو تم پر حیرت ہو رہی ہے، تمہیں تو ساجدہ کے رشتے کی  
بہت جلدی تھی، ہر آنے جانے والے کو اس کے رشتے کی  
کا کہنی تھیں اب جب ایک رشتہ خود چل کر گھر آ رہا  
ہے تو تم اسے ٹھکرانا چاہتی ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری  
عقل کو؟“

”اور میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کی عقل کو  
کیا ہو گیا ہے۔ کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا کہ وہ ساجدہ سے  
کتنا برا ہے۔ تین بچے ہیں اس کے، اس کا کردار اس  
کا مزاج، آپ کو کچھ نظر نہیں آ رہا؟“ اماں تاسف سے  
انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”محب کچھ نظر آ رہا ہے مجھے اور بہت سوچ سمجھ کر  
فیصلہ کیا ہے میں نے اور میرا تمہیں مشورہ یہی ہے کہ  
تم بھی حقیقت پسند بن کر سوچو جذباتی ہو کر نہیں اور  
حقیقت یہی ہے کہ جو خاں ساجدہ میں ہے اس کی وجہ  
سے اس کے ایسے ہی رشتے آئیں گے۔ تم خود بتاؤ تم



کتنے عرصے سے اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی ہو۔  
 بتاؤ کوئی رشتہ ملا؟“ ابا واقعی بہت حقیقت پسند ہیں یہ  
 اندازہ ساجدہ کو اب بہت اچھی طرح ہو رہا تھا۔  
 ”یہ ٹھیک ہے کہ میں ساجدہ کے رشتے کے لیے  
 پریشان تھی اور اب بھی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ تو  
 نہیں کہ اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے ہم اپنی بیٹی کو  
 ایک ایسے شخص کے پلے باندھ دیں جس کا کردار  
 مشکوک اور مزاج اتنا کڑوا ہے۔ یاد نہیں کیسے اپنی بیوی  
 کو مارتا بیٹنا تھا۔ کیسے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اگر  
 ہم اس کی زیادہ عمر اور تین بچوں کو نظر انداز کر بھی دیں  
 تب بھی اس بات کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔“  
 ”تم نے خود اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے؟“  
 ”نہیں۔ لوگوں سے سنا ہے۔ اس کے ساتھ رہنے  
 والے ہمسائے اور۔۔۔“  
 ”یعنی تم صرف سنی سنائی پر اعتبار کر کے اپنے گھر  
 آنے والے اس واحد رشتے کو بھی ٹھکرا دینا چاہتی ہو۔  
 ارے سنی سنائی پر نہ جاؤ۔ لوگوں کو تو عادت ہوئی ہے  
 بات کا ٹنکڑ بنانے کی اور پھر اس کے کردار کی اچھائی اس  
 سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس نے جینے لینے سے صاف  
 انکار کر دیا ہے اس نے مجھے صاف کہہ دیا کہ چاچا جی  
 میں آپ سے جینے کے سلسلے میں ایک پائی بھی نہیں  
 لوں گا۔ خود سوچو اس سے اچھا رشتہ اور وہ بھی ساجدہ  
 کے لیے، ہمیں کوئی اور ملے گا۔“ ابا کا انداز بالکل قطعی  
 تھا اور ساجدہ کو لگ رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہو۔  
 ایک ایسا شخص جس کی صورت دیکھتے ہی اس سے  
 نفرت کرنے کو دل چاہتا ہو اس کے ساتھ وہ پوری  
 زندگی کیسے بتائے گی۔  
 ”آپ کچھ بھی کہیں، مجھے یہ رشتہ منظور نہیں  
 ہے۔“ اماں نے غصے سے کہا۔  
 ”میں تم سے پوچھ نہیں رہا۔ تمہیں بتا رہا ہوں۔“  
 ابا غصے سے کھڑے ہو گئے۔ ”تم ناویا نہ مانو میں اس کا  
 رشتہ وہاں ملے گا کچا ہوں۔ اور اس گھر میں وہی ہو گا جو  
 میں چاہوں گا۔ سمجھیں تم؟“ ابا کہہ کر کے نہیں اور  
 وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اماں نے بے بسی سے

ساجدہ کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ان کا دل چاہا وہ  
 بھی رونام شروع ہو جائیں۔  
 ☆ ☆ ☆  
 ”تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے ابا نے تمہارا رشتہ  
 ایسے شخص کے ساتھ ملے کر دیا ہے جس کے تین بچے  
 ہیں جو رنڈاؤ ہے۔ شرابی ہے، بد مزاج ہے، خود سربے  
 اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ ہے نا۔“  
 ”فائزہ سچی سے بولی۔ وہ اس وقت فائزہ کے گھر آئی  
 ہوئی تھی اور وہ دونوں فائزہ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی  
 تھیں۔  
 ”مجھے تو حیرت اس بات پر ہو رہی ہے، ایک باپ  
 اپنی اولاد کے بارے میں اتنا دہرا معیار کبھی رکھ سکتا  
 ہے۔ ایک بیٹی کے بارے میں اتنا اچھا اور دوسری کے  
 بارے میں اتنا برا۔“ وہ حیرت اور دکھ سے مغموم بیٹھی  
 ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”اور تم۔۔۔ مجھے تو تم پر طیش آ رہا ہے۔ تم چپ  
 کر کے ان کی باتیں سنتی رہیں۔ تمہیں تو انکار کر دینا  
 چاہیے تھا۔ صاف انکار۔“ اب وہ غصے سے کہہ رہی  
 تھی۔  
 ”کیسے کرتی میں انکار۔“ وہ رنجیدگی سے بولی۔ ”وہ  
 اماں سے بات کر رہے تھے جب انہوں نے اماں کی کسی  
 بات کو قابل توجہ نہیں سمجھا تو میری بات کو کیسے  
 سمجھتے۔ ان کے پاس بہت سی دلیلیں تھیں، بہت سی  
 وجوہات تھیں اس رشتے کو قبول کرنے کی اور سب سے  
 بڑی دلیل سب سے بڑی وجہ تو انہوں نے یہ بتائی کہ  
 میں بد صورت ہوں۔ مجھ جیسی بد صورت لڑکی کے  
 لیے یہی رشتہ مل گیا ہے تو غنیمت ہے اور کون آئے گا  
 مجھے بیاہنے اور ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے وہ۔“ اس کی  
 آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ”میں بد صورت ہوں  
 اور یہی میری اوقات ہے۔“  
 ”بہت افسوس ہو رہا ہے۔ مجھے تم پر ساجدہ! بہت  
 افسوس۔“ وہ تاسف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے  
 بولی۔ ”میں سمجھ رہی تھی کہ شاید اب تمہارے انداز

فکر میں تبدیلی واقع ہو گئی ہوگی اور تم میں اعتماد پیدا  
 ہو گیا ہوگا۔ لیکن۔۔۔ تم تو وہی ساجدہ ہو۔ وہی خود  
 ترسی کا شکار، احساس کمتری کے خول میں مبتلا رہنے والی  
 لڑکی دوسرے کے ہاتھوں میں اپنے مستقبل کا فیصلہ  
 سونپ کر اپنی ساری خرابیوں اور نا کامیوں کا ذمہ دار  
 تقدیر کو سمجھنے والی لڑکی، تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے  
 ساجدہ! بہت مایوس۔“  
 ”تو کیا کروں۔ کیا کروں میں؟“ وہ روتے ہوئے  
 بولی۔ ”میں تمہاری طرح خوبصورت اور پر اعتماد نہیں  
 ہوں۔ میں ایک بد صورت اور بزدل لڑکی ہوں۔ مجھ  
 میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے باپ کے سامنے  
 کھڑی ہو جاؤں۔“  
 ”ہمارا بنو ساجدہ! اگر اس وقت بزدل دکھاؤ گی تو  
 آئندہ پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کا ذمہ دار  
 تمہیں قسمت کو ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔“  
 ”شاید۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میرے  
 لیے یہ سب کرنا بہت مشکل ہے۔“ وہ آنک کر بولی۔  
 ”کیوں مشکل ہے۔ سونیا کی مثال تمہارے  
 سامنے ہے۔ اس نے بھی تو انکار کر دیا ہے حالانکہ اس  
 کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا جو تمہارے ساتھ  
 ہو رہا ہے۔ ساجدہ! تمہیں انکار کرنا ہو گا ورنہ تمہارے  
 سارے خواب اور حورے رہ جائیں گے۔ وہ خواب  
 جنہوں نے تمہیں جینے کا نیا حوصلہ دیا ہے اور جن کو  
 پانے کے لیے تم اتنی سخت کر رہی ہو۔“  
 ”میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں ساجدہ! اسے سوچ  
 میں ڈوبا ہوا دیکھ کر وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ  
 لراتے ہوئے بولی۔  
 ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی فائزہ!“ وہ کچھ دیر بعد بولی تو  
 اس کا لہجہ نئے حوصلے اور عزم سے جگمگا رہا تھا۔ ”میں  
 ضرور انکار کروں گی۔ آخر یہ زندگی بھر کی بات ہے، کوئی  
 فراق تو نہیں پھر سونیا نے بھی تو انکار کر دیا ہے۔ میں  
 کیوں انکار نہیں کر سکتی۔“  
 ”یہ ہوئی نابات۔“ فائزہ خوش ہو کر بولی۔ ”اب لگی  
 ہونا میری اصلی والی سیلی۔“

☆ ☆ ☆  
 ”وہ لوگ آرہے ہیں کل۔“ ابا نے کھانا کھاتے  
 ہوئے اماں کو بتایا۔ وہ دوسرے کھانا کھانے کے لیے گھر  
 آئے ہوئے تھے۔ ساجدہ بظاہر اپنی کتاب کھول کر  
 پڑھنے میں مصروف تھی لیکن اس کے کان اماں اور ابا  
 کی باتوں میں لگے ہوئے تھے اس نے آج اسکول سے  
 چھٹی کی گئی کیونکہ وہ آج ابا کو اپنے انکار کے متعلق  
 بتانا چاہتی تھی اور اس کے لیے دوسرے کا وقت اس کے  
 خیال میں سب سے مناسب تھا کیونکہ اس وقت گھر  
 میں سوائے اماں اور ابا کے اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ فائزہ  
 نے اس سے کہا تھا کہ وہ زیادہ ٹائم ضائع کیے بغیر اپنے ابا  
 کو انکار کر دے کیونکہ ابھی صرف زبانی کلامی بات ہوئی  
 تھی اگر باقاعدہ رشتہ طے ہو جاتا تو پھر اس بارے میں  
 بات کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔  
 ”محبوب حسین کے گھر والے باقاعدہ رشتہ لے کر  
 آرہے ہیں۔“ انہوں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے  
 کہا۔  
 ”حالانکہ میں نے آپ کو منع کیا تھا۔“ اماں نے  
 شکوہ کیا۔ ”لیکن شاید آپ کے نزدیک میری بات کی  
 کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔“  
 ”تم ایک بے وقوف عورت ہو۔“ ابا نے ترشی سے  
 کہا۔ ”اگر عقل سے سوچو گی تو محسوس ہو گا کہ یہ فیصلہ  
 کتنا درست ہے۔ اپنی بیٹی کی شکل و صورت کو دیکھو  
 اور پھر دیکھو کہ یہ رشتہ مناسب ہے یا نہیں۔“  
 ”اگر عقل کے ساتھ سوچنے سے اس قسم کے فیصلے  
 کیے جاتے ہیں تو پھر یہ عقل آپ کو ہی مبارک ہو،  
 میرے سوچنے کے لیے میرا دل ہی کافی ہے۔“ اماں  
 نے سچی سے کہا۔  
 ”تم اور تمہارا دل دونوں ہی فضول ہیں۔“ وہ چنگیر کو  
 سمیٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”مجھ سے اب اس سلسلے  
 میں کوئی بحث نہ کرنا۔ وہ لوگ کل آرہے ہیں۔ سہرا ب  
 سے کہہ کر جو منگو انا ہو منگو الینا۔“  
 ساجدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے جو کچھ کہنا تھا ابھی کہنا



تھابعد میں کہنا شاید اس کے کوئی کام نہ آتا۔ ابادہاں سے جانے کے لیے مڑے۔ اس نے بابا کو لکارا ”بابا!“  
 ابانے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں استعجاب اتر آیا۔ ”تم نے مجھے بلایا ہے؟“  
 ”جی بابا!“ اس نے سر بلایا۔ ”مجھے مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ تھوڑا نکتے ہوئے بولی۔  
 ”مجھ سے؟“ اباجرت زندہ ہو کر بولے۔  
 ”جی آپ سے۔ آپ بیٹھیں نا۔“ اس نے سامنے بڑی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔  
 اباتھوڑی دیر اسے ایسے دیکھتے رہے جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ایسا شاید پہلی بار ہوا تھا کہ ساجدہ نے ان سے کوئی بات کرنے کے لیے انہیں اس طرح روکا تھا ورنہ وہ تو سونیا کی باتوں کو سننے اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے عادی تھے۔

انکار کیا! اب دوسری انکار کر رہی ہے۔ غضب خدا کا کیا دوسرے گھروں میں بھی بیٹیاں اپنے باپ کے سامنے اس طرح کھڑے ہو کر بے حیائی سے انکار کر دیتی ہیں جیسے ہمارے گھر میں ہو رہا ہے۔“  
 ”ساجدہ!“ اماں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔  
 ”تمہیں اپنے باپ سے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔“  
 ”کیوں اماں!“ اس نے نم آنکھوں سے اماں کی طرف دیکھا ”کیا میں انکار نہیں کر سکتی؟ میرے سینے میں دل نہیں ہے یا اپنے جذبات کو بیان کرنے کے لیے میرے منہ میں زبان نہیں ہے۔ میں بد صورت ہوں۔“ اس نے اب کی بار ابابا کی طرف دیکھا۔ ”لیکن شاید آپ بھول گئے ہیں کہ بد صورت ہونے کے باوجود میرے سینے میں آپ کی طرح کا ایک زندہ دھڑکتا ہوا دل موجود ہے۔“

”دیکھا۔ دیکھا تم نے۔“ ابانے دانت پیس کر کہا۔  
 ”کیسے زبان چلا رہی ہے میرے سامنے۔“ پھر وہ غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”بہت پر نکل آئے ہیں تمہارے۔ کیا اپنے باپ سے ایسے بات کی جاتی ہے۔ یہی کچھ سکھایا ہے تمہیں تمہارے اسکول والوں نے؟“

”بابا! میں نے آپ سے کوئی بد تمیزی نہیں کی۔ میں تو صرف اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”اور اپنی رائے کا اظہار کرنا میرا حق ہے۔“

”بکو اس بند کرو۔“ ان کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا۔ اماں حق دق انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ ساجدہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ آنسو بہت تیزی سے پلکوں کی باڑھ توڑ کر نکلے تھے۔

”یہی ہے تمہارا حق۔“ وہ غصے سے دھانڑتے اس ”روشن خیال“ بابا سے بہت مختلف لگ رہے تھے جنہوں نے سونیا کی تمام باتیں بہت سکون سے سنی تھیں اور اس کی خاطر ہول میں ایک لڑکے سے ملنے گئے تھے۔

”ہاں کہو۔“ ابانے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”بابا۔۔۔ وہ میں۔ میرا مطلب ہے کب۔“  
 ”یہ کیا وہ میں میں لگا رکھی ہے تم نے جلدی کہو“ مجھے دکان پر جانے میں دیر ہو رہی ہے۔“ ابانے ترش سے اس کی بات کاٹ دی۔  
 ”بابا! میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں۔ کہ میں محبوب حسین سے شادی نہیں کر سکتی۔“ اس نے آخر دل کڑا کر کہہ ہی دیا۔

”کیا؟“ اباس طرح اچھلے جیسے چارپائی کے اسپرنگ نکل آئے ہوں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“  
 ”جی بابا! میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اب اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ ”مجھے وہ شخص بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ اتنے کدوا کا حامل نہیں ہے اور ویسے بھی مجھے ابھی بہت بڑھنا ہے۔“

سر جھکا کر دیرے دیرے کہتے ہوئے اس نے نظریں اٹھا کر ابابا کی طرف دیکھا اور گھبرا گئی۔ ابابے حد غصے میں لگ رہے تھے۔ پھر وہ چلانے لگے۔  
 ”یہ کی ہے تم نے اپنی بیٹیوں کی تربیت۔“ انہوں نے حیران کھڑی اماں کو مخاطب کیا۔ ”پہلے ایک نے



”باب کے سامنے زبان چلاؤ۔ میری عزت کا میری زبان کا کوئی خیال ہے تم لوگوں کو؟ میں کہتا ہوں کیا خرابی ہے محبوب حسین میں۔ لولاہے، لنگڑا ہے، لالچ ہے کما تا نہیں ہے، کیا خرابی ہے اس میں؟“ کیا تمہارے لیے کوئی شہزادہ اتر کے آئے گا آسمان سے تاؤ جواب دو۔“

وہ غضب ناک انداز میں اس سے پوچھ رہے تھے لیکن ساجدہ ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے رہی تھی کیونکہ وہ رو رہی تھی۔ ہر شخص اس سے یہی پوچھتا تھا۔ ہر کوئی اس سے یہی کہتا تھا۔ وہ تو کسی شہزادے کی طلب گار نہیں تھی پھر اس سے یہ کیوں پوچھا جاتا تھا۔ ”جو رشتہ تمہیں مل گیا ہے نا اسے ہی غنیمت سمجھو یہ رشتہ بھی بڑی مشکلوں سے ملا ہے بہت پار بننے کے بعد۔ اسے بھی ٹھکرا دینا چاہتی ہو تم؟ کیا ساری زندگی ہمارے سر پر سوار ہوگی تم؟“

”بہت شکریہ ابا!“ وہ روتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی ”بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے مجھے میری اوقات یاد دلادی۔ یہی تو ہے میری اوقات۔ یہ میری غلطی ہے کہ میں اس کو بھول گئی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ میں آپ کی بد صورت بنی ہوں۔ میرے لیے آپ کا معیار کچھ اور ہے دوسروں کے لیے اور۔ آپ فکر مت کریں، میری شادی وہیں ہوگی جہاں آپ چاہتے ہیں۔ آئندہ آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ہمیشہ اپنی اوقات یاد رکھوں گی۔ ہمیشہ۔“

وہ روتے ہوئے وہاں سے ایسے بھاگی جیسے اس کی قسمت اس سے دور بھاگ رہی تھی۔

\*\*\*

وہ مرجانا چاہتی تھی۔ لیکن مرجانا بھی کہاں آسان تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس دنیا میں تکلیف دہ زندگی گزارنے کے بعد جب وہ قبر میں جائے تو وہاں بھی اس کے لیے تکلیفوں اور اذیتوں بھری ایک اور زندگی منتظر ہو۔ لہذا وہ زندہ رہی اور اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کو اجڑتے اور اپنی زندگی کو تباہ ہوتے دیکھتی رہی۔

اگلے روز وہی کچھ ہوا جو کچھ ابا چاہتے تھے۔ اس کا رشتہ محبوب حسین سے طے ہو گیا۔ شادی دو تین مہینے کے بعد ہونا قرار پائی۔ ساجدہ کا رشتہ طے کرنے کے دو تین دن بعد انہوں نے سونیا کا رشتہ بھی ناصر کے ساتھ طے کرنے کا اعلان کر دیا۔ سونیا نے اس سلسلے میں احتجاج کرنے کی کوشش کی لیکن ابائے اس کے احتجاج کو ”نرئی“ سے مسترد کر دیا انہوں نے سونیا سے کہا کہ وہ یہ سب کچھ اس کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں کیونکہ اپنے تجربے کی بنا پر وہ پرکھ چکے ہیں کہ ذیشان اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے وہ اس کے لیے اچھا جیون سا بھی ثابت نہیں ہو گا جبکہ ناصر اس کے لیے ہر لحاظ سے اچھا اور بہترین جیون سا بھی ثابت ہو گا۔

دو تین روز کے بعد سعادت پچا اور ناصر کے دوسرے گھر والے بھی باقاعدہ رسم کر گئے۔ سونیا نے بظاہر خاموشی اختیار کر لی تھی اور سب نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کے خاموش ہونے کا مطلب بظاہر یہی تھا کہ وہ اس رشتے پر راضی ہو گئی ہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ساجدہ اور سونیا کی شادی اکٹھے ہی کر دیں گے۔ ساجدہ کو تو انہوں نے کچھ دینا نہیں تھا کہ انہیں اس کے لیے انتظام کرنے کو کچھ وقت چاہیے ہوتا اور وہ کئی سونیا، ان کی عزیز از جان بیٹی تو اس کے لیے پہلے ہی سے وہ بہت کچھ پس انداز کر چکے تھے اور باقی جو رہ گیا تھا وہ اسے دو ڈھائی ماہ میں آسانی سے جمع کر سکتے تھے۔

ساجدہ نے اسکول چانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب اس کا اسکول جانا زیادہ عرصے برداشت بھی نہیں کیا جائے گا اب وہ فائزہ سے بھی بہت کم لگتی تھی وہ بھی فائزہ اسے خود فون وغیرہ کر کے اس کی خیریت معلوم کر لیتی تھی۔

کیا فائدہ تھا اس سے بات کرنے کا۔ اس سے ملنے کا۔ اس سے ملنے کے بعد ہی تو وہ اپنی اوقات اور حیثیت بھولی تھی اور اس نے مستقبل کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا لیکن۔ اچھا تھا۔ اچھا تھا کہ اب اسے اپنی اوقات دوبارہ سے یاد آئی

تھی۔ اس کا کام صرف دوسروں کی بات پر سر جھکانا اور ان کے احکام کو بلا جوں چرا ماننا تھا۔ اس کی بد صورتی اس کا بہت بڑا جرم تھی اور اس کی سزا تو اسے بھگتنا ہی تھی۔

\*\*\*

وہ گرمیوں کی ایک عام صبح تھی وہ اپنی چارپائی پر سر سے پیر تک چادر لپیٹے سوئی ہوئی تھی۔ اماں اسے اٹھنے کے لیے دو تین آوازیں دے چکی تھیں۔ گرمیاں ہونے کی وجہ سے وہ لوگ صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ اماں کے اٹھانے کے باوجود وہ کسل مندی سے آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ اس کا دل اب کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔ نہ سونے میں نہ جاگنے میں نہ کھانے میں نہ پینے میں۔ اسے لگتا تھا جیسے زندگی سے اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی ہو، اب شاید وہ زندگی کو نہیں گزار رہی تھی بلکہ زندگی اسے گزار رہی تھی۔

سورج کب کا طلوع ہو کر اب اس کے سر پر کھڑا اسے چلا رہا تھا لیکن وہ اماں کے بار بار اٹھانے کے باوجود اپنی جگہ ڈھٹ بن کر پڑی رہی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سارے لوگ اسے اٹھاتے رہ جائیں لیکن وہ سوئی کی سوئی رہے۔

”اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔“ اس نے حسرت سے سوچا۔ تب ہی اسے اماں کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ارے یہ صبح ہی صبح سونیا کہاں چلی گئی ہے۔ سب جگہ دیکھ چکی ہوں میں۔ کہیں نہیں ہے وہ۔ آخر کہاں چلی گئی ہے وہ؟“

”سہراب کے ابا!“ اب وہ ابا کو آوازیں دے رہی تھیں۔

ایانے جھنجھلائے ہوئے پوچھا ”کیا بات ہے، کیوں اتنا چلا رہی ہو؟“

”ابھی تو میں چلا رہی ہوں تو ٹوٹی دیر بعد آپ بھی چلانے لگیں گے۔ آپ کی لاٹھی بیٹی سونیا گھر پر نہیں ہے۔ نہ جانے اتنی صبح کہاں چلی گئی ہے۔“ اماں

کے انداز میں خوف گھبراہٹ غصہ سب ہی کچھ نمایاں تھا۔

”ہاں، وہ مجھے بھی نظر نہیں آ رہی کہاں گئی ہے وہ؟“ اماں نے بغیر سوچے سمجھے پوچھا پھر وہ کچھ پریشان نظر آنے لگے۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ اتنی صبح کہاں چلی گئی ہے وہ۔“

اتنی آوازیں سننے کے بعد اب اس کا سونا بننا نہیں تھا۔ وہ بھی گھبراہٹ میں بستر چھوڑ کر نیچے اتر آئی۔ اماں اور ابا دونوں برآمدے میں مضطرب و پریشان کھڑے سونیا کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

”تم نے بڑوس والوں کے گھر سے پوچھا ہے؟ ہو سکتا ادھر چلی گئی ہو۔“ اماں نے مضطرب سے انداز میں پوچھا۔

”ہاں گھر میں سب جگہ دیکھنے کے بعد ساتھ والوں کے گھر سے بھی پوچھا ہے میں نے۔“ اماں کا دل ہول رہا تھا اور یہ ہول اہٹ اس وقت مزید بڑھ گئی جب نعمان نے آکر بتایا۔

”اماں! آپ کے تمام زیورات کے ڈبے خالی پڑے ہوئے ہیں اور الماری کالاک بھی کھلا ہوا ہے۔“

”کیا؟“ اماں نے بدحواسی سے پوچھا۔ پھر اماں اور ابا بھاگ بھاگ کمرے میں پہنچے۔ الماری کا کھلا ہوا لاک اور زیورات کے خالی ڈبے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

گھر کے تمام افراد آن واحد میں وہاں جمع ہو چکے تھے۔ سونیا بھی غائب اور زیورات بھی غائب تھیں۔ اس بات کا جو بھی مطلب تھا وہ سب بخوبی سمجھ رہے تھے۔ اماں دیوانوں کی طرح لکڑی سے بنی اس الماری کی تلاشی لے رہی تھیں۔ ان کے تمام زیورات کے علاوہ سونیا کے جینز کے لیے بنائے گئے کپڑوں کے جوڑوں میں سے بھی بیشتر غائب تھے۔

”دیکھ لیا، دیکھ لیا آپ نے۔“ وہ چیخ کر لیا سے بولیں ”دیکھ لیا آپ نے اپنی بیٹی کا کارنامہ، بھاگ گئی ہے وہ اپنے بار کے ساتھ۔“

”نہ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا، سونیا ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ نہیں۔ نہیں ضرور



کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اب کی بدحواسی ان کے چہرے سے واضح تھی شاید وہ سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔

”غلط فہمی؟“ اماں نے دکھ اور غصے سے ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ غلط فہمی ہے۔ میرے تمام زیور غائب ہیں اس کے چیز کے تقریباً سارے کپڑے غائب ہیں وہ خود یہاں نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہے بتائیں مجھے۔“ وہ اب رو رہی تھیں۔

ابا پی ہوئے چہرے کے ساتھ کبھی روتی ہوئی اماں کو دیکھ رہے تھے کبھی چوہٹ کھلی ہوئی الماری کو اور کبھی گھر کے بڑے گیٹ کو انہیں شاید سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں تب ہی نعمان ایک کانڈ ہاتھ میں لیے ابا کی طرف بڑھا۔

”ابا! یہ سونیا کا خط ہے۔ یہ ڈرنک ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔“

ابا نے لڑتے ہوئے ہاتھوں سے وہ کانڈ لیا۔ اس پر لکھی ہوئی تحریر کو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتے تھے وہ ان کی عزیز ازواج بیٹی سونیا کی تحریر تھی۔ خط پر لکھا ہوا ابا!

میں ڈشٹان کے ساتھ یہاں سے بہت دور جاری ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجئے گا مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا لیکن اس کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں اگر آپ سب میری بات مان لیتے تو مجھے یہ سب نہ کرنا پڑتا۔

میں اماں کے زیورات بھی لے کر جاری ہوں ویسے بھی یہ سارے زیورات میرے پاس ہی آئے تھے پہلے یا بعد میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ساجدہ کو تو ویسے بھی آپ نے کچھ نہیں دینا تھا۔

خدا حافظ  
آپ کی بیٹی سونیا  
ابا کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا۔ خط ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا کر انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین و آسمان زور زور سے گھومنا شروع ہو گئے ہوں اور تیز

آندھی سے گھر کی تمام چیزیں بکھری جارہی ہوں۔ انہوں نے سارے کے لیے سامنے والی دیوار کو پکڑنے کی کوشش کی۔

”سونیا! تیرا کچھ نہ رہے۔ تو نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔“ اماں اب روتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔ ”رہے کچھ تو خیال کر لیتا ہوتا ہمارا۔“

”اماں پلینز آہستہ بولیں۔ پورے محلے والوں کو سنائیں گی کیا۔“ مسر اب نے ناگواری سے اماں کو ٹوکا۔

”میرے آہستہ بولنے سے کیا ہو گا۔ کیا یہ بات چھپ جائے گی۔ ایسی باتیں چھپا کرتی ہیں۔“ اماں بدستور رو رہی تھیں۔ باقی سب لوگ خاموش تھے کسی بت کی طرح۔

”ابا! یہ سب آپ کی دی ہوئی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اسے بہت سرچھا رکھا تھا۔“ مسر اب نے اب کی بار ابا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”صرف سرچھا رکھا تھا؟“ اماں نے مداخلت کی۔ ”اے انہوں نے تو اسے لاڈ پیار میں بالکل بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہتیرا کہا میں نے کہ لڑکی ذات ہے انتہامت سرچھا ہو مگر انہوں نے مجال ہے جو میری کوئی بات سنی ہو۔ اب بتائیں کیا جواب دیں گے ہم سعادت بھائی کو پورے خاندان والے تھو تھو کریں گے ہم پر کتنی بدنامی ہوگی ہماری۔“

ابا ان سب باتوں کے جواب میں بالکل خاموش تھے۔ ساجدہ ان کی حالت کو تشویش سے دکھ رہی تھی۔ انہیں بھی کچھ بولنا چاہیے تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے انہیں سکتے ہو گیا ہو وہ جہاں تھے وہیں رک گئے تھے۔

پھر اچانک وہ کھڑے کھڑے نیچے گر گئے۔

سب لوگ بہت تیزی سے ان کے پاس آئے تھے۔

ابا بہت سخت بیمار پڑے تھے۔ ان کا اعصابی نظام شاید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ کچھ دن انہیں ہسپتال میں بھی رہنا پڑا تاہم ایک ڈیڑھ ہفتے کے بعد وہ گھر

آگئے۔ یہ بات معمولی نہیں تھی کہ چھپائی جاتی۔ دونوں میں ہی یہ بات پورے محلے میں پھیل گئی تھی۔ خاندان والے باتیں بنارہے تھے اور محلے والوں نے سوال کر کر کے ان کا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ ان کے گھر کے کسی بھی فرد کا باہر جانا عذاب ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ ہمدردی جاتے اور کچھ براہ راست طعن و تشنیع کرتے آتے۔

انہوں نے اس واقعہ کی رپورٹ پولیس میں درج نہیں کی تھی البتہ سہرا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سونیا کو ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

اس صورت حال سے گھر کے تمام افراد پریشان تھے لیکن ابا کی حالت تو بہت قابل رحم ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن بیڈر خاموش پڑے چھت کو گھومتے رہتے۔ گھر سے باہر نکلتا انہوں نے تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ دکان ان کی غیر موجودگی میں نعمان سنبھال رہا تھا۔

ساجدہ ان کے دکھ کا اندازہ کر سکتی تھی۔ جب خواب بکھر جائیں ۴ منٹیں دم توڑ دیں اور انسان کو کسی اپنے کے ہاتھوں تکلیف اور دکھ ملے تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ یہ عذاب کتنے ہی عرصے سے جھیل رہی تھی۔ اپنوں کے درمیان اور اپنوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اسے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اجنبیوں کے ساتھ رہتی ہو جنہیں اس کے احساسات اور جذبات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

ابا جتنے عرصہ بیمار رہے تھے ساجدہ نے جی جان سے ان کی خدمت کی تھی۔ اماں تو خود صدمے کی حالت میں تھیں اور پھر وہ ابا کو کسی حد تک اس واقعے کا ذمہ دار بھی خیال کرتی تھیں لہذا وہ ان سے دور رو رہی رہتی تھیں اور رہیں ثریا آتا تو وہ صرف باتیں بکھارنے کی ماہر تھیں سو آج کل بھی وہ یہ کام بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی تھیں۔ اپنی باتوں سے وہ اماں اور ابا دونوں سے ہی خوب ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں اور سونیا کو برا بھلا کہنے کا سیشن بھی ساتھ ساتھ ہی چلتا تھا۔

ساجدہ جب بھی ابا کی تیمارداری کے لیے ان کے

پاس جاتی تھی اسے ان کی آنکھوں میں دکھ کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی نظر آتی تھی۔ وہ جب تک ان کے پاس رہتی وہ نظریں جھکائے رہتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہے ہوں۔

”ابا! یہ دودھ پی لیں۔“ سونیا کو گئے ہوئے کافی دن بلکہ ہفتے ہو گئے تھے لیکن ابا ویسے ہی گھر میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی بیماری کافی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی لیکن وہ اس جھٹکے سے شاید ابھی پوری طرح سنبھلے نہیں تھے۔

ابا اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کر سوئے ہوئے تھے۔ اس کی آواز سن کر انہوں نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔

”ابا! ان کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر اس نے آہستگی سے انہیں دوبارہ پکارا۔ ”دودھ پی لیں۔“ ”رکھ دو اور۔“ انہوں نے سائیڈ پر پڑی ہوئی تپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ”کی اول گا تھوڑی دیر بعد۔“

”نہیں ابا! ابھی پی لیں۔ کل بھی آپ نے ایسے ہی کہا تھا اور پھر بعد میں نہیں پیا تھا، ایسے ہی پڑا رہ گیا تھا۔“ وہ گلاس ہاتھ میں لیے وہیں کھڑی رہی۔

”کیا کروں گا دودھ پی کر میں۔ اگر تھوڑا سا زہر ہے تو وہ لاؤ۔“ ان کے انداز میں وہی یاسیت تھی جو پچھلے کئی دنوں سے ان کے لیے کا جزیقن کر رہی تھی۔

”ابا! پلینز ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ وہ گلو کر لے کر بیٹھ گئی۔

ابا تھوڑی دیر اسے دیکھتے رہے پھر اچانک اٹھ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر روئے گئے۔

”مجھے معاف کرو۔ مجھے معاف کر دو بیٹی۔ میں نے۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“ ساجدہ بوکھلا گئی۔ ”یہ۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”بیٹی جو مجھے کہنا چاہیے۔“ ”لیکن ابا! مجھے یہ سب کچھ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“ اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آخر ایسا کیوں کر رہے ہیں



آپ؟

”جو شخص کسی کے ساتھ زیادتی کرے۔ اس کے حقوق پامال کرے، اس کا دل دکھائے۔ کیا اسے اس شخص سے معافی نہیں مانگنی چاہیے۔“ ابا کا انداز دل گرفتہ سا تھا۔ جیسے وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے ہوں۔

”میرے دل پر، میرے ضمیر پر بہت بوجھ ہے اس کا“ میں اس بوجھ کو اتار دینا چاہتا ہوں میں نے تمہیں ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن جس بنی کو میں دل و جان سے پیار کرتا رہا اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔“

ابا کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

”میرے منہ پر کاک مل دی۔ مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ بڑے ہو کر یہ گل کھلائے کی تو میں پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ مجھے یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا جو اولاد اپنے والدین کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے اس کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ سونیا کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا“ تم دیکھ لیتا۔ ”ایسا کہتے ہوئے ان کا لہجہ ایک بار کی کانپا تھا۔

”نہیں ابا! ایسا مت کہیں۔“ اس نے بے اختیار ابا کو ٹوکا۔ ”کچھ بھی ہو آخر وہ ہے تو ہماری اپنی۔ خون کا رشتہ ہے اس کے ساتھ ہمارا۔“

”کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس سے ہمارا۔“ وہ غصہ سے بولا۔

ساجدہ جواب میں چپ رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ابا یہ سب کچھ وقت غصے کے زیر اثر کہہ رہے ہیں۔ سونیا نے ابا کو جو شک پہنچایا تھا اس کا اثر دھیرے دھیرے ہی کم ہو سکتا تھا۔

”تم اسکول نہیں جاتیں اب؟“ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

”جی ابا! میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے۔“ اس نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ بے تاثر رہے۔

”لیکن کیوں؟ میرا مطلب ہے کہ۔ تمہیں تو بہت شوق تھا پڑھنے کا۔ اور تم نے ہماری مخالفت کے باوجود

اسکول میں داخلہ لیا تھا۔“ ابا پتا نہیں واقعی انجان تھے یا پھر جان بوجھ کر انجان بن رہے تھے۔ اس نے کچھ چیرائی سے ابا کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

”ابا! اسکول تو مجھے دیئے بھی چھوڑنا تھا۔ آج نہیں تو۔ دوڑھائی ماہ بعد۔“ اس کی شادی محبوب حسین سے دوڑھائی مہینہ بعد ہی ہونا قرار پائی تھی۔

”تم۔ محبوب حسین سے اپنا رشتہ طے ہونے کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہو؟“

ساجدہ جواب میں چپ رہی۔

”تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو۔“ ابا نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

”نہیں ابا! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے تردید کی۔

”لیکن تم نے انکار کر دیا تھا۔“

”وہ۔ تو۔ وہ تو میں نے ویسے ہی۔“ وہ گڑبڑا گئی۔

”تم نے بالکل ٹھیک انکار کیا تھا۔ وہ شخص واقعی اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ساتھ تمہاری شادی ہو۔“

”جی“ ساجدہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”ہاں۔“ ان کی آنکھوں میں ندامت کے سائے لہرانے لگے۔

”میں محبوب حسین سے تمہارا رشتہ توڑ دوں گا۔ میں اسے انکار کر دوں گا۔“

ساجدہ نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ”لیکن آپ نے انہیں زبان دی ہے۔“

”میری زبان اور میرے قول کی اہمیت اب باقی رہ ہی کہاں گئی ہے۔“ ابا نے افسردگی سے کہا۔

”لیکن ابا! میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی شرمندگی ہو۔“ آپ میری وجہ سے انکار مت کریں۔ مجھے مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ برخلاف دل کے اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

ابا نے بہت پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں میری بیٹی نے کبھی مجھے شرمندہ نہیں کروایا اور مجھے یہ یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی کبھی مجھے شرمندہ

نہیں کروائے گی لیکن بحیثیت باپ مجھ پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن سے میں غفلت کرتا رہا اور غفلت میں ہی یہ فیصلہ کر بیٹھا۔ میرے لیے میری بیٹی کی خوشیاں اس کے جذبات اور اس کے خواب زیادہ اہم ہیں۔“

”ابا۔ آپ۔“ خوشی کی شدت سے اس کی آواز کانپنے لگی۔ ابا کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ کتنے پیارے، خوب صورت اور مسحور کن لگ رہے تھے۔

”آپ۔ بہت اچھے ہیں۔“ اس نے پیار سے ابا کے ہاتھ تھام لیے۔

”تو کیا میں سمجھوں کہ میری بیٹی نے مجھے معاف کر دیا ہے؟“ ابا مسکراتے ہوئے کتنے پیارے لگ رہے تھے۔

”اب اگر آپ نے یہ معافی دانی کے الفاظ مجھ سے بولے تو میں آپ کی بیٹی نہیں بنوں گی۔“ سمجھے

آپ۔“ اس نے مصنوعی حقیقت سے کہا اور سننے لگی ابا بھی اس کی ہنسی میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ کچھ ہی فاصلے پر کھڑی اماں نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔



”فائزہ! میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش ہوں اتنی خوش ہوں کہ تمہیں بتا بھی نہیں سکتی۔“ وہ اتنی خوش تھی کہ اگر نہ بھی بتاتی تو بھی فائزہ کو بتا چل جاتا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے، اس کی باتوں سے، اس کے لہجے سے، اس کے ایک ایک انداز سے۔

”ہاں۔ وہ تو مجھے بتا چل ہی رہا ہے۔ محترمہ خوشی کے بارے میں کتنے کو تیار ہیں۔“

نانہ کے اینول پیپر ز ہونے میں صرف ایک ڈیڑھ ماہ ہی رہ گیا ہے۔ پہلے ہی تمہاری اتنی طول چھیٹیوں سے تمہاری بڑھائی کا بہت لوٹس ہوا ہے۔“

”ہاں ان شاء اللہ بس آج کل میں جوائن کر لوں

گی۔“

”تو چلو پھر تمہارے ری جوائن کرنے کی خوشی میں مٹھائی ہو جائے۔“ فائزہ نے جانے کہاں سے ایک مٹھائی کا ڈبہ برآمد کیا اور اس کے سامنے رکھا۔

”میرے ری جوائن کرنے کی خوشی میں؟“ ساجدہ نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جج جج بتاؤ یہ مٹھائی کس سلسلے میں ہے؟“

فائزہ نے شرانے کی ایکٹنگ کی۔ ”یہ بات میں نہیں بتا سکتی۔ تم امی سے جا کر پوچھو۔ کیونکہ میں۔“ اس نے دوپٹے کا کونہ منہ میں دبایا۔ ”میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ۔“ ساجدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا رشتہ طے ہو گیا ہے؟“

”میرے ساتھ رہ کر کافی عقل مند ہو گئی ہو۔“ فائزہ نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

”فائزہ کی بیٹی! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

”کیسے بتاتی۔ تم اور تمہارے گھر والے تو سونیالی بی کے گھر سے بھاگ جانے کے سوگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔“

”اچھا خیر۔ جلدی سے بتاؤ وہ کون ہے کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟“

اور فائزہ مسکراتے ہوئے اسے اپنا رشتہ پکا ہو جانے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی۔



ابا نے باضابطہ طور پر محبوب حسین اور اس کے گھر والوں کو رشتہ توڑنے کا عندیہ دے دیا تھا جس پر محبوب حسین اور اس کے گھر والوں نے خاصا برا مانا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ گھٹیا اور بیچ لوگ ہی اپنی زبان دے کر پھر اس سے مکر جاتے ہیں۔

ثریا کیا اور سراب نے بھی اس پر خاصا اعتراض کیا تھا۔ سراب کا کہنا تھا کہ سونیا کے اس لڑکے کے ساتھ گھر سے فرار ہونے پر پہلے ہی خاندان اور محلے والے



ہم پر باتیں بنارہے ہیں اب ملے کیا ہوا رشتہ توڑ دینے سے ان لوگوں کو مزید باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن اب ان سب اعتراضات کو مسترد کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ غلط فیصلے کا احساس کسی بھی موقع پر ہو جائے تو اپنے فیصلے کو بدل لینا چاہیے اسے اتنا یا عزت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔

سونا کا ذکر کرتا اور اس کے بارے میں بات کرتا وہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن ساجدہ نے انہیں کئی بار چھپ چھپ کر کمرے میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اماں اگرچہ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن ان کی افسردگی بھی صاف نظر آتی تھی۔ سونیا واقعی بہت بد نصیب تھی جو اتنی محبتوں کو اپنے پاؤں تلے روند کر چلی گئی تھی۔

ساجدہ کے نائنٹھ میں ٹائم تھوڑا ہونے کی وجہ سے زیادہ اچھے مارکس نہیں آئے تھے لیکن میٹرک میں اس نے بی جان سے محنت کی تھی۔

اور جب رزلٹ آیا تو اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ اس نے A گریڈ میں میٹرک پاس کیا تھا اور کلاس میں اس کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔

ان ہی دنوں فائزہ کی شادی کا ہنگامہ جاگ۔ اس نے فائزہ کی شادی میں بھرپور شرکت کی۔ شادی کی تقریب میں شرکت کے دوران کچھ لوگوں نے پھر اس کی بد صورتی کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی لیکن ساجدہ نے بہت اچھے طریقے سے انہیں ہینڈل کیا۔ اسے اب اپنی بد صورتی پر کسی قسم کی شرمندگی نہیں تھی۔ جو چیز اپنے بس میں نہ ہو اس پر غور کرنا یا پھر شرمندہ ہونا زیب نہیں دیتا۔

فائزہ کا شوہر فراز امریکہ میں کسی اچھے عہدے پر جاب کرتا تھا۔ کچھ روز پاکستان میں رہنے کے بعد فائزہ اپنے ہینڈل کے ساتھ امریکہ جاری تھی۔ ساجدہ انہیں ایئر پورٹ پر سی آف کرنے آئی تھی۔ وہ بہت اداس تھی۔ یہ خیال ہی اسے پریشان کر دیتا تھا کہ اسے اب فائزہ کے بغیر رہنا ہو گا۔

”یہ کیسا سوکھی المی جیسی منہ بنایا ہوا ہے تم نے۔“

ایسا لگ رہا ہے جیسے میں ملک چھوڑ کر نہیں جا رہی۔ دنیا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ فائزہ نے منہ بنایا۔ اس نے بیز اور نی پنگ کلر کے کبھی نیشن کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”اللہ نہ کرے۔“ ساجدہ نے بے اختیار کہا اور گھور کر اسے دیکھا۔ ”یہ تم کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔“ ”اچھا یہ سب چھوڑ دو لیے تم نے مجھے اچھے مارکس میٹرک میں لیے ہیں تم پر۔ ایک ٹریٹ ڈیو ہے۔ یہ تو میں شادی کی مصروفیات کی وجہ سے تم سے ٹریٹ نہیں لے سکی۔ جیسے ہی میں دوبارہ پاکستان آئی سب سے پہلے تم سے ایک زبردست سی ٹریٹ لوں گی۔“ فائزہ نے برجوش لہجے میں کہا۔

”میرے میٹرک میں اچھے مارکس تمہاری وجہ سے آئے ہیں۔ اگر تم بدھائی میں میری مدد نہ کرتیں تو میں کبھی بھی اچھے مارکس نہ لے سکتی۔ تم نے میری جتنی مدد کی ہے میں اس کا بدلہ نہیں دے سکتی۔“

”کم آن۔ دوستوں میں اس قسم کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ میں نے اپنے حصے کا بایا ہے اس دنیا میں ہر شخص کو اپنے حصے کا بایا ضرور جلاتا چاہیے کیونکہ ایک دیے سے پھر دوسرے دیے جلیں گے اور یوں روشنی بڑھتی جائے گی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس دنیا میں بہت اندھیرا ہے ہمیں اس اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے اپنے اپنے حصے کا بایا ضرور جلاتا چاہیے۔“ ساجدہ نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”ہائے گرلز!“ فراز بھائی جو سی آف کرنے آئے والے اپنے دوسرے دوستوں اور رشتہ داروں کے درمیان کھڑے ہوئے تھے ان کے پاس آئے۔

”یہ دیا جلائے کی کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ ”ہے ہماری ایک پرسل بات۔ آپ کو کیوں بتائیں۔“ فائزہ نے شوخی سے کہا۔

”فراز بھائی!“ ساجدہ نے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ نے میری دوست کا بہت خیال

رکھا ہے۔ میری دوست لاکھوں میں ایک ہے۔“ ”آپ کی پہلی بات پر میں ضرور عمل کروں گا۔ لیکن آپ کی دوسری بات سے مجھے اختلاف ہے۔“ ان کی سنجیدگی سے کسی نئی بات پر فائزہ نے جھکی اور ساجدہ نے حیرت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”وہ کیوں؟“ ساجدہ نے پوچھا۔ ”آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ کی دوست لاکھوں میں ایک ہے آپ کی دوست تو۔“ انہوں نے رک کر فائزہ کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی دوست تو کروڑوں میں ایک ہے۔“

ساجدہ کھلکھلائی۔ ”بہت اچھے!“ تھوڑی دیر بعد جہان کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

”اپنا حوصلہ بلند رکھنا۔ ابھی تم نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہے لیکن تمہیں بہت آگے جانا ہے۔“ فائزہ نے سرگوشی کی۔

”تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ مجھے فون ضرور کرتی رہنا۔“ ساجدہ نے غم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کچھ دیر بعد جہان فضا میں بلند ہو گیا۔ ساجدہ اسے بہت دیر تک اور بہت دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

\*\*\*

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تنہا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری صبح کی ٹھنڈی شیشی اور مست خرام ہوا میں بچے ایک آواز ہو کر گاتے ہوئے نکلنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہ جب بھی ان بولوں کو سنتی تھی بے خود ہو جاتی تھی۔

کتنے پیارے الفاظ تھے یہ اور کتنی خوبصورت دعا تھی یہ اگر انسان شمع کی مانند ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ لگے جو خود تو جلتی رہتی ہے لیکن دوسروں کو روشنی

دیتی ہے۔ خود کو فنا کر کے دوسروں کو زندگی دیتا۔ دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے کاش ہر شخص ہی سوچنے لگے اور یہی کرنے لگے تو کتنا اچھا ہو۔ اس نے سر سے اڑتے آپٹل کو سر پر اچھی طرح جماتے ہوئے سوچا۔

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت جس طرح پھول سے ہوتی ہے جن کی زینت بننے پر سورس ٹرینس گارے تھے۔ ان کے چہرے پر جوش اور آنکھوں سے جذبہ عیاں تھا۔

جو کام دل سے اور جذبے سے کیا جائے کسی میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اس نے یہ بات بار بار بچوں کو سمجھائی تھی۔

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا بچے بہت محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی

آئیڈیل تھی۔ وہ ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کرتی تھی۔ وہ انہیں امن کا، محبت کا، دوستی کا، خودداری کا درس دیتی تھی وہ انہیں غریبوں کی مدد کرنے پر اسکاٹی تھی۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو نیک جو راہ ہو اسی راہ پر چلانا مجھ کو ”آمین۔“ اس نے ذریعہ آئین کہا اور ساتھ ہی تمام نیچے ز اور بچوں نے بھی آہستگی سے آمین کہا تمام نیچے بالکل خاموش اور مودب کھڑی تھیں۔

تمام اسٹوڈنٹس اور نیچے ایک نظم و ضبط سے اپنی اپنی کلاسز کی طرف بڑھنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسکول کا صحن خالی ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر وہیں رک کر اسکول کی عمارت اور اس کے سرسبز لان میں کھلے خوبصورت اور خوش رنگ پھولوں کو دیکھتی رہی۔ وہ جب بھی اپنے اسکول کو دیکھتی تھی اسے ایک طمانیت اور سرشاری کا احساس ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر وہیں رک کر وہ اپنے آفس میں آگئی اور وہاں پر کچھ فائلز وغیرہ چیک کرنے لگی۔



”اماں! مجھے بھی اس اسکول میں داخل کروا دیں۔“ ایک شرارتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اس نے اپنے آفس کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک چودہ پندرہ سال کی لڑکی ایک درمیانی عمر کے ساتھ لکیری میں کھڑی تھیں۔

”دامخ خراب ہو گیا ہے تیرا۔ تیری عمر ہو گئی ہے اب اسکول میں پڑھنے کی۔ اور مجھے داخل کرے گا لون اس اسکول میں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے درمیان اتنی بڑی لڑکی پڑھتی ہوئی! پچھی لگے گی بھلا۔“ اس کی اماں کی آواز غصے سے لبریز تھی۔

”اماں! آپ بات تو کریں۔ ہو سکتا ہے مان جائیں۔“ اس کی آواز میں آس تھی۔

”میرا دامخ خراب نہ کر۔ اور مجھے داخل کرایا تو تھا میں نے اسکول میں خود ہی تو تیرا پڑھنے میں دل نہیں لگنا تھا۔ ہر وقت تو تیری استائیاں تیری شکایتیں لگاتی تھیں۔“

”اماں! وہ تو خود ہی صحیح طریقے سے نہیں پڑھاتی تھیں۔ مارتی بھی بہت تھیں۔“

ان دونوں کی بحث طویل پکڑتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آفس سے نکل کر ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دونوں ہی باتیں کرتے کرتے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

اس نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ گہری سائولی رنگت اور موٹے بھدے نقوش کی حامل لڑکی اسے اپنی طرف ایسے دیکھتے یا کر کچھ گڑبڑا سی گئی۔ اس کی اماں کی آنکھوں میں شناسائی کا رنگ ابھرا۔

”اے میڈم جی! آپ؟ آپ تو اس اسکول کی بڑی میڈم ہونا؟“ اس عورت نے مرعوبیت سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ابھی آپ دونوں کسی بات پر بحث کر رہی تھیں غالباً۔“

”نہیں جی۔ بحث تو نہیں بس ایسے ہی۔“ وہ عورت گڑبڑا گئی۔ ”دراصل میری بیٹی تادیہ اس اسکول میں پڑھتی ہے اس کی ٹیچر نے بلایا ہے مجھے۔ کہہ رہی تھی کہ کوئی ضروری بات گئی ہے اس نے مجھ سے اس

کی پڑھائی کے سلسلے میں۔ بس اسی لیے آئی ہوں۔“ اس نے بات کو دوسری طرف موڑا۔

”اور یہ۔ یہ بھی آپ کی بیٹی ہے؟“ اس نے اس کم رو اور شرمیلی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں جی۔ یہ تادیہ سے بڑی ہے۔ ساجدہ نام ہے اس کا۔ سلام کر رہی میڈم کو۔“ اس نے ساجدہ نامی اس لڑکی کو ٹھوکا مارا۔

”السلام علیکم! لڑکی نے نظرس جھکا کر کہا۔

”ساجدہ۔“ وہ لمحہ بھر کو ساکت ہو گئی۔ ”آخر یہ تمام ساجدہ امیں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں۔“ اس نے بے اختیار سوچا۔

”وعلیکم السلام! لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”تم۔۔۔ اس اسکول میں پڑھنا چاہتی ہو؟“ اس نے اس لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے کچھ متذبذب سے انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

”جب یہ اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے تو آپ اسے روک کیوں رہی تھیں؟“ اس نے اب کی بار ساجدہ کی ماں سے پوچھا۔

”ظاہر ہے جی! یہ اب اس عمر میں کچی کی میں پڑھتی اچھی لگے گی اور پھر اسے اسکول میں داخل کرے گا کون؟“ عورت نے بنیادی نکتہ اٹھایا۔

”میں۔۔۔ میں کروں گی اسے اس اسکول میں داخل۔“

”آپ؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میں۔ کیونکہ میں اس اسکول کی پرنسپل ہوں۔ آپ یہ بتائیں آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟“ اس نے کہتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی بالوں نگاہوں میں دیے جل اٹھے تھے۔ وہ ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔ دیکھیں یہ میرے ساتھ گھر کا کام کروانی ہے اگر یہ اسکول میں پڑھنے لگے گی تو میرے ساتھ گھر کا کام کون کروائے گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں تو بہت پریشان ہوں

گی۔“

”تو کیا گھر کا کام کروانے کے لیے آپ اسے گھر میں بٹھائے رکھیں گی۔ پڑھنے نہیں دیں گی۔ اور پھر یہ بھی کتنی نا انصافی ہے کہ آپ ایک بیٹی کو تو پڑھا رہی ہیں اور دوسری کو صرف گھر کے کاموں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ کیا آپ کو اپنی اس بیٹی سے پیار نہیں ہے؟“

”نہیں جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے اپنی دونوں بیٹیوں سے پیار ہے۔ بس بات صرف اتنی سی ہے کہ اس کا دامخ پڑھائی میں بہت چلتا ہے اور اس کا اتنا نہیں چلتا۔ پہلے بھی اسے اسکول میں داخل کرایا تھا مگر یہ سب پڑھتی نہیں تھی۔ استائیاں بہت شکایتیں کرتی تھیں اس کی۔“

”ہو سکتا ہے اس اسکول کا ماحول اسے موافق نہ آیا ہو“ اس وجہ سے اس کی مبالغہ نہ ہو سکی ہو، مگر حال یہ سب ضمنی باتیں ہیں۔ آپ کی بیٹی پڑھنا چاہتی ہے۔ اسے پڑھنے کا شوق ہے تو آپ کا اسے یوں روکنا بنتا نہیں ہے۔ آپ کو تو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ آپ آئیے میرے ساتھ میں ابھی اس کا اسکول میں ایڈمیشن کروا دیتی ہوں۔“

لڑکی نے ملتی جلتی نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”اماں! مان جاؤ نا۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔“ اس عورت نے مگر اسانس لیا۔ ”پھر آپ دیکھ لیں کہ اسے کس کلاس میں داخل کرنا ہے، پہلے اسکول سے تو اس نے تیسری کلاس میں چھوڑا تھا۔“

”وہ میں دیکھ لوں گی۔“ اس نے سرشاری سے کہا۔

”اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔ اور میں کے بارے میں بھی۔ یہاں ویسے بھی غریب اسٹوڈنٹس سے ہاف فیس لی جاتی ہے۔“

وہ انہیں لے کر کلاس تھری میں آگئی اور مس نمرو سے اس کا نام رجسٹر میں داخل کرنے کے لیے کہا مس نمرو اس کی عمر اور اس کی قابلیت کے بارے میں معترض نہیں لیکن اس نے ان اعتراضات کو مسترد کر دیا۔

”مس نمرو! اتنا اور قابلیت یقیناً! اہمیت رکھتی ہیں لیکن جہاں بات جوش جذبے اور لگن کی ہو وہاں ان کی حیثیت ضمنی ہو جاتی ہے۔ آپ نے اس لڑکی کا جذبہ اور لگن دیکھی ہے؟ کیا وہ قابل تحسین نہیں ہے؟ میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں، دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ذہانت اور قابلیت سے کہیں زیادہ جذبے اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لڑکی کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یہ اپنی قابلیت بڑھانے کے لیے سخت محنت کرے گی۔ کیوں۔۔۔ کوئی نا محنت؟“ آخری فقرہ اس نے اپنی ہم نام سے مخاطب ہو کر کہا۔

”جی میڈم!“ اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔ ”میں بہت محنت کروں گی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔“ مس نمرو اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔

”مس نمرو! میری طرف دیکھیں۔“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے بھی بہت لیٹ پڑھنا شروع کیا تھا۔ آپ کو پتا ہے تیس چوبیس سال کی عمر میں تو میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ کیا آپ کو مجھ میں کوئی کمی نظر آتی ہے؟“

”نہیں میڈم!“ آپ تو بہت قابل ہیں۔ یو آر ریٹلی آٹائس لیڈی۔“ مس نمرو کے انداز میں چالو سی نہیں تھی صرف عقیدت اور محبت تھی۔

”تو پھر فیصلہ ہو گیا کہ ساجدہ اسی کلاس میں بیٹھے گی؟“

”جی میڈم!“ وہ مسکرائی۔ ”فیصلہ ہو گیا۔“

وہ طمانیت کے احساس سے سرشار اپنے آفس میں واپس آگئی ایک اور ساجدہ کو اس نے تباہ ہونے سے بچالیا تھا۔ لیکن ابھی بہت سی ساجدہ امیں باقی تھیں۔ اس ملک میں بہت اندھیرا تھا۔ لیکن اس اندھیرے کو ختم کرنے کے اس نے اپنے حصے کا دیا جانا تھا۔ اس نے اجالا پھیلانا تھا۔ اس کی نظر کھڑکی سے باہر گٹ کے اوپر لگے ہوئے پورڈر چلی گئی جس پر لکھا ہوا تھا۔

اجالا پبلک اسکول



آج بہت سہانا دن تھا۔ آج اس نے ایک اور اہم سنگ میل عبور کر لیا تھا۔ آج اس نے ایک اور شہر میں اپنے اسکول کی براج کھول لی تھی۔ اس کا خواب تھا کہ پورے ملک میں اس کے اسکول کی براج بن جائیں۔ مظفر گڑھ میں اس کا اسکول کامیاب جا رہا تھا۔ ابھی پچھلے سال اس کے اسکول کے چار پانچ بچوں نے مختلف کلاسز میں بورڈ میں پوزیشن لی تھی۔ مظفر گڑھ کے بعد اب اس کا ارادہ تھا کہ وہ ملتان میں بھی اپنے اسکول کی براج کھولے۔ اس سلسلے میں وہ کچھ عرصے سے کوشش کر رہی تھی۔ ملتان میں ایک پارٹی سے زمین خریدنے کے سلسلے میں اس کی بات تقریباً "فائل ہو گئی تھی لیکن فی الحال اس نے ایک تعمیر شدہ کو بھی کرائے پر لے کر اس پر اسکول کا تمام سیٹ اپ مکمل کر لیا تھا۔ آج اسی سلسلے میں وہ ملتان آئی تھی۔

وہ پارٹی سے بات کر کے نکلی تھی کہ فائزہ کی کال موصول ہوئی۔

"ہیلو۔" اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"ہیلو پر نیل صاحبہ! کیا حال چال ہیں؟" دوسری طرف سے فائزہ کی چسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جی مس امریکہ! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، آج آپ کو تھوڑا ورلڈ کی ایک پسماندہ سی جگہ سے تعلق رکھنے والی ایک پسماندہ سی لڑکی کیسے یاد آگئی؟" ساجدہ نے شوخی سے کہا۔

"نہیں۔ مجھے تو یہ یاد ہر دو تین روز بعد آتی جاتی ہے۔ لیکن آپ جناب تو اتنی مصروف ہو گئی ہیں کہ آپ کو میری یاد ہفتوں بلکہ مہینوں نہیں آتی۔" فائزہ نے شکوہ کیا۔

"یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو بھول گئے ہوں۔ تم تو ہر لمحہ میرے دل کے قریب، میرے ساتھ رہتی ہو۔" ساجدہ نے پورے خلوص دل سے کہا۔

"اچھا اب زیادہ ڈانٹنا کمزور ہونے کی ضرورت نہیں

ہے۔" فائزہ ہنسی۔ "یہ بتاؤ اسکول کیا جا رہا ہے تمہارا؟ سنا ہے بڑی دھومیں ہیں اس کی۔"

"ہاں۔ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اور اللہ کے بعد یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم اگر مجھے پڑھنے پر راغب نہ کر سکتیں تو شاید آج میں اس مقام پر نہ ہوتی۔"

فائزہ کے امریکہ جانے کے بعد اس نے آگے پڑھنے کے لیے کالج میں داخلہ لیا تھا اور وہاں سے فرسٹ کلاس، فرسٹ ڈویژن میں بی اے کرنے کے بعد ہی اس نے اپنا اسکول کھولنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کام میں ابانے اسے بہت سپورٹ کیا تھا بلکہ تقریباً سارا سرمایہ بھی انہوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ چھوٹے پیمانے پر شروع ہونے والا یہ اسکول اب بالی ہول تک پہنچ گیا تھا اور اب اسے اتنی آمدنی ہو رہی تھی کہ وہ دوسرے شہروں میں اس کی براج بننے کھول رہی تھی۔

"بہت پرانی بات ہے یہ اور تمہیں ابھی تک یاد ہے؟ یہ بتاؤ شادی وادی کے بارے میں کیا ارادہ ہے تمہارا؟ سارے بہن بھائیوں کی شادیاں تو ہو گئی ہیں، ہم کب کر رہی ہو؟" فائزہ نے بات بدل دی۔

"میری شادی بھی ہو چکی ہے میرے کام سے۔ اور آج کل کے دور میں ایک ہی شادی کوئی انورڈ کر لے، وہی کافی ہے۔"

"نفسوں باتیں مت کرو، شادی بھی زندگی کا حصہ ہے۔ میں ایک مہینہ بعد پاکستان آ رہی ہوں تمہارا رشتہ لے کر۔ تم خود کو تیار کر لو۔"

"کیسا رشتہ؟ تمہارا بیٹا تو ابھی چھوٹا ہے اور بھائی کوئی ہے ہی نہیں۔"

"اللہ نے مجھے بھائی دے دیا ہے۔ فراز کے بھائی میرے بھی بھائی بن گئے ہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ بچپن میں والد کے انتقال کے بعد بہن بھائیوں کی تعلیم اور شادی کے مسائل حل کرنے میں خود کو بھول گئے۔ اب میں نے یاد دلایا ہے کہ زندگی پر ان کا بھروسہ تھا ہے، ہم بھی اس بارے میں سوچو۔"

"میں یہ سب بعد میں سوچوں گی فی الحال خوش خبری

یہ ہے کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔" فھوڑی دیر اور فائزہ سے بات کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"بی بی! اللہ کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔" وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ میلے چیکٹ کپڑے پہنے، ہل بھرائے ایک بھکارن نے اس کا راستہ روک دیا۔ ساجدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز اسے بہت مانوس سی لگی تھی۔

اسی لمحے اس بھکارن نے بھی اسے غور سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر نہ جانے کیوں وہ بھکارن کئی کئی بار دوسری طرف جانے لگی اس کی چال میں لڑکھٹاہٹ آگئی تھی مگر ساجدہ نے بھاگ کر اس کو پکڑ لیا کیونکہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔

"کیا بات ہے بی بی! امیر یازد کیوں پکڑا ہے تو نے؟" اس بھکارن نے منہ دوسری طرف کیے ہوئے خشک لہجے میں پوچھا۔

"کیونکہ میں تمہیں پہچان چکی ہوں۔ اور بہتر ہے کہ تم مجھے یہ اینٹنگ چھوڑ دو۔" اس نے تنک کر کہا۔ "دیکھو بی بی! ہم بھکاری لوگ ہیں۔ ہمارا تمہارا کیا واسطہ۔" اس نے اپنا یازد چھڑوایا اور دوسری طرف جانے لگی۔

"سونیا! ساجدہ نے تڑپ کر اسے پکارا۔" راستے تو تم نے بہت پہلے ہم سے جدا کر لیے تھے مگر یہ وہ راستہ تو نہیں تھا جس پر تم کسی اور کی انگلی تھام کر چلی تھیں۔ تم تو اپنے خوابوں کی تعمیر پانے لگی تھیں۔ کیا یہی ہے تمہارے خوابوں کی تعبیر؟"

اس کی بات سن کر وہ جاتے جاتے رک گئی۔ ساجدہ اس کے قریب چلی گئی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ ساجدہ نے گھوم کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ رو رہی تھی وہ سونیا ہی تھی مگر سونیا نہیں لگ رہی تھی! اپنی خوبصورتی اور رعنائی سے چاند کو بھی شرمائے والی سونیا اس وقت اپنے تمام رنگ و روپ کو کھوئے ایک بد حال اور بد مست فقیرنی کے روپ میں کھڑی تھی!

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سونہی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL



- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال ہاتھ ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت = 100 روپے

**سونہی ہیر آئل** 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ عوامی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دقتی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے نامی ڈرمنج کر رجسٹرڈ فارسل سے منگوائیں، رجسٹرڈ سے منگوانے والے نامی ڈرمنج حساب سے بھیجائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے  
3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منہ آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر 7، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سونہی ہیر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں  
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر 7، ایم اے جناح روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔  
فون نمبر: 32735021



بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے  
”سونا! آخر یہ سب کیا ہے؟ پلیز مجھے جلدی بتاؤ  
میرا دم گھٹ رہا ہے۔“ ساجدہ کی آنکھوں کی نمی اس  
کے لہجے میں کھل گئی تھی۔

”کیا بتاؤں میں؟“ وہ بولی تو اس کے لہجے میں  
صدیوں کا کرب تھا۔ ”میرے جیسی تاریک اور  
اندھیری راہوں کا سفر کرنے والی لڑکیوں کا انجام بالآخر  
ایسا ہی ہوتا ہے جیسا تمہیں نظر آ رہا ہے۔“  
”مگر تم تو ڈیٹان کے ساتھ گئی تھیں نا جو بقول  
تمہارے بہت امیر کبیر فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر تم  
اس حال میں کیوں ہو؟“

”وہ ایک فراڈ شخص تھا۔ دھوکا دیا ہے اس نے  
مجھے۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”کیا دھوکا؟ پلیز مجھے کھل کر بتاؤ۔“  
”کیا کوئی جان کر۔“ وہ اچانک تھکی تھکی نظر آنے  
لگی۔ ”یہ پوری دنیا ہی دھوکے باز ہے۔ اور تمہیں  
دکھی لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہارے ساتھ  
کون سا اچھا کیا تھا میں نے۔ تمہیں تو۔ تمہیں تو  
خوش ہونا چاہیے مجھے اس حال میں دیکھ کر۔“

”تم پھر دل دکھانے والی بات کر رہی ہو سونا!“ اس  
کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”میں نے تمہارا کب برا  
چاہا ہے؟“

”تم نے میرا برا نہیں چاہا لیکن میں نے خود تو اپنا  
برا چاہا تھا نا۔ دل دکھانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور  
میں نے ہر قدم پر تمہارا دل دکھایا۔ ہر بات پر تمہاری  
تذلیل کی اور اپنے ہاتھوں سے۔“ اس نے برستی  
آنکھوں سے اپنے کھورے اور میلے ہاتھوں کی طرف  
دیکھا۔ ”میں نے ہاتھوں سے خدا کی طرف سے دی ہوئی  
خوبصورتی کو اپنے لیے عذاب بنالیا۔ جانتی ہو۔ ڈیٹان  
کون تھا؟“ وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور اس کی  
طرف دیکھا۔

”ڈیٹان ایک برہہ فروش تھا۔“  
”تم تمہارا مطلب ہے۔“ ساجدہ ہکا بکا رہ گئی۔  
”ہاں۔ وہ لوگ۔ لڑکیوں کو ان کے گھروں سے

بھگا کر ان سے دھندہ کرواتے ہیں اس مقصد کے لیے  
انہوں نے ڈیٹان جیسے کئی جوان اور خوبصورت لڑکے  
رکھے ہوئے تھے جو مختلف قصوں اور شہروں میں  
معصوم لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر ان کے گھروں سے بھگا  
کر لے جاتے تھے اور لاہور میں واقع اپنے اس  
ٹھکانے پر لے جاتے تھے جہاں۔۔۔ ان سے دھندہ کروایا  
جاتا تھا۔ مجھ سے بھی ڈیٹان نے شادی نہیں کی تھی  
وہ غلط انسان مجھے اچھے اور سہانے مستقبل کے  
خواب دکھاتے ہوئے وہیں لے گیا تھا۔“  
ساجدہ کا چہرہ سفید رہ گیا۔ وہ پچھنی پچھنی آنکھوں سے  
سونا کی طرف دیکھنے لگی۔ ”یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی  
ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔۔۔ اس نے دانٹوں  
سے اپنے نچلے ہونٹ کو اتنے زور سے کاٹا کہ اس کے  
ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ ”مجھ جیسے لوگ جو نہ  
عزت کی قدر کرتے ہیں اور نہ محبت کی ان کے پاس نہ  
عزت رہتی ہے اور نہ محبت۔ میں بہت عرصہ وہیں  
رہی۔ وہاں پر مجھ جیسی اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں  
مجبور بے بس اور ان لوگوں کا کہنا سننے پر مجبور۔ ان  
لوگوں کی پہنچ بہت دور تک تھی۔ وہاں اس بنگلے پر  
بڑے بڑے لوگ آتے تھے۔ بڑے بڑے سرکاری  
افسر، بیورو کریٹ، نواب، رئیس۔ وہاں رہتے ہوئے  
ایسا لگتا تھا جیسے میں بیشہ وہیں رہوں گی۔ لیکن پھر اس  
گروہ میں رقم تقسیم کرنے کے معاملے پر تو تکرار ہونے  
لگی اور ان میں پھوٹ پڑ گئی جس کی وجہ سے ان کا ہم  
لڑکیوں پر ہولڈ اور سیکورٹی کم ہونے لگی چنانچہ اسی کا  
فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اور دو اور لڑکیاں وہاں سے  
بھاگ نکلیں۔ وہاں سے چھپ چھپا کر ہم لاہور سے  
ملتان آ گئیں۔ یہاں پر ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ وہ  
لڑکیاں اندرون سندھ کی رہنے والی تھیں وہ وہیں چلی  
گئیں۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنے  
گھر واپس آ جاتی۔ اکیلے عورت کے لیے اس  
معاشرے میں سروائیو کرنا بہت مشکل کام ہے اور تب  
میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسی دوبار پر رہوں گی ان

ملکتوں کے ساتھ جو یہاں رہتے ہیں۔ میں بھی ان  
میں شامل ہو گئی ہوں جو یہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگر  
بھگ مانگنے کا کہتے ہیں تو وہ بھی مانگ لیتی ہوں۔ یہ میری  
سزا ہے اور اب ساری زندگی مجھے اسی سزا کو بھگتنا  
پڑے گی۔“

”وہ میرے خدا!“ ساجدہ نے افسوس کے عالم میں  
اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ”کتنا سمجھا تھا  
ہم نے نہیں۔ کتنا روکا تھا۔ مگر تمہاری سمجھ میں کچھ  
نہیں آیا۔ کاش تم ایسا نہ کرتیں!“  
”مجھ جیسے لوگ کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھتے  
وہ صرف ٹھوک کھا کر ہی سمجھتے ہیں۔ میں بھی ٹھوک کھا  
کر سب کچھ سمجھ چکی ہوں لیکن۔۔۔ اب شاید اس کا  
کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”کیوں فائدہ نہیں ہے۔ سونا! ڈیٹان بھی ختم نہیں  
ہوئی ہے اور مجھے تمہاری بے وقوفی پر حیرت ہو رہی ہے،  
تم جب اس قحبہ خانہ سے فرار ہونے میں کامیاب  
ہو گئی تھیں تو تمہیں سیدھا کھڑا اچھا ہے تھا۔“

”کس منہ سے کھڑا؟ سارے رشتے تو میں ختم  
کر آئی تھی اپنے خاندان کی عزت کو خود اپنے پاؤں  
تے روند کر اب کس برتے پر میں واپس آتی  
میں۔۔۔ تو۔۔۔ اپنے اتنے چاہنے والے باپ کا  
خیال تک نہیں کیا۔“ اس کے ہونٹ کپکپائے۔  
”اس منحوس شخص کی جھوٹی محبت نے میری آنکھوں  
پر ایسی ٹی باندھ دی کہ میں نے ان کی بے مول محبت کو  
پاؤں تلے روند دیا۔ ساجدہ! اب کیسے ہیں؟ اور اماں،  
سر اب بھائی کوئی سب لوگ کیسے ہیں؟“ آخر میں اس  
نے نہایت بے تابی سے پوچھا۔

”سب لوگ ٹھیک ہیں۔ لیکن۔۔۔ اب۔۔۔“ وہ کچھ  
کستے کستے رک گئی۔

”کہا ہوا ہے اباکو؟“ سونا نے بے تابی سے پوچھا۔  
”ان کی دفتہ ہو گئی ہے۔ تمہارے اس اقدام نے  
پچھلے سال گئے ہیں۔“  
”کیا؟ اب چلے گئے ہیں۔“ سونا اپنے سر کو دیوار سے

ٹکرا کر روئے لگی۔ ”کیوں۔ ایسا کیوں ہوا میں تو ان  
سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ میں تو سوچتی تھی  
کہ۔۔۔ کبھی۔۔۔ کبھی ان کے پاس جاؤں گی اور ان  
کے پاؤں پر گر کر ان سے معافی مانگ لوں گی۔“

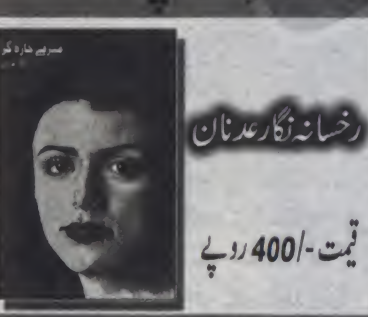
وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ارد گرد کے لوگ اسے  
حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ساجدہ نے بمشکل سمجھا بچھا  
کراسے چپ کروایا۔

”سونا! جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب گزرے وقت کو یاد  
کر کے آنسو بہانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ اب  
آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“ ساجدہ نے  
سنجیدگی سے کہا۔

”میرے سوچنے سے کیا ہو گا۔ تقدیر کے سامنے  
سب سوچیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یہ بات میں  
اچھی طرح جان چکی ہوں۔“ وہ معصوم لہجے میں بولی۔  
”مگر زندگی ایسے نہیں گزرتی جیسے تم گزار رہی ہو تم  
میرے ساتھ گھر چلو۔ اب ہم دونوں مل کر رہیں گی۔“  
ساجدہ اسے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف  
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سیرے چارہ گر



رخسانہ نگار عدنان  
قیمت -/400 روپے

ملکتی عمران ڈائجسٹ  
37، انداز بازار کراچی



”نہیں ساجدہ!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہت مشکل ہے یہ۔ اگر گھر بنی جانا ہو تا تو میں بہت پہلے چلی جاتی اور پھر مجھے وہاں کون قبول کرے گا۔ میں نے خاندان کی عزت داؤ پر لگائی ہے۔ کوئی معاف نہیں کرے گا مجھے۔“

”یہ سب تمہارے اپنے مفروضے ہیں۔ ہم سب لوگ اب بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور اگر کوئی معاف نہ بھی کرے تو بھی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم کسی پر بوجھ نہیں بنو گی۔ تم میرے ساتھ رہو گی۔ سراب بھائی اور نومی دونوں ویسے بھی اپنے علیحدہ گھروں میں رہتے ہیں۔ میں اور امل اپنے الگ گھر میں رہتے ہیں۔“

”لیکن وہ دونوں کیوں علیحدہ رہتے ہیں؟“

”ان کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ سراب بھائی تو خود ہی ایسا چاہتے تھے شاید۔ لیکن نومی بے چارہ ایسا نہیں چاہتا تھا اسے اس کی بیوی نے مجبور کیا ہے خیر جو ہوا سو ہوا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”اور تم نے تم نے شادی نہیں کی؟“ سونیا نے غور سے اسے دیکھا۔

”شادی!“ وہ مسکرائی۔ ”ہاں میں نے بھی کر لی ہے۔ شادی۔“

”اسی سے۔ میرا مطلب ہے۔ محبوب حسین سے؟“

”نہیں۔ اپنے کار سے۔ اپنے نصب العین سے۔“ ساجدہ نے اسے مختصراً ”اپنے اسکول کے بارے میں بتایا۔“

”ساجدہ! تم بہت عظیم ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ برا کیا۔ میں تمہاری راہوں میں کانٹے بچھاتی رہی اور تم میری راہوں میں بچھائے ہوئے کانٹے اٹھا کر ان کو پھولوں سے بھرنا چاہتی ہو۔ کیوں ساجدہ کیوں؟ جانتی ہو لبا کو امل کے جھوٹ کے بارے میں بھی میں نے بتایا تھا کیونکہ میں چاہتی تھی کہ تمہاری شادی محبوب حسین سے ہو جائے اور تم کبھی خوش نہ رہو۔“

سونیا نے مذمت سے اعتراف کیا۔

”بہت پرانی بات ہے یہ۔ اور پرانی باتوں کا بحصول جانا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ تمہیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہو گیا ہے یہی کافی ہے۔“

”ہاں۔ مگر اپنا سب کچھ گنوانے کے بعد۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”جو شخص اپنا سب کچھ گنوا دیتا ہے اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔ تمہیں بھی اپنے ماتنی کو بھلا کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہو گا۔ سونیا! ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہو گا۔“

پھر وہ خوشی سے جھکتے ہوئے بولی۔ ”یہ نئی برانچ تو میرے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی ہے۔ میں اس کے لیے ملتان آئی اور یہاں میری ملاقات میری بہن سے ہو گئی۔ آئی ایم سوہیہی۔ پتا ہے فائزہ مجھ سے کہا کہ رہی تھی؟“ اس نے سونیا کی طرف دیکھا۔

”کیا؟“ سونیا نے پوچھا۔

”وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں اپنے اس نئے اسکول کا انچارج کسے بناؤں گی۔ اس وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے معلوم نہیں ہے لیکن اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں کے انچارج بناؤں گی۔“

”کسے؟“

”اپنی پیاری بہن سونیا کو۔“

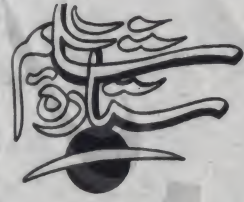
”ساجدہ!“ سونیا حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تم میرے اندھیرے اور تاریک وجود سے اپنے ”اجالا“ کو گمن گوانا چاہتی ہو۔ اتنا آگے کا مت سوچو۔“

”میں نے تو اس سے بھی بہت آگے کا سوچ لیا ہے۔ او چلیں۔“

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سونیا اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس نے اپنی بہن کو کتنا غلط سمجھا تھا۔ وہ اندھیرا نہیں اجالا تھی۔ اندھیری اور تاریک راہوں میں روشنی بکھیرنے والا اجالا!





دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا گلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے، جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرا اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرا چھ مردہ بچوں کو ختم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں دواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت نجی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی ”جنت“ کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم ”اس“ کی یاد اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے، جس کا دعو ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت بی بی فریاد کی مریض ہے، جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی ٹھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

تینہ 14 سال بعد اپنی بی بی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو ”اٹھنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت، انیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی، ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

نبیہہ العباس طبعاً ”خت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے، جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ





پچھیں ڈالو تو ہی اسے منسوب ہے۔ تو ہی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو صہیلہ اب عبید اور نمہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہ، تنوی کا منگیت رہے وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیبہ العباس، ثروت دانیال کی اولاد ہے، جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑا ہوا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلانا بنادیا۔ وہ انبیاء اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بھینٹ، بھن بھائی، فلیسی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انبیاء اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انبیاء پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو بیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

نیارن نے پریمک دانیال، شبیبہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو شبیبہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں شبیبہ دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمدؐ کی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلیق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمدؐ زہرہ کو باور کروانا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر واداد بناے گا۔

”اتفاقاً“ ماوی کا کراؤ شبیبہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود بھٹلا ہٹ میں شبیبہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شبیبہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ شبیبہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے جس پر شبیبہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ شبیبہ اسے گھر لاتی ہیں۔ شبیبہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر ہرجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیبہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور شبیبہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انبیاء دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب شبیبہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان، ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے شبیبہ، ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبید، نمہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبید کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے، وہ عروش کے متعلق ثبوت اٹھا کر ناچا ہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمدؐ، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمدؐ کی ماں پڑوس کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بردھاڑ چا کر دین محمدؐ کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں، بیشک کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سنا تا ہے تو اس رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمدؐ راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمدؐ کے رویے سے جنت کے اندر پینچنے والی مفتی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمدؐ کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمدؐ، جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کو نامی کی ہے۔

ثروت دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر مکے چلی جاتی ہیں۔ انبیاء اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن، ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو چکی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

شبیبہ، ماوی کے سامنے ماضی کے اور اق پلٹی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیبہ العباس، ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ شبیبہ، ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیبہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن شبیبہ کے اس وقت حالات ایسے تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی شبیبہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ شبیبہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کر چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہرہ سے کہا ہے۔

شبیبہ نے کہا کہ ماوی آئرش میٹل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایبیمسی حرکت میں آجائے گی۔ شبیبہ نے ماوی سے کہا، وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جاسکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو شبیبہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔ ماوی بالآخر شبیبہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور شبیبہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیبہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہو گیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کر دیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھیجی سے اس کی شکایت کر دی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیبہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے شبیبہ کی انیکسی پیچھے۔ انبیاء نے انیکسی کی چاپاں ان کے حوالے کر دیں۔ مگر شبیبہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر سرایت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تنیس سے دوستی کر لی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی، جب ہی ایک صبح اسے شبیبہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔

جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماوی کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماوی کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھیجی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنہا ہی ماوی سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔ جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حرم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان، ماوی کی برا سرا کر کشدگی سے پریشان ہیں۔ شبیبہ ان سے کہتی ہیں کہ ماوی پاکستان میں ہی ہے لیکن انبیاء انہیں بتاتی ہے کہ شبیبہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال، ماوی سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیبہ نے اسے وہاں سے نکلے ہوئے دیکھ لیا۔



ماوی دیکھ رہی تھی شبیہ کا رویہ اس کے ساتھ بدلتا جا رہا تھا وہ نہ صرف اس سے بات چیت کرنے لگا تھا بلکہ اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔ ممکن ہے یہ اس کی غلط فہمی ہو لیکن ہرگز نہ دن کے ساتھ اس کا یقین بڑھتا جا رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ شبیہ کے التفات بے جا نہیں تھے لیکن اس کے پاس ایسا کوئی راستہ بھی نہیں تھا جس کے ذریعہ اپنے شک کی نفی کر سکے یا اسے یقین میں بدل سکے۔ لہذا اسے خاموشی سے وقت کے بدلتے ہوئے دھارے کو سمجھنا تھا۔

دوسری جانب وہ خود بڑی مستعدی سے ثبوت تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ شادی کی وجہ سے حویلی میں کام بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ تب ہی اسے تسلی سے بھی بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا کیونکہ دیگر ملازمین کی طرح وہ بھی بے حد مصروف تھی۔ ناچار ماوی کو حالات کے سازگار ہونے کا بھی انتظار کرنا تھا۔

اس روز وہ لان میں بھی بے وجہ ادھر ادھر چکر لگا رہی تھی کہ وقت گزرنے کا کچھ تو سبب بنے۔ ”موسم انجوائے کیا جا رہا ہے۔“

ماوی نے گردن موڑ کر دیکھا شبیہ العباس کرسی کی پشت پر تھیلیاں جمائے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہی سمجھ لیں۔“

گوکہ شبیہ کی موجودگی اسے ناگوار گزری تھی لیکن یہ جتنا کہ وہ ایک نئی مصیبت مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

”کیا میں کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ شبیہ نے چند لمحے کے توقف کے بعد پوچھا تھا۔

”آپ کی حویلی آپ کا لان اور آپ کی ہی میز کرسی یہاں بیٹھنے کے لیے آپ کو میری اجازت کی کیا ضرورت ہے۔“

ماوی نے کندھے اچکا کر لاپرواہی سے کہا۔ شبیہ کے چہرے پہ مسکراہٹ چھب دکھا کر غائب ہو گئی۔

”یہی بات اس رات یقیناً جلال سے کہی ہوگی۔“

شبیہ نے کرسی گھٹک کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ماوی جو ابھی تک اس کے رویہ کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے میں لگی تھی، تڑپ کر بیٹھی۔

”کیا مطلب ہے میں سمجھ نہیں۔“ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اس میں نا سمجھی کی کیا بات ہے۔ سادہ سا سوال ہی تو پوچھا ہے۔“ شبیہ نے مسکرا کر کہا لیکن حقیقتاً اس نے ماوی کے اعتقاد کو ہلکا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن وہ بھی ماوی اٹھی اپنے نام کی طرح متفرد اور ملائی پر اعتماد۔

”کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مجھ سے سیدھے لفظوں میں بات کرو۔“

”ڈن تو تم بہت ہو میں کیسے مان لوں کہ تمہیں میری سمجھ میں نہیں آرہی۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر تم یہاں بیٹھ کر موسم انجوائے کرو میں ہی چلی جاتی ہوں۔“ ماوی نے پلٹتے ہوئے کہا تھا۔

”ضرور جائے۔ لیکن جانے سے پہلے میرے چند سوالوں کا جواب دینا ہی ہو گا۔“ شبیہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔

”میں تمہارے ابا کی ملازمہ نہیں ہوں کہ ہر سوال کا جواب دینے کی پابند رہوں۔“ ماوی نے تڑخ کر کہا۔

”کسی خوش فہمی میں مت رہو۔ ہم ملازم بھی اپنی پسند کے رکھتے ہیں۔“ شبیہ نے ناگوار سی سے کہا تھا۔

”پھر مجھ پر اتنا احسان کس خوشی میں جناب شبیہ العباس بھی صاحب؟“ اس کا انداز بھی کچھ کم فطریہ نہیں تھا۔

شبیہ نے گہری سانس بھری اور گہری ہی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم حویلی کس مقصد سے آئی ہو۔ مجھے اس سے فی الحال کوئی غرض نہیں ہے۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم میرے بھائی کے ساتھ کیا کم کھیل رہی

ہو؟“

ماوی کو ایسے سوال کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ ایک بل کے لیے گڑبڑائی۔

”کس قدر احقانہ سوال ہے۔ میں تمہارے بھائی کے ساتھ کوئی کم کیوں کھیلوں گی میں اتنی دور سے اس لیے نہیں آئی کہ تمہارے بھائی کے ساتھ گیمز کھیلوں۔“ اس نے فطریہ انداز میں کہا۔

”ڈن بڑائی ٹولی اسرارث ماوی! (ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔)“ شبیہ نے چڑکے اور کسی قدر فطریہ انداز میں کہا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو میرے کہنے کا کیا مطلب ہے۔“

”نہیں شبیہ! میں نہیں جانتی تمہارے کہنے کا کیا مطلب ہے۔“

”ٹھیک ہے اگر تم چاہتی ہو میں صاف لفظوں میں بات کروں تو ایسا ہی سہی۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ اس رات جلال کو تم نے اپنے کمرے میں کیوں بلایا تھا۔ آخر ایسا کون سا جھانسا دیا تھا تم نے جلال کو کہ وہ تمہارے کمرے میں آنے پر مجبور ہوا۔“

ماوی چند لمحے کچھ بول نہیں سکی۔ تو گویا اس کا خدشہ درست ثابت ہو ہی گیا کہ کوئی جلال کو اس کے کمرے سے نکلے ہوئے نہ دیکھ لے۔

”اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے شبیہ! اس لیے بہتر ہو گا کہ تم اس معاملے سے دور رہی رہو۔“

”جس معاملے میں میرا بھائی انوالو ہے اس معاملے سے میرا تعلق ہے۔“ شبیہ نے تیز لہجے میں کہا۔

”تو کیا بہتر نہیں ہو گا کہ تم ساری انگواڑی اپنے بھائی سے ہی کرو۔“ ماوی نے اس سے بھی تیز لہجے میں کہا تھا۔

شبیہ بے ساختہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ اصل دقت تو یہی تھی کہ جلال منہ سے کچھ اگنے کو تیار نہیں تھا اور ایسا پہلی بار ہو رہا تھا اور نہ شبیہ کو اس دو ٹوکے کی لڑکی سے بات کرنے کی زحمت گوارا کرتا ہی نہ پڑتی۔

”میرا بھائی بہت معصوم انسان ہے ماوی! اگر تم نے اس کی معصومیت سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی

تو کیا دیکھنا میں بہت برا حشر کروں گا تمہارا۔“ شبیہ نے وائٹ کچکا کر کہا۔

”تم پھر مجھے دھمکا رہے ہو حالانکہ اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کروں گی تو میں وہی جو میرا دل چاہے گا۔“

ماوی نے بے نیازی سے کہا اور ایک طرف سے نکل کر آگے جانے لگی لیکن شبیہ نے اس کا راستہ روکا تھا۔

”ایسا سوچنا بھی مت۔“

”میرے راستے سے نہو شبیہ!“ ماوی نے سرد مہری سے کہا تھا۔

”مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔“

”تم نے بھائی سے مانگو۔“

”وہ کیا کرنے آیا تھا تمہارے کمرے میں۔ یا میں یہ سمجھوں کہ تم ہر کسی کو اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دے دیتی ہو؟“

”سٹ اپ۔“ ماوی بری طرح چٹختی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شبیہ اس طرح کی بات بھی کر سکتا ہے۔

”تم تو میری توقعات سے بھی چھوٹی ذہنیت کے مالک نکلے شبیہ العباس! افسوس تو مجھے تنوی کی قسمت پہ ہو رہا ہے۔“

اب کی بار شبیہ کے تلووں پر لگی سر بر بھیجی تھی۔

”تمہیں تنوی کی قسمت پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“



”کیوں بھئی؟“ ماویٰ نے اطمینان سے کہا۔ ”جو رشتہ تمہارا جلال سے ہے وہی میرا تنوی سے ہے پھر میں تنوی کے لیے پریشان کیوں نہیں ہو سکتی۔“

”کیونکہ تمہیں ایسا کوئی حق نہیں ہے۔“ شبیہ نے سلگ کر کہا۔

”حق کی بات نہ کرو شبیہ العباس! اس حویلی کے ہر راز سے واقف ہو جانتے ہی ہو گے تمہاری داوی اور تم لوگ میرے کون کون سے حقوق غصب کیے بیٹھے ہو۔“ ماویٰ نے طنز سے کہا تھا۔

”غیر میں تم سے زیادہ بات کر کے اپنا موڈ خراب کرنا نہیں کرنا چاہتی۔ میری جوتی سے جو سمجھنا ہے سمجھتے رہو۔“

ماویٰ نے ناک چڑھا کر نخوت سے کہا۔ تیزی سے پٹی اور بڑے بڑے قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

شبیہ کی رگوں میں خون کے ساتھ جیسے شرارے دوڑنے لگے تھے۔

اس کا غصے سے برا حال تھا اور جلال کا برا وقت چل رہا تھا کہ اسی وقت دونوں کی بند بھڑ ہو گئی۔

”تم۔“ شبیہ نے پل بھر سوچا۔ ”پچھا ہوا۔ تم یہیں مل گئے۔ کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ ذرا اسٹڈی میں آنا۔“

”بہت سنجیدہ لگ رہے ہو۔ خیریت تو ہے؟“

”تم آگے تاتاہوں۔“ اس کے اثرات ذرا بھی نہ بدلے تھے۔ جلال کے لیے اتنی مبہم بات سے کوئی بھی اندازہ لگانا زائد مشکل تھا لیکن اتنا تو وہ سمجھ ہی گیا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے دل ہی دل میں اندازے لگا تا وہ اسٹڈی میں آیا۔ شبیہ ایک کرسی پر بیٹھا بعد سنجیدگی سے اس کا مختصر تھا۔

”جی جناب! ارشاد ہو۔“ جلال نے اپنا لب و لہجہ ساہی رکھا تھا یعنی اپنے انداز سے کسی قسم کا تجسس ظاہر نہ ہونے دیا۔

شبیہ نے ابرو اچکا کر پہلے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”بٹل جو پوچھوں گا اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ ٹال مٹول نہیں چاہیے مجھے۔“

”ہوا کیا ہے یا ر!“ جلال نے اچھ کر پوچھا۔

”ماویٰ تمہاری کیسی دوست ہے؟“ اُلی مین از شی یور گرل فرینڈ؟“

جلال پٹٹا گیا اور یہ پٹٹا ہٹ اس کے چہرے پر بھی صاف دکھائی دی تھی۔

”یہ کیا سوال ہے؟ تم جانتے ہو۔“

”میں نے کہا تھا جلال! کوئی ٹال مٹول نہیں۔“ شبیہ نے تیز لہجے میں ٹوکا۔

”ماویٰ میری اچھی دوست ہے شبیہ! گرل فرینڈ نہیں ہے۔“ جلال کو فوری طور اور کچھ نہیں سوچا تو یہی کہہ دیا۔

”تو اپنی اچھی دوست کے کمرے میں تم آدھی رات کو کیا کرنے گئے تھے؟“ شبیہ نے دائیں ٹانگ بائیں پہ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

جلال کا دماغ ٹھک سے اڑ گیا۔

”وہ میں۔ میں وہ دراصل۔“

”وہ میں۔ میں وہ دراصل۔ کیا؟“

”شبیہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔“

”پھر کیسی بات ہے؟ تم سمجھاؤ۔“ شبیہ نے سابقہ انداز میں کہا۔

”ویسے اگر نام پاس کے لیے گئے تھے تو یہی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ شبیہ نے یکدم بینتر ابلتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ جلال نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ لڑکی تو اچھی ہے۔ یعنی پیکنگ تو اچھی لگتی ہے۔“

”شبیہ! کیا فضول بکواس کر رہے ہو۔“

”اس میں فضول تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم تو اس طرح بھڑکے ہو جیسے میں نے اس کے کمرے میں جانے کی اجازت مانگی تھی۔“

جلال بے ساختہ منھیاں سمجھ کر رہ گیا۔ اس کی غیرت پہ تازیانہ پڑا تھا۔ خون رگوں میں ابلنے لگا۔

”ایک شریف لڑکی کے بارے میں تمہیں ایسی بات کرتے ہوئے سوچنا چاہیے۔“ اس نے بہ شکل ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

”وجہ؟“ شبیہ نے کندھے اچکا کر پوچھا۔

”وہ شریف لڑکی ہے شبیہ! ہر کسی کے بارے میں تم اسی طرح منہ پھاڑ کر کچھ بھی کہہ دیتے ہو، کم سے کم کبھی تو سوچا کرو۔“

”میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہی بولتا ہوں۔“ شبیہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سوچ میں یہ رہا ہوں کہ تم اس لڑکی کے بارے میں اتنے ایویشنل کیوں ہو رہے ہو؟ اتنی جذباتیت کا مظاہرہ کیا تو انسان بن کے معاملے میں کرتا ہے! گرل فرینڈ کے معاملے میں۔“

”شبیہ! پلیز! رائے کیا ہم کسی اور ایویشنل بات نہیں کر سکتے؟“

”نہیں۔ کیونکہ مجھے اسی ایویشنل بات کرنا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“

”سیدھی سی بات ہے میں نے تمہیں آدھی رات کے وقت اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو لڑکا لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگتا ہو اس کا ایسی حرکت کرنا غیر معمولی لگتا ہے نا۔ محبت و محبت کا معاملہ ہے تو یہ بھی پتا دو ورنہ اس لڑکی کی شرافت پہ تو میں یوں بھی مشکوک ہوں، کمرے میں بلانے کے پیسے لیے ہیں تب بھی پتا دو تھوڑا بہت میں بھی۔“

”سٹ! شبیہ! تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میری بیوی کے بارے میں اس طرح کی گھٹیا باتیں کرو۔“

جلال نے نیک دم خود پر ضبط کھوتے ہوئے کہا تھا۔ شبیہ گو کہ اس سے کسی بھی قسم کے انکشاف کی توقع کر رہا تھا لیکن اس انکشاف پر ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔

\*\*\*

فیضان عجب الجھن کا شکار تھی۔ حالات کچھ کہہ رہے تھے، شینہ آیا کا بیان کچھ اور تھا جبکہ انہی کی باتیں کسی اور ہی حقیقت کو آشکار کر رہی تھیں بلکہ حقیقت بھی کیا آشکار کرنا تھی بس یوں تھا کہ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

فیضان بھول گئے کہ پاکستان کس کام سے آئے تھے، انہیں صرف ماویٰ کی تلاش تھی جس کے بارے میں سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

دوسری جانب شینہ آیا کا رویہ بھی حیران کن تھا۔ وہ ماویٰ کے لیے پریشانی کا اظہار کر رہی تھیں لیکن یہ پریشانی اس حد تک نہیں تھی جس کی توقع کسی کشیدہ بیٹی کی ماں سے کی جاسکتی ہے۔ گویا سراغ کم تھے سوال اور انجھنیں



تمام تر پریشانیوں کے باوجود کاروباری معاملات میں دلچسپی لینا ان کی مجبوری تھی۔ سو صبح کے نکلے شام چھ بجے واپس آئے تھے۔ خدا معلوم انہیں کوان کی آمدورفت کے اوقات کار کی خبر کیسے ہو جاتی تھی جب تک وہ فریٹس ہو کر باہر آئے انہیں ملازمہ کے ہاتھ کافی اور اسمینکس بھجوا چکی تھیں۔ فیضان کی بھوک جاگ اٹھی، دل نہ ہونے کے باوجود انہوں نے رغبت سے کھایا پھر جب تنہا بیٹھ کر اوٹ پٹانگ خیال ستانے لگے تو کافی کاک لے کر باہر نکل آئے۔

شام کے آسمان پر پرندوں کی قطاریں گزر رہی تھیں۔ پودوں سے لگراتی ہوئی ہوا میں ٹانوس لیکن بھلی سی خوشبو کا احساس رہا تھا۔

فیضان نے نہ کھا، انہیں مگن سی اپنے لان میں پانی دے رہی تھی۔ فیضان بے ساختہ یک ٹک اسے دیکھنے لگے۔ ہلکے زرد رنگ کے لباس میں وہ نوخیز کلی سی محسوس ہوئی تھی۔ اپنے کندھوں تک آتے بالوں کو ڈھیلے سے جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ ہوا سے کچھ لٹیں بار بار ہرے کے اطراف میں بکھر جاتیں تو وہ انہیں بیزار سی سے کانوں کے پیچھے اڑس لیتی۔

فیضان اسے بے خودی سے دیکھتے رہے، وہ خود ان کے رستے میں آئی تھی۔ کوئی سطحی سی ذہنیت رکھنے والے مرد ہوتے تو فائدہ اٹھانے میں ذرا سادقت بھی ضائع نہ کرتے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ ایسے ہرگز نہ تھے۔ زندگی نے جب بھی موقع دیا، کئی کترا کر بچ نکلے تھے۔ اب بھی یہی کیا۔ اس سے قبل کہ دل کسی ضد پر آمادہ ہوتا، انہوں نے نظریں ہی پھیر لیں مبادا کسی ضدی بچے کی طرح جھلنے دل کو ٹالنے کا حوصلہ نہ رہے۔

واپس ملنے کا ارادہ کر رہی رہے تھے کہ انہیں کی نظر ان پر پڑ گئی۔ نظریں ملتے ہی وہ خفیف سا مسکرائی اور پانی کا پائپ احتیاط سے لیاری میں رکھ کر ان کی طرف آئی۔

”ماوی! کچھ پتا چلا؟“ اس نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ فیضان نے مایوسی سے نفی میں سر ہلادیا۔

”اوہ!“ انہیں بھی مایوس ہوئی پھر بولی۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا، ٹیمینہ آئی ہے پوچھیں۔“

”پوچھا ہے لیکن ان کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ خود پریشان ہیں۔“ دل میں بہت سے خدشات ہونے کے باوجود انہیں بہن کی پوزیشن تو کاہنہ کرنا ہی تھی سو کہہ دیا۔

”عجیب بات ہے۔“ انہیں نے کہا۔ ”ٹیمینہ آئی نے تو مجھ سے خود کہا تھا کہ ماوی ڈھلن جا چکی ہے۔“ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک بات کہوں؟“

”ضرور۔ لیکن ایسی کیا بات ہے جس کے لیے بطور خاص اجازت لیتا رہے۔“

”ذرا صل میں خود ماوی کے لیے بہت فکر مند ہوں، اسی لیے مجھے یہ خیال آیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔“ انہیں نے کہا۔

”آپ خود سوچیں، ایک ہی وقت میں ٹیمینہ آئی مجھے کچھ بتاتی ہیں اور آپ کو کچھ اور۔ کیا یہ حیران کن بات نہیں ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ جان بوجھ کر کوئی بات چھپا رہی ہیں۔“

فیضان چند منٹ متفکر سے خاموش رہے۔ یہی حیران کن بات تھی کہ یہی خیال ایک وقت ان کے اور انہیں کے دماغ میں آ رہا تھا۔

”لیکن سوال تو یہ بھی ہے کہ ٹیمینہ آیا کیوں چھپائیں گی۔ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جسے چھپانا پڑے۔“

”اب اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی، آپ کی بہن ہیں وہ۔ اور آپ انہیں بہر حال مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ میرے دل میں وہم سا آ رہا تھا تو میں نے اظہار کر دیا۔ باقی میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ انہیں نے دامن

بجاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں بے دھیانی میں ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے ہوا پہلے کی نسبت تیز ہو گئی تھی اور انہیں کے پال تیزی سے بکھیر رہی تھی۔

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ ماوی جہاں بھی ہوگی خیریت سے ہوگی۔ لیکن میرا خیال ہے، آپ کو اس سلسلے میں پولیس سے بھی مدد لینا چاہیے۔“ انہیں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ماوی کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج کروادینا چاہیے۔“

دونوں کچھ دیر خاموش رہے پھر انہیں نے کہا۔

”آپ ڈر نہیں کیا کھانا چاہیں گے۔ مجھے بتادیں میں بنا کر شازیہ کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔“

”میرے لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے جو سب کے لیے بنے گا، میں وہی کھالوں گا۔“

”اور اگر آج سب کے لیے کھانا نہ بنا تو۔۔“

فیضان ہنس دیے۔

”تب بھی کوئی فکر کی بات نہیں، میں باہر سے جا کر کھالوں گا۔“

”خیر! اب اتنے بے مروت تو نہیں ہیں ہم کہ چار دن آپ کی مہمان داری بھی نہ کر سکیں۔“ انہیں نے شرارت سے ہنس کر کہا تھا۔ فیضان بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگے، اتنی دلکش ہنسی تھی جو انہیں کسی اور کی یاد دلاتی تھی۔ انہیں اپنے ہوا سے چہرے نہ بکھرتے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ فیضان کا دل چاہا اس کی کانوں کے پیچھے بال لے جاتی انگلیاں تھام کر اسے روک دیں اور اسے بتائیں، وہ اس طرح بکھرے بالوں کے ساتھ کتنی دلکش لگتی ہے۔ لیکن آج تک انہوں نے دل کی کب مانی تھی جواب اس کی فرمائشوں پہ کان دھرتے۔

”کیا ہوا؟“ انہیں نے ان کی نظروں کے ارتکا ز پر خفیف سا ہوتے ہوئے پوچھا۔ فیضان نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ آہستگی سے نفی میں سر ہلادیا۔

”جتنا نہیں جانتے تو اور بات ہے ورنہ میں جانتی ہوں، کچھ تو ہے جو آپ چھپا رہے ہیں۔“

فیضان بے ساختہ ہنس دیے۔

”تمہاری ہنسی نے کسی اور کی یاد دلا دی تھی۔“

انہیں کے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ پھکی مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی۔

”ایک بات تو بتائیں۔ کیا بہت خوبصورت تھی وہ؟“ اس نے جھجک بلالائے طاق رکھتے ہوئے پوچھا۔ جب دیر تک کوئی جواب موصول نہ ہوا تو گردن موڑ کر جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”پتا نہیں۔ اتنی برائی بات ہے کہ اب تو مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔“

”یہ تو خیر آپ مجھے ٹال رہے ہیں۔ ورنہ انسان اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتا۔“

”تو کیا میں امید رکھوں کہ تم جی مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی؟“ فیضان کے لبوں سے بے ساختہ پھسل گیا اگلے ہی لمحے وہ کہہ کر چپچٹائے۔ انہیں کے چہرے پر سایہ سالہا گیا تھا۔

”آتم سو رہی انہیں امیرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ۔“ فیضان نے فوراً وضاحتی لہجے میں کہا تھا۔

”آپ کے کہنے کا جو بھی مطلب تھا میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ سچ جج میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ بھی مجھے یاد رکھیں۔ کیا آپ مجھے یاد رکھیں گے؟“ اس نے بہت آس سے پوچھا تھا۔

”مجھے کچھ کام ہے انہیں! میں چلتا ہوں۔“ فیضان نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ انداز ایسا تھیں جیسے بہت جلدی میں ہوں اور اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔



”کم سے کم اس بار تو میرے سوال کا جواب دیتے جائیں۔“ انبیاء نے بغیر پلٹے التجا کی تھی۔  
 ”تم جانتی ہو انبیاء! تمہاری اور میری عمولوں میں کتنا فرق ہے؟“ فیضان نے تیزی سے پوچھا۔  
 ”چند سال چار مہینے تین دن۔“ انبیاء نے سرعت سے کہا۔  
 ”تین۔ اٹھارہ سال چار مہینے تین دن۔“ فیضان کے لہجے میں جھلپ تھی۔ ”وانیال بھائی سے کچھ ہی سال چھوٹا ہوں گا۔“

”اور آپ کو خود سے اتنی چھوٹی عمر کی لڑکی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ انبیاء نے تیزی سے ان کا جملہ اچک لیا تھا۔  
 ”یہی کہتا تھا آپ نے ماوی سے؟ کتنی عجیب بات ہے نا۔ میں نے اپنی اور آپ کی عمول کا حساب اس لیے رکھا کیونکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں لیکن جب آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو آپ اتنا حساب کتاب کس لیے رکھے ہوئے ہیں؟“

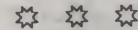
فیضان بجا طور پر لا جواب ہوئے تھے۔ یہ تو انہوں نے خود بھی نہیں سوچا تھا۔  
 ”حیران ہو رہے ہیں نا کہ آپ کو یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ میں بتاؤں؟۔۔۔ کیونکہ آپ کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں میرا خیال موجود ہے جسے آپ جھٹکتے رہتے ہیں اور خود سے بھی اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔“  
 اتنا حقیقت پسندانہ جزیہ تھا کہ فیضان اس بار بھی کچھ نہ بول سکے۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ حاکم ہوا تھا۔

”کچھ تو کہیں۔ اور کچھ نہیں تو میری غلط فہمی دور کر دیں۔“ اس طویل ہوتی خاموشی کو انبیاء نے ہی توڑا تھا۔  
 ”یہ دقتی کشش ہے انبیاء! اور کچھ نہیں۔“ فیضان نے کہا۔  
 ”وانیال بھائی بتا رہے تھے انہوں نے تمہارے لیے کوئی لڑکا دیکھا ہے۔ بہت تعریف کر رہے تھے اس کی۔ میں دعا کروں گا تمہارا لائف پارٹنر تمہیں بہت خوش رکھے۔ جب میں تمہارے سامنے نہیں ہوں گا تو تمہیں یاد بھی نہیں رہوں گا۔ تم بہت آرام سے مجھے بھول جاؤ گی۔“ فیضان دوسری سمت میں دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کے بول رہے تھے۔

”کیا آپ زریں کو بھول چکے ہیں؟ اتنے سال گزرنے کے بعد کیا آپ انہیں یاد نہیں کرتے؟ کیا آپ کی ان سے محبت دقتی کشش تھی؟“ انبیاء نے تیز لہجے میں ان کی بات قطع کی۔

”آپ کہہ رہے ہیں میں آرام سے آپ کو بھول جاؤں گی اور۔۔۔ اور پھر ساری زندگی ایک کم عمر لڑکے کے چہرے میں آپ کا چہرہ تلاش کرتی رہوں گی ٹھیک ویسے ہی جیسے آپ میرے چہرے میں زریں کا چہرہ تلاش کرتے ہیں۔“ انبیاء بولتے ہوئے جیسے ہانپنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کئی بھی دکھائی دیتی تھی۔  
 فیضان اس کے رد عمل پر ہکا بکا رہ گئے تھے۔

”انبیاء! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“ انہوں نے کہا چاہا۔  
 ”آپ کا کبھی بھی وہ مطلب نہیں ہوتا جو اتفاق سے آپ کہنا چاہتے ہیں۔“ انبیاء کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔  
 ”لیکن آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ میری فیملنگز کو دقتی کشش قرار دیں۔ آپ کو صرف اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، میرے بارے میں نہیں۔ ماوی ٹھیک کہتی تھی آپ سے محبت کرنا پھر سے سر بھوڑنے کے برابر ہے۔“ اس نے کہا اور آنکھوں میں آنسو لیے تیز قدموں سے اپنے پورشن کی طرف چلی گئی۔ فیضان اپنے لفظوں پر شرمندہ تھے کہ بہر حال اسے دکھ دینا تو ان کا مقصد نہیں تھا وہ اسے روکنا چاہتے تھے لیکن ہر بار کی طرح انہوں نے دیر کر دی تھی۔ پتا نہیں اپنی زندگی کے ہر اہم معاملے میں وہ اسی طرح دیر کیوں کر دیتے تھے۔



”سٹ اپ شبیہ! تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ میری بیوی کے بارے میں اس طرح کی گھنپا باتیں کرو۔“ جلال نے ایک دم خود پر ضبط کھوئے ہوئے کہا تھا۔ شبیہ کو کہ اس سے کسی بھی قسم کے انکشاف کی توقع کر رہا تھا لیکن اس انکشاف پر ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”یہ کیا مذاق ہے جلال! چند منٹ کے بعد جب بے یقینی کا جھٹکا ذرا ہلکا ہوا تو شبیہ نے کہا۔  
 ”مذاق نہیں ہے۔ میں سو فیصد سنجیدہ ہوں۔“ جلال نے نظریں چراگتے ہوئے کہا۔ جذباتیت میں حقیقت تو اگل گیا تھا لیکن پچھتاہمی رہا تھا کہ اتنی جلدی اس راز میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے تھا۔  
 ”میں نے انگلینڈ جانے سے پہلے ماوی سے نکاح کر لیا تھا۔ سوچا تھا مناسب وقت آنے پر سب کو بتا دوں گا۔“  
 ”لیکن سب ہوا کیسے؟ تم تو کہتے تھے وہ تمہاری صرف اچھی دوست ہے۔“

”ہاں کہتا تھا۔“ جلال نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ دوستی کب محبت میں بدل گئی مجھے خود بھی پتا نہیں چلا۔“

”اس محبت کے مرض میں صرف تم مبتلا ہوئے ہو یا وہ لڑکی بھی ایسا کوئی دعو کرتی ہے؟“  
 ”ظاہر ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تب ہی تو بات نکاح تک پہنچی ورنہ ایک طرف محبت میں معاملات اتنا نہیں بڑھتے۔“

”محبت۔“ شبیہ نے زہر خند کیا۔ ”یہ لفظ مجھے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب ہمارے بزرگوں کے بزرگ بھی ہماری عمول کے ہوں گے کسی زمانہ ایسے کسی جذبے کا کوئی وجود نہیں ہے۔“  
 ”تم نے اس جذبے کی خوبصورتی کو کبھی محسوس نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کسی دوسرے کی فیملنگز کو بے کار سمجھو۔ میں ماوی سے اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میرے لیے اتنا جانا کافی ہے۔“  
 ”یعنی میرا ٹھیک صحیح نکلا۔ اس لڑکی نے حویلی میں آنے کے لیے تمہیں مہو بنایا ہے۔“ شبیہ نے نخوت سے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس بے چاری کو تو پتا بھی نہیں تھا کہ ہمارے درمیان اتنی قریبی رشتہ داری نکل آئے گی۔“

”یہی بے ٹکی باتوں پر شاید اسے یقین آسکتا ہے جس کی آنکھوں پر نام نہاد محبت کی پٹی بندھی ہو۔ مجھے تو بہر حال اس لڑکی کی کسی بات کا بھروسہ نہیں ہے۔“ شبیہ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

”تمنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی شبیہ!۔“  
 ”اور اتنی خوش گمانی بھی اچھی نہیں ہوتی۔“ شبیہ نے دہرایا۔ ”تمہیں اس سے محتاط رہنا چاہیے۔“  
 ”اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مجھے ماوی پر پورا بھروسہ ہے۔“ اس کے لہجے میں یقین بولتا تھا۔  
 ”تو تو بالکل ہے جلال!“

”نہیں پاگل نہیں ہوں۔ تمہیں کبھی محبت نہیں ہوئی نا، اس لیے تم نہیں سمجھ سکتے۔ جس سے محبت ہونا شبیہ! اس کی ہر بات پر یقین کر لینے کو دل چاہتا ہے۔“

”ظاہر ہے۔ عقل جو ساتھ نہیں رہتی۔“ شبیہ نے چڑکے کہا۔ جلال بے وجہ ہنس دیا۔ شبیہ کی جان اور جل کر خاک ہوئی۔  
 ”بہر حال میں تو مشورہ ہی دے سکتا ہوں، اس لڑکی سے محتاط رہو۔ مجھے اس لڑکی کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔“

”میں نے سوچا تھا ابھی اس بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن اب تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو اس بات کو



اپنے تک ہی رکھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ حالات سازگار ہونے سے پہلے کسی کو بھی میرے اور ماویٰ کے متعلق پتا چلے۔“ جلال نے تعاون چاہنے والے انداز میں کہا، اس کے بعد شبیہ نے کہا جواب دیا۔ یہ تو پتا نہیں لیکن یہ ضرور ہوا تھا کہ نیم وادروازے کے باہر کھڑی تنوی کی آنکھوں میں اس نئی اطلاع سے چمک سی دوڑ گئی تھی۔ وہ فی الفور یہ خبر حرم اور نمل کو دیتے بھاگی تھی۔



”کیا! حرم اور نمل کے منہ بے ساختہ نکلا تھا۔ نمل کی آنکھیں تو باقاعدہ حیرت اور بے یقینی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ تنوی نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

”اوہو۔۔۔ آہستہ تو بولیں۔ میرے کان بھڑک گئے کیا؟“ اس نے ناگواری سے کہا۔

”تم نے بات ہی ایسی بتائی ہے کہ ہم اپنا راز ایکشن چھپا ہی نہیں پارہے۔“ نمل نے تعجب کے زیر اثر کہا۔

”تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہوگی تنوی!“ حرم نے کہا۔ ”میرا دل تو سچی بات ہے یہ بات ہی نہیں مان رہا کہ جلال اور ماویٰ کا نکاح ہو سکتا ہے۔“ وہ مستقل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ تنوی نے آنکھیں پھیلا کر صدمے کی کیفیت میں پوچھا۔ ”بھئی۔ میں اپنے کانوں سے شبیہ اور جلال بھائی کی باتیں سن کر آ رہی ہوں آپ کانوں سے غلط نہیں ہو سکتی نا۔“

”درست۔ لیکن اس بات کی تصدیق کون کرے گا۔“ نمل نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے شبیہ بھائی سے پوچھنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا اور جلال بھائی نے اگر خود شبیہ بھائی کو تاکید کی ہے کہ ان کے اور ماویٰ کے رشتے کی سچائی سے کسی کو آگاہ نہ کیا جائے تو بھول ہی جاؤ کہ وہ اپنے منہ سے کچھ اچھلیں گے۔“ نمل نے ہاتھ بھاڑتے ہوئے کہا۔

”کتنی تو تم ٹھیک ہو۔“ حرم پر سوچ انداز میں بولی۔

”ایک آئینہ آیا ہے۔“ معائنوی نے کہا تو وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

”ہم جا کر ماویٰ سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ کیا واقعی اس نے جلال بھائی سے نکاح کیا ہوا ہے۔“ اس نے پرجوش نظروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ہمیں کیوں بتائے گی؟“ نمل مایوسی سے بولی۔ ”میں سمجھی پتا نہیں کیا آئینہ دینے لگی ہو۔“

”پھر بھی ہمیں ایک بار کوشش تو کرنا چاہیے۔“ تنوی بضد تھی۔ ”کیا پتا وہ ہمیں بتا ہی دے۔ آخر اس میں کوئی مضائقہ بھی تو نہیں ہے۔“

”نمل ٹھیک کہہ رہی ہے تنوی! ماویٰ ہمیں کچھ نہیں بتائے گی۔“ حرم نے کہا۔ ”اگر جلال شبیہ کو منع کر سکتا ہے کہ کسی کو کچھ نہ بتایا جائے تو یقیناً اس نے ماویٰ کو بھی منع کر رکھا ہوگا۔“

اور اگر انہوں نے واقعی نکاح کر رکھا ہے تو آپس میں کچھ نہ کچھ تو طے کر ہی رکھا ہوگا نا۔“

”یعنی ابھی بھی تم لوگوں کو شک ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ تنوی جل کر بولی۔

”تم پر کون احمق شک کر رہا ہے پاگل! ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ حقیقت حال کا پتا کس طرح لگایا جائے۔“ حرم نے کہا۔

”تمہیں یاد ہے حرم! ہم سب سوچ رہے تھے کہ اچانک ماویٰ کو حویلی آنے کا خیال کیسے آگیا۔“ نمل نے چند منٹ بعد کہا۔

”ہو سکتا ہے وہ اپنے نکاح کو منوانے ہی حویلی آئی ہو یعنی جلال بھائی اور ماویٰ کی پلاننگ ہو یہ ساری۔“

حرم نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”تم ہر معاملے میں فلمی باتیں ڈھونڈ لیا کرو۔“

”اس میں فلمی باتیں ڈھونڈنے کی کیا بات ہے۔ تم خود بتاؤ، کیا تمہیں خود ایسا نہیں لگ رہا۔ دو لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں، اچانک انہیں پتا چلتا ہے کہ بزرگ ان کا رشتہ ہونے نہیں دیں گے۔ تب وہ۔۔۔“

”بس کرو نمل!“ حرم نے چڑ کر اس کے آگے ہاتھ ہی جوڑ دیے تھے۔

”پھر کیا کریں حرم! تنوی نے بے قراری سے پوچھا۔ اسے سب سے زیادہ جلدی تھی کہ اصل بات جان لے۔ ماویٰ اسے اچھی لگتی تھی جبکہ جلال اسے سبکی بہنوں کی طرح چاہتا تھا گو کہ حویلی کے باقی لڑکے بھی اس کے لیے بھائیوں کی طرح ہی تھے لیکن جوانیت اپنی اچھی فطرت کی وجہ سے وہ جلال سے محسوس کرتی تھی وہ بات کسی اور میں نہ تھی۔

”میرا خیال ہے خاموشی سے ملی کے تھیلے سے باہر آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ مناسب وقت آنے پر جلال اور ماویٰ خود ہی ہر بات ڈس کلوز کریں گے تو ہمیں بھی پتا چل جائے گا۔ ایسا نہ ہو ہماری جلد بازی ان لوگوں کے لیے کوئی مسئلہ نہ کر دے۔“ حرم ہمیشہ دورانندی سے سوچتی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی حرم! تنوی نے سہمہ کے کہا۔ ”کیا پتا کب تھیلا پھٹتا ہے اور ملی باہر آتی ہے اور خدا ہی جانے تھیلا پھٹتا بھی ہے یا نہیں۔ اتنا لمبا انتظار کون کرے اور آپ کیسی بہن ہیں حرم! آپ کے بھائی نے چپکے سے شادی کر لی اور آپ کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔“ اس کا انداز شرم دلانے والا تھا۔ حرم زور سے ہنس دی، یوں بھی مایوں کے زور نہ سہری جوڑے میں ہنسی بات بے بات اس کے لبوں پر بکھر رہی تھی۔

”دلچسپی کیوں نہیں ہے بالکل ہے لیکن میں تمہاری طرح زندگی کے معاملات کو محض جذباتیت سے نمٹانے پر یقین نہیں رکھتی۔ بات صرف اتنی سی ہے۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ تنوی نے بظاہر کہا اور دل میں سوچا۔ ”جذباتیت ہے تو یوں ہی سہی لیکن واقعی اتنا لمبا انتظار کون کرے۔ میں جلال بھائی سے نہ پوچھ سکی تو ماویٰ سے تو ضرور پوچھ لوں گی۔“ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔



”تسلی!“ ماویٰ نے اسے راہداری سے گزرتے دیکھ کر بے ساختہ پکارا۔ وہ بڑے بڑے تھال اٹھائے تیز قدموں سے کہیں بھاگی جا رہی تھی۔ ماویٰ کی آواز پر وہ ٹھٹک کر رک گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”بڑی جلدی میں لگتی ہو۔ کہیں جانے کی جلدی ہے کیا؟“ ماویٰ نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”ہم تو ملازم ہیں بی بی! کسی نہ کسی کام کی جلدی ہی رہتی ہے۔“ تسلیم کا انداز سا وہ ساتھ۔

”تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“

”کون سا وعدہ؟“ خدا جانے وہ انجان تھی یا بن رہی تھی۔

”میری مدد کرنے کا وعدہ۔ حویلی کے رازوں سے پردہ اٹھانے کا وعدہ۔“

”بی بی! اب ناخن مجھ غریب کے پیچھے بڑی ہیں۔“ تسلی نے بے چارگی سے کہا۔

”یہ نو۔“ ماویٰ نے سر پہ ہاتھ مارا۔ ”میری تو میں پیچھے بڑی نہیں ہوں۔ کبھی بڑی تو جانے تمہارا کیا شہر ہوگا۔ اب خیرے کرنا بند کرو اور سیدھی طرح بتاؤ۔ میری مدد کب کرؤ گی۔“ عجب دھونس جتنا انداز تھا۔

”بی بی! حویلی میں کسی کو بھٹکنا بھی بڑی گئی ناں کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے تو آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔“



میری جان مصیبت میں آجائے گی۔“ تنسیم روکھی ہو کر بولی تھی۔  
 ”میں تمہیں ایک بات صاف بتا دوں تنسیم! میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا۔ کیونکہ اگر تم نے مجھے کچھ نہ بتایا تو مجھ سے زیادہ تمہاری جان کوئی مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔“  
 بڑے ہی دوستانہ انداز میں دھمکایا گیا تھا۔ تنسیم جو اٹھماک سے اس کی بات سن رہی تھی ہونق سی بن کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

ماویٰ ہنس دی۔ ”دیکھو میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں۔ اس حویلی میں تم وہ واحد شخصیت ہو جو میری مدد کر سکتی ہے۔ اس بات کا اندازہ بھی میں نے تمہاری اس روز کی گفتگو سے لگایا جس میں تم اپنے اور میرے بابا کے اچھے تعلقات کا ذکر کر رہی تھیں۔ ایک بات تم ذہن نشین کر لو جتنی مجھے اپنی خیریت عزیز ہے اتنی ہی تمہاری بھی ہے اس لیے یہ تو بھول ہی جاؤ کہ میں تم پر کوئی کراچ آنے دوں گی۔ میں اس حویلی میں اپنے بابا کے قاتل کے خلاف ثبوت لینے آئی ہوں اور اگر مجھے خالی ہاتھ واپس جانا پڑا تو یاد رکھنا قیامت کے روز قاتل کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ خاموش رہ کر تم اس قاتل کا ساتھ ہی دے رہی ہو۔“

”بی بی! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں اتنا کچھ تو نہیں جانتی کہ آپ کی مکمل طور پر مدد کر سکوں۔“ تنسیم بے چارگی سے بولی۔

”تھوڑا جانتی ہو یا زیادہ لیکن تم پر ذمہ داری تو ہے کہ مجھے ان حقائق سے آگاہ کرو۔“ ماویٰ نے کہا۔ ”اب فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم خاموش رہ کر قاتل کا ساتھ دینا چاہتی ہو یا۔“ ماویٰ نے جتنی نظروں سے اسے دیکھا اور جملہ ادھر اچھوڑ کر واپس مڑ گئی۔

”ماویٰ بی بی!“ معاً تنسیم نے اسے پکار لیا۔ ماویٰ چند قدم ہی آگے گئی تھی کہ اس کی آواز سن کر چلی۔  
 تنسیم تذبذب سے انگلیاں موڑ رہی تھی۔ چند قدموں کا فاصلہ عبور کر کے ماویٰ کے قریب آگئی اور دوا داری سے بولی۔

”کل حرم بی بی کی رسم مہندی ہے۔ رسم کے وقت سب لوگ مصروف ہوں گے۔ آپ موقع دیکھ کر حویلی کے پچھلے حصے میں آجائے گا۔ مجھے جو کچھ پتا ہے وہ آپ کو بتا دوں گی۔ لیکن ایک بات ہے بی بی! مجھ سے زیادہ مدد کی امید نہ رکھیے گا۔ ہو سکتا ہے مجھ سے معلومات لے کر بھی آپ کو کوئی فائدہ نہ ہو۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے لیکن بے جھجکت کما اور ادھر ادھر دیکھتی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

ماویٰ چند لمحے بے یقینی سے کھڑی رہی پھر نرس دی۔ تنسیم اس کی توقع سے جلدی مان گئی تھی لیکن اب اگلا مرحلہ طے کرنا بھی ایک وقت طلب مرحلہ تھا۔



”فیاض بھائی! آپ شینہ آپا سے صاف صاف بات کریں۔ میں یہ بات مان ہی نہیں سکتا کہ انہیں ماویٰ کے بارے میں کوئی خبر ہی نہ ہو۔“ فیضان نے فون پر فیاض بھائی سے کہا تھا۔

”تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو فیضان!“ فیاض نے حیران ہو کر کہا۔ ”شینہ بھلا ہم سے کیوں چھپائے گی کہ ماویٰ کہاں ہے۔ وہ تو خود اس کے لیے اتنی پریشان ہے۔“

”آپ کی بات اپنی جگہ درست سہی لیکن معاملہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے بھائی!“  
 فیضان نے انہیں وہ ساری تفصیلات کہہ سنائیں جو انہیں بتائی تھیں۔

”تم عجیب بات بتا رہے ہو فیضان!“ فیاض بھائی نے متعجب ہو کر کہا۔ ”مجھے تو شینہ کے کسی انداز سے ایسا نہیں لگا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے اور سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ وہ ایسا کرے گی بھی کیوں؟۔ ہمیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے فیضان!“

”یہی تو زیادہ پریشانی کی بات ہے بھائی! کہ تپا ایسا کر کیوں رہی ہیں۔ اور آپ اس بات کو بھی دماغ سے نکال دیں کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس سارے معاملے میں ایسا کچھ ضرور ہے جو آپا ہم سے چھپا رہی ہیں۔“ فیضان کی آواز پریشانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”شینہ کی مائیں۔“ آپ شینہ آپا کو اعتماد میں لے کر سچائی جاننے کی کوشش کریں۔“  
 ”او میرے بھائی! سچائی جاننے کے لیے بھی کبھی بنیادی ضرورت ہوتی ہے جبکہ تمہیں محض شک ہے۔“ فیاض نے کہا تھا۔ ”اور ذرا یہ بھی تو سوچو کہ اگر شینہ واقعی لاعلم ہوئی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی کہ اس کے بھائی کس بنیاد پر اس پر شک کر رہے تھے۔“

بات مقفول تھی۔ فیضان سوچ میں پڑ گئے پھر تھک ہار کر بولے۔  
 ”ٹھیک ہے فیاض بھائی! آپ نہ پوچھیں شینہ آپا سے۔ میں خود ہی کسی طرح ماویٰ کا پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ ان کا لہجہ کسی قدر مایوسی لیے ہوئے تھا۔



”دادی جان! کیا سوچ رہی ہیں؟“ ماویٰ نے بڑی بے تکلفی اور چاٹ سے پوچھا تھا۔ وہ دونوں بڑی سی ڈانٹنگ ٹیبل کے آگے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ باقی کرسیاں خالی تھیں۔ اسی لیے دونوں کو ایک دوسرے کے بچنے اور ڈرنے کا خوب موقع ملنے والا تھا۔

”میں سوچ رہی ہوں۔ جب میں حویلی سے دھکے دے کر تمہیں نکالوں گی تو تمہارے چہرے پر تاثرات کیسے ہوں گے؟“ جنت بیگم نے اس کے سوال پر کوئی بھی رد عمل ظاہر کیے بغیر جواب دیا تھا۔ ماویٰ اس بات پر ہنسی یوں جیسے کسی بچے کی بات پر ہنسا جاتا ہے۔

”مائی گاڈ! کتنا غور ہے آپ میں۔ لیکن جب یہ غور ٹوٹے گا تو آپ کے تاثرات کیا ہوں گے۔“  
 ”کچھ لوگوں پر غور جتنا ہے اور میں ان ہی لوگوں میں سے ایک ہوں۔“ جنت بیگم نے ٹیکسی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہا ہا ہا۔“ ماویٰ بد تمیزی سے ہنسی۔ جنت بیگم نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”تمہیں تو بڑی تیز سیکھی چلا ہے۔“  
 ”آپ کے پاس آگئی ہوں نا۔ سکھاتی تھی۔“

”میں نے تھیکا نہیں لے رکھا کہ لوگوں کی بگڑی ہوئی اولادیں سدھارتی پھولیں۔“ جنت بیگم نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا۔

”دادی جان!۔“ ماویٰ نے جتنے لاڈ سے پکارا جنت بیگم نے اتنی ہی بری طرح اسے ٹوک دیا تھا۔

”میں تم سے کتنی بار کہ چلی ہوں، مجھے دادی مت کہنا کرو۔ تمہاری دادی تمہارے باپ کے بچپن میں ہی مرنے لگی تھی۔“

”ظاہر ہے تب ہی تو میرے دادا نے آپ سے شادی کی تھی۔ اس حساب سے آپ میری دادی ہی بنتی ہیں۔“  
 ماویٰ کا انداز اصرار بھرا تھا۔



”نہیں۔ میں تمہاری سوتیلی دادی بنتی ہوں۔“ جنت بیگم نے زور دے کر کہا تھا۔  
 ”تو ٹھیک ہے، میں آپ کو سوتیلی دادی جان کہہ کر بلا لیا کروں گی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“ بڑا دوستانہ انداز تھا،  
 جنت بیگم کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔  
 ”تم انتہائی ڈھیٹ لڑکی ہو۔“ اس نے دانت کچکچا کر کہا۔  
 ”تھنکس فار داکامپلی منٹ سوتیلی دادی جان!“ وہ ابھی بھی باز نہیں آ رہی تھی۔ ”آپ کو اسی بات سے  
 اندازہ لگانا چاہیے کہ آپ کا بروقت شروع ہونے والا ہے۔ بیوی لیے بغیر میں اس حویلی سے نہیں جاؤں گی اور  
 آپ کو سزا دلوانے بغیر اس ملک سے۔“ انداز میں کوئی چٹک نہ تھی۔ سیدھا سا انداز تھا۔ لفظ بھر کے لیے  
 جنت بیگم کا دل لرزا، اگلے ہی پل اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تھا اور کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے استغزائیہ  
 نہی نش دی تھی۔  
 ”اپنی سی کو شیش کر دیکھو جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ تب بات کرنا۔“ اس نے ایک جتنا ہی نظر باؤی  
 یہ ڈالی اور ڈانٹنگ ہال سے نکل گئی۔ دادی نے اسے جاتے دیکھا پھر سر جھٹک کے پلیٹ میں باقی بچا سینڈویچ ختم  
 کرنے لگی۔

\*\*\*

”ولید! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ انبیاء نے ولید کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔  
 ولید اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسی مصروفیت بھرے انداز میں بولا۔  
 ”میں مصروف ہوں انو!“  
 ”ذرا دیر کو بات سن لو گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔“ انبیاء نے چڑ کر کہا۔  
 ”یار انو!۔“ ولید نے بیزار سی کہا۔  
 ”آئی سویر۔ پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں۔“  
 ولید نے ناچار لیپ ٹاپ بند کر دیا اور کرسی کا رخ ذرا اس اس کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔  
 ”جلدی سے شروع ہو جاؤ۔ زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔“  
 ”تم کیا کرتے پھر رہے ہو ولید!“  
 ”مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”مطلب یہ کہ تم کن ایکٹوئیز میں مصروف ہو۔ اپنی حالت دیکھی ہے کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ آنکھوں کے گرد  
 باقاعدہ حلقے بڑھ گئے ہیں۔“ انبیاء بڑے پریشان انداز میں کہہ رہی تھی۔  
 ”اوہ ایسی کوئی بات نہیں ہے یا راس! ایگزائم کی وجہ سے خود پردھیان دینے کا ناتمامی نہیں مل رہا ہے۔ ورنہ اور تو  
 کوئی بات نہیں ہے۔“ ولید نے اسے ٹالتے ہوئے کہا تھا۔  
 انبیاء چند منٹ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ سمجھ نہیں پا رہی تھی مزید کچھ کہے یا نہیں گو کہ آج تہیہ کر کے  
 آئی تھی کہ دو ٹوک بات کرے گی۔  
 ”ولید! بلا غراس نے خاموشی کو توڑا۔“ اور اسوکنگ کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”تم آج پھر وہی کھا۔ کھول کر بیٹھ جاؤ۔“ ولید نے سرد مہری سے کہہ کر رخ دوبارہ موڑ لیا تھا اور لیپ ٹاپ بھی  
 دوبارہ آن کر لیا تھا۔ مطلب صاف تھا کہ وہ اب مزید کوئی بات کرنا نہیں چاہتا اور انبیاء کو چاہیے اپنی شکل لے کر  
 وہاں سے دفع ہو جائے۔ انبیاء کو تاؤ آ گیا۔

”جب تک یہ کھا نہ نہیں کھلے گا تمہاری حرکتیں بھی ٹھیک نہیں ہوں گی۔“ انبیاء نے غصے سے آگے بڑھ کر  
 لیپ ٹاپ بند کر دیا تھا۔  
 ”اپنے کام سے کام رکھنا سیکھو انو!“ ولید نے سرد مہری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔  
 ”یہ بھی میرا کام ہے۔“ انبیاء نے سابقہ انداز میں کہا۔  
 ”میں اسوکنگ نہیں کرتا انو! میں نے تمہیں اس روز بھی بتایا تھا کہ وہ سگریٹ میرے دوستوں کے تھے۔“ ولید  
 نے غصے کے باوجود قدرے دوستانہ انداز میں کہا تھا۔  
 ”چھا۔“ انبیاء نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر پلٹ کر گئی اور اس کی الماری کے سب سے نچلے  
 حصے میں سے کچھ میگزینز نکال لائی اور انہیں ولید کے سامنے میز پر بٹخ دیا۔  
 ”سگریٹ تمہارے دوستوں کے تھے تو ان پورن میگزینز کے بارے میں کیا کہو گے؟“  
 ولید کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اسے اس طرح گھبرے جانے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔  
 ”اور وہ تمام نیوڈیب سائٹس جنہیں تم سارا دن پڑھائی کے بھانے سرچ کرتے رہتے ہو؟ اور وہ تمام گھٹیا  
 اسٹیفس جسے تم نے اپنے کمرے کے کونوں کھدروں میں چھپا رکھا ہے۔ ان سب چیزوں کے بارے میں کیا کہو  
 گے ولید!“

انبیاء کا غصے سے برا حال تھا جبکہ ولید کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اسے چند منٹ ہی لگے تھے اپنی  
 حالت پر قابو پانے میں۔ اگلے ہی پل اس نے میگزینز اٹھا کر میز کے سب سے نچلے خانے میں ڈال دیے تھے۔  
 ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ میرے کمرے کی تلاشی لو؟“ ولید نے کرسی سے کھڑے ہو کر سینے پر ہاتھ باندھتے  
 ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ انبیاء اس سے ڈھٹائی کی توقع کر رہی تھی مگر اتنی بھی نہیں۔  
 ”پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔ ورنہ میں تمہاری حرکتوں کی ساری خبر ڈیڈی کو دے دوں گی۔“  
 ”کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ میری جاسوسی کرنے کے بجائے تم پہلے اپنی حرکتوں پر دھیان دے لو۔“ ولید نے  
 اطمینان سے اس کے پیروں تلے سے زمین ہینچتا شروع کی تھی۔  
 ”مطلب کیا ہے تمہارا؟“ انبیاء الجھی۔

”مطلب یہ کہ آج کل گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ ممکن ہے وہ ڈیڈی کو نظر نہ آ رہا ہو، لیکن مجھے سب کچھ نظر بھی  
 آ رہا ہے اور سمجھ بھی ہے۔ لیکن میں نے تم سے کچھ کہا؟ اس لیے۔ کہ میں سمجھ رہا تھا یہ تمہارا پرسنل معاملہ  
 ہے۔ مجھے اس میں انٹرفیر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ تم بہت اچھی بہن بننے ہوئے میرے ہر  
 معاملے میں ٹانگ بھنارہی ہو تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ میں بھی بہت اچھے بھائی کا رول پلے کرتے ہوئے تمہاری  
 حرکتوں کی خبر ڈیڈی کو دے دوں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو ولید!“ انبیاء نے خائف ہوتے ہوئے کہا۔ گو کہ اس کے دل میں چور نہیں تھا، لیکن ولید  
 کے بات کرنے کا انداز اسے ہراساں کر رہا تھا۔  
 ”بکواس ابھی میں نے کی نہیں ہے، لیکن تم اگر اسی طرح میری جاسوسی کرتی رہیں تو تمہارے اور فیضان بھائی  
 کے بارے میں جو کچھ ڈیڈی کو بتاؤں گا، وہ ضرور بکواس کے زمرے میں آجائے گا۔“ ولید نے غرا کر کہا۔ اب کی بار  
 چہرے کا رنگ بدلنے کی باری انبیاء کی تھی۔

”ولید! فضول مت بولو۔“

”چھا اپنی باری آئی تو میری باتیں فضول ہو گئیں۔“ ولید نے استغزائیہ کہا۔

”اگر تم نے ڈیڈی سے کوئی بھی فضول بات کہی تو ولید! تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گی۔“ انبیاء نے کہا۔



”مفضول بات؟ کون سی بات؟ میں تو حقیقت ہی بتاؤں گا۔“

”اپنی طرف سے افسانہ گھر کے حقیقت بناؤ گے؟“

”اپنی طرف سے کیوں بنائے لگا۔ یہ تو سامنے کی حقیقت ہے۔ موقع ملنے ہی تم انیکس میں چلی جاتی ہو۔ کھانے بنانا کر بجوائے جارہے ہیں۔ لان میں واک کی جارہی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو بات ہے نا۔“ وہ خوب آنکھیں میکانیکا کر بول رہا تھا۔ لیکن انبیاء کے منہ میں تو جیسے زبان ہی نہ رہی تھی۔ اس کا وہ حال تھا کہ کاٹو بدن میں لمبو نہیں۔

”اب میری ایک بات کان کھول کر سن لو مس حسن! اگر اگلی بار تم نے میرے کمرے کی تلاشی لینے کی کوشش کی یا میری جاسوسی کرتے ہوئے پائی گئیں تو یاد رکھنا میں تمہارے اور فیضان بھائی کے بارے میں ایک کی چار لگا کر می اور ڈی کی کوتاہی میں ذرا بھی نہیں سوچوں گا۔“ اس نے واضح الفاظ میں دھمکی دی تھی۔

”اب اپنی شکل گم کرو میں مصروف ہوں۔“

”اور ہاں۔“ انبیاء جس وقت کمرے سے باہر نکل رہی تھی اس نے ولید کو کتے بنا۔

”میں جو کہتا ہوں اسے بھولتا نہیں ہوں۔ یہ بات ضرور یاد رکھنا۔“ انبیاء خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔

\*\*\*

فیضان بیڈ پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ سر کے نیچے دونوں ہاتھوں کا تکیہ تھا اور آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں جبکہ کانوں میں انبیاء کی آواز گونج رہی تھی۔

”آپ کے کتنے کا جو بھی مطلب تھا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ سچ سچ میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ بھی مجھے یاد رکھیں۔ کیا آپ مجھے یاد رکھیں گے؟“

”کتنی عجیب بات ہے نا۔ میں نے اپنی اور آپ کی عمول کا حساب اس لیے رکھا کہ تاکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں، لیکن جب آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو آپ اتنا حساب کتاب کس لیے رکھے ہوئے ہیں؟“

”کیونکہ آپ کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں میرا خیال موجود ہے، جسے آپ جھٹکتے رہتے ہیں اور خود سے بھی اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔“

”کیا آپ زہریں کو بھول چکے ہیں؟ اتنے سال گزرنے کے بعد کیا آپ انہیں یاد نہیں کرتے؟ کیا آپ کی ان سے محبت کوئی کشش تھی؟“

فیضان اٹھی اور کھڑکی میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ رات کا آسمان ستاروں سے بھللا رہا تھا اور ہوا شائیں شائیں کر کے لان میں درختوں کو چھوٹی تھی۔

”آپ کہہ رہے ہیں میں آرام سے آپ کو بھول جاؤں گی۔ اوسے اوسے اور پھر ساری زندگی ایک کم عمر لڑکے کے چہرے میں آپ کا چہرہ تلاش کرتی رہوں گی ٹھیک ویسے ہی جیسے آپ میرے چہرے میں زرین کا چہرہ تلاش کرتے ہیں۔“ اس نے جیسے فیضان کے سامنے آئینہ لا کر رکھ دیا تھا۔

”آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ میری فیلنگز کو کوئی کشش قرار دیں۔ آپ کو صرف اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، میرے بارے میں نہیں۔ ماوی ٹھیک کہتی تھی، آپ سے محبت کرنا پھر سے سر پھوڑنے کے برابر ہے۔“

”فیضان! میں۔۔۔“ ثمنینہ نے کہنا چاہا لیکن فیضان کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھی اور ثمنینہ نے آج سے پہلے بھائی کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی کیفیت اس شخص کی سی محسوس کر رہی تھیں جس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ناچار انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ ماوی ان ہی کے اصرار پر حویلی گئی ہے۔

”ثمنینہ! آپ امیری سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کی عقل مندی کا اعتراف کن الفاظ میں کروں۔“ فیضان کا غصہ سے برا حال تھا۔ ”آپ کو ذرا سا بھی احساس ہے آپ نے کتنی بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ ماوی کو اسے ہاتھوں سے بند کر دی۔ ایک جھٹکے سے ہوا کی تیز آواز کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔

فیضان نے محض وقت گزاری کے لیے لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ ان کے ان باکس میں انبیاء کی کچھ ای میلز پڑی تھیں۔ سادہ اور معصوم بے ضرر سی باتوں سے بھری ہوئی۔ وہ ایک ایک کر کے تمام ای میلز دیکھتے چلے گئے۔ معاً ذہن میں ایک کو نڈا سا لپکا تھا۔ انہوں نے فی الفور اپنی آئی ڈی کو سائن آؤٹ کر کے ثمنینہ کا کامیٹنگ ایڈریس لگانا شروع کیا۔ کسی وقت میں ثمنینہ کا کایا ہوا پاس ورڈ کام آ یا تھا اور گو کہ وہ جانتے تھے کہ وہ بہت ہی غیر اخلاقی حرکت کے مرتکب ہونے جارہے ہیں۔ لیکن یہ وہ واحد راستہ تھا جس کے ذریعے ماوی کا پتا لگایا جاسکتا تھا۔

تھوڑی سی محنت کے بعد بالآخر وہ اصل پاس ورڈ لگائے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ توقع کے عین مطابق ان باکس ماوی کی ای میلز سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے تمام میلز چیک کرنے لگے۔ پہلی چار پانچ میلز میں کوئی قابل ذکر بات نہ تھی، لیکن چھٹی میل میں انہیں سراغ مل ہی گیا۔

”آپ کی ڈیمانڈ کے مطابق میں حویلی پہنچ چکی ہوں، لیکن سمجھ یہ نہیں پاری کہ میں یہاں آئی کس لیے ہوں۔ اگر بابا جان کے قاتل کے خلاف ثبوت ہی تلاش کرنا تھا تو ہم پولیس کی مدد بھی تو لے سکتے تھے۔ اس کے لیے مجھے حویلی بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔“

فیضان کے دل غ پر جیسے پتھر سے برسے لگے تھے۔ اگلی ای میل میں لکھا تھا۔

”بالآخر امیر میری ملاقات جنت ینک سے ہو ہی گئی۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا امی! وہ بہت خوب صورت خاتون ہیں اور اگر زہر اس آئی اپنی ماں جیسی تھیں تو فیضان ماما نے بلا وجہ دل نہیں ہارا ہو گا۔ بلاشبہ ان میں ضرور ایسا کچھ ہو گا کہ دل ہار دیا جائے۔“

اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ تھی، ساری صورت حال سمجھ میں آتے ہی فیضان سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

”آپ سے اور آپ کی بیٹی سے مجھے عقل مندی کی توقع تو کبھی بھی نہیں رہی۔ لیکن اس بار تو آپ دونوں نے حد ہی کر دی۔“

فیضان نے موبائل فون کان سے لگا رکھا تھا اور بے حد غصے میں تھے۔

”کبھی باتیں کر رہے ہو فیضان!“ ثمنینہ تپانے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”پہلے آپ مجھے بتائیں، ماوی کہاں ہے؟“ فیضان نے ان کے گرد گھیرا تنک کرنا شروع کیا۔

”مجھے پتا ہوتا تو کیا پہلے ہی نہ بتا دیتی۔“ ثمنینہ عاجز آ کر بولیں۔

”تو پھر آپ کے لیے ایک خبر ہے۔ ماوی حویلی جا چکی ہے تاکہ وہاں سے رجب بھائی کے قاتل کا سراغ لا سکے۔“ فیضان نے طنز سے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک۔ کیا کہہ رہے ہو فیضان!“ ثمنینہ خود پر قابو رکھنے کے باوجود ہٹلا گئی تھیں۔

”وہی کہہ رہا ہوں جو آپ سن رہی ہیں۔“ فیضان نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اور بہتر ہو گا کہ آپ میرے سامنے مزید انجمن بننے کا ڈراما نہ کریں کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ماوی نے آپ کے کہنے پر حویلی جانے کی حماقت کی ہے۔“

”فیضان! میں۔۔۔“ ثمنینہ نے کہنا چاہا لیکن فیضان کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھی اور ثمنینہ نے آج سے پہلے بھائی کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی کیفیت اس شخص کی سی محسوس کر رہی تھیں جس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ناچار انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ ماوی ان ہی کے اصرار پر حویلی گئی ہے۔

”ثمنینہ! آپ امیری سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کی عقل مندی کا اعتراف کن الفاظ میں کروں۔“ فیضان کا غصہ سے برا حال تھا۔ ”آپ کو ذرا سا بھی احساس ہے آپ نے کتنی بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ ماوی کو اسے ہاتھوں سے



مصیبت کے منہ میں دھکیل دیا۔ ایک بار بھی آپ نے سوچا وہاں اسے کوئی نقصان پہنچا تو آپ کیا کریں گی؟  
 ”تم اس طرح کی باتیں مت سوچو فیضان! ماویٰ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ ثینہ نے کہا۔  
 ”آپ اپنے خیالوں میں خوش رہیں۔ مجھے ایسی کسی خوش امیدی کی آس نہ دلائیں۔“ فیضان نے دو ٹوک کہا  
 ”ماویٰ کا کانٹیکٹ نمبر دس بجھے میں اسے مزید اس حویلی میں چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔“  
 ”میرے پاس اس کا نمبر نہیں ہے۔“ ثینہ نے کہا۔  
 ”اب آپ پھر جھوٹ بول رہی ہیں۔“ فیضان کو تاؤ آگیا۔  
 ”فیضان!۔۔۔“ ثینہ اپنے بیزاری سے کہا۔ ”تم بنانا کھیل بگاڑ دو گے۔ میں نے کن وقتوں سے ماویٰ کو حویلی جانے پر راضی کیا ہے اپنے مقصد کے اتنا قریب پہنچ کر اگر وہ واپس آگئی تو سب کیے کر اپنے پرانی پھر جائے گا۔“  
 ”آپ کو اپنی پلاننگ خراب ہونے کا خدشہ ہے؟ اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ ماویٰ کو وہ لوگ کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”ماویٰ ان لوگوں کا اپنا خون ہے وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“ ثینہ نے کمزوری آوازیں کہا۔  
 ”جی ہاں۔۔۔ ماویٰ ان کا اپنا خون ہے۔ خون بھی وہ جو کب کا سفید ہو چکا۔“ فیضان نے ثینہ کا جملہ اچکتے ہوئے انہیں آڑے ہاتھوں لیا تھا۔  
 ”ایک طرف آپ نے ماویٰ کو وہاں رجب بھائی کے قاتل کے خلاف ثبوت لینے بھیج دیا۔ دوسری طرف آپ کہہ رہی ہیں کہ ماویٰ ان کا اپنا خون ہے، اس لیے محفوظ ہے اگر وہ حویلی رجب بھائی کے لیے محفوظ نہیں تھی تو ماویٰ کے لیے کس طرح محفوظ ہو سکتی ہے؟ اس بات پر یقیناً“ آپ نے غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہوگی۔۔۔ اب مجھے ایک بھی منٹ ضائع کیے بغیر ماویٰ کا نمبر دس دس ورنہ غصے میں میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں گا۔“  
 یہ دھمکی کارگر رہی۔ یوں بھی ثینہ فیضان کے لہجے سے سمجھ گئی تھیں کہ اب کوئی بھی بہانہ بنا نا فضول ہوگا۔  
 بد دل کے ساتھ انہوں نے نمبر دے دیا تھا۔

\*\*\*

”تم معاملے کی نزاکت کو سمجھ ہی نہیں رہی ہو ماویٰ!“ ثینہ نے جھنجھلا کر کہا تھا۔  
 ”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ ماویٰ نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ وہ بڑی سی سنگھار میز کے سامنے کھڑی لب اسٹک لگا رہی تھی۔ آج حرم کی رسم مندی تھی۔ سب لڑکیاں بھابھیاں تنوی کے کمرے میں تیار ہونے کے لیے جمع تھیں اس نے کندھے کی مدد سے موبائل فون کان سے لگا رکھا تھا جبکہ لپ لائنو برش کی مدد سے وہ بے حد نفاست سے لب اسٹک لگا رہی تھی۔ اس نے بائبل گرین کلر کے غرارے کے ساتھ لائٹ گولڈن شرٹ پہن رکھی تھی۔ بائبل گرین ہی بڑا سا دوپٹہ جس کے کناروں پر سنہری کام کیا ہوا تھا۔ آگے کی طرف دونوں کندھوں پر بڑے اسٹائلش انداز میں سیٹ کر رکھا تھا۔ سیٹ کیے ہوئے بال کندھوں پر آگے آ رہے تھے جن سے کانوں میں ڈالے ہوئے بڑے بڑے جھمکے جھانک رہے تھے۔ اس نے میک اپ بھی بہت نفاست سے کر رکھا تھا اور بلاشبہ خوب صورت بھی بہت لگ رہی تھی۔ لب اسٹک کو فاسٹل ٹیچر دے کر اس نے شیشے میں خود پر تفصیلی نظر ڈالی پھر اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر خود کو اوکے کا اسٹیل دیا اور پہلی بار پوری سنجیدگی سے ثینہ کی طرف متوجہ ہوئی۔  
 ”اب بتائیں۔ آپ مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟“

”فیضان کی کال آئے تو تم اٹینڈ مت کرنا۔“  
 ”اس سے کیا ہوگا؟“

”فیضان مایوس ہو کر دوبارہ رابطہ نہیں کرے گا۔“  
 ”اور اگر وہ حویلی آگئے تو۔۔۔“  
 ”ایسا نہیں ہوگا۔“

”فیضان ماما آج پیدا ہوئے ہیں یا آپ؟“  
 ”اس۔ مطلب؟“

”مطلب یہ کہ فیضان ماما کے بارے میں آپ ایسا دعواتب کریں جب آپ انہیں جانتی نہ ہوں۔“ ماویٰ نے کہا۔ ”آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں ان کا فون ریسیو کروں یا نہ کروں اگر انہیں میرے بارے میں علم ہو گیا ہے تو وہ مجھ تک پہنچیں گے ضرور۔“

”تو اب میں کیا کروں؟“ ثینہ نے پریشانی سے کہا۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ آپ کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔۔۔“

”ماویٰ! تمہارے پاس بلو آئی لائنو ہے؟“ اچانک پیچھے سے آکر نمل نے پوچھا تھا۔ ماویٰ نے ذرا سا چونکتے ہوئے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا پھر ڈرنک ٹیکل سے آئی لائنو اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا اور مزید آواز دھمی کر کے بولی۔

”آپ کو پہلے ہی فیضان ماما کو طریقے سے پینڈل کرنا چاہیے تھا۔ اب جب کہ تیرا کمان سے نکل چکا ہے تو میرا نہیں خیال کہ ہم فیضان ماما کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ جو کر رہے ہیں انہیں کرنے دیں۔ ویسے بھی میرا خیال ہے۔ آج رات تک مجھے کچھ نہ کچھ معلومات مل ہی جائیں گی۔“  
 ”واقعی؟“ ثینہ یکدم برخوش ہوئی تھیں۔

”جی بالکل۔۔۔ لیکن ابھی میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن جیسے ہی کچھ پتا چلا میں آپ کو بتاؤں گی ضرور۔۔۔ آپ بس دعا کریں فیضان ماما کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے مجھے مطلوبہ معلومات مل جائیں۔“  
 ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ ثینہ نے صدق دل سے کہا۔ پھر کچھ خیال آنے پر پوچھنے لگیں۔ ”جلال کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔۔۔ معصوم آدمی۔“

”ماویٰ! تم فیضان کے سامنے بات سنبھال لو گی ناں؟“ ثینہ نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔

ماویٰ نے بیزاری سے گہری سانس بھری۔

”آپ کی ہر پلاننگ ادھوری کیوں ہوتی ہے می! مجھے حویلی بھواتے ہوئے بھی آپ کی پلاننگ ادھی تھی۔ باقی معاملات سنبھالنے کے لیے آپ نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اور اب فیضان ماما کے معاملے میں بھی آپ کی اسٹریٹیجی یہی رہی۔۔۔ کل کو آپ کہیں گی کوئی مشکل آجائے تو بھی اسے تنہا سنبھال لو۔“

”ماویٰ! تم مجھے ہمیشہ غلط سمجھتی ہو۔ جبکہ میں۔۔۔“ ثینہ نے کہنا چاہا۔

”اوه فار گاڈیک۔۔۔ اب وہی بچھلا چھپھو کھول کے مت بیٹھیں۔“ ماویٰ نے بیزاری سے کہا۔ ”اور فیضان ماما جو کرتے ہیں انہیں کرنے دیں۔ دیکھا جائے گا جو ہو گا اور میں فون بند کر رہی ہوں۔ اب مزید بات نہیں کر سکتی۔“



ویسے بھی فنکشن اشارت ہونے والا ہے نمل اور تحریمہ بھابھی کئی بار بلانے آچکی ہیں۔۔۔ ٹیک کیر آف  
یور سلف۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔  
تینہ مزید کچھ بات کرنا چاہتی تھیں لیکن ماویٰ نے فون بند کر دیا تھا۔



رسم کا اہتمام حویلی کے مرکزی لان میں کیا گیا تھا، ماویٰ جان بوجھ کر لڑکیوں سے ذرا پیچھے پیچھے رہی تاکہ کسی کی  
نظروں میں آئے بغیر تسنیم کے کئے کے عین مطابق حویلی کے عقبی حصے میں جاسکے۔ لیکن اپنی احتیاط کے باوجود  
اس کی موجودگی کو بہت سے لوگوں نے نوٹ کر لیا تھا۔

گوکہ سب نے ہی اسے سراہا تھا لیکن تنوی نے بطور خاص اس کی بہت تعریف کی تھی۔ اگر اسے باقی سب کی  
پروانہ ہوتی تو اب تک یقیناً ”ماویٰ اور جلال کو ساتھ ساتھ کھڑا کر کے بھی دیکھ چکی ہوتی کہ ان کی جوڑی کیسی گنتی  
ہے۔ وہ تو مصروفیت زیادہ ہونے کی بنا پر ماویٰ سے پوچھ نہ پاری تھی ورنہ شوق کا تو وہ عالم تھا کہ بس حد نہیں۔ جنت  
بیکم نے البتہ اس پر سرسری سی خشکیاں نظریں ہی ڈالی تھیں۔

ماویٰ کی نظریں مستقل تسنیم کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ تسنیم بھی آتے جاتے اس پر نظر رکھے ہوئے  
تھی۔ جس وقت حرم کے سسرال والے مندی لے کر آئے، مہمانوں کی آمد کی وجہ سے تسنیم کو وہاں سے نکلنے کا  
موقع مل گیا۔ اس نے کھکنے سے پہلے ماویٰ کو اشارہ کر دیا تھا۔ ماویٰ نے کچھ دیر سب کی نظریں خود سے ہٹنے کا انتظار  
کیا پھر نظر بچا کر سب کے درمیان سے نکل آئی۔

حویلی کے مرکزی حصے کے برعکس عقبی حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عجیب سی وحشت محسوس ہوتی تھی۔  
ماویٰ اپنی آنکھوں کو اس اندھیرے سے مانوس کرنے کی کوشش کرتی اپنے غرارے کو دونوں سے ہاتھوں سے مگر  
بڑے بے ڈھب طریقے ذرا سا اوپر اٹھائے احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ لباس عالیہ نے اس کے لیے بنوایا تھا

اور اسے یہ یو اتنی سال لباس پسند بھی آیا تھا۔ ایسا لباس پہننے کا اس کا پہلا تجربہ تھا اور وہ اس تجربے سے لطف اندوز  
بھی ہو رہی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسے چلتے پھرنے میں بھی اچھی خاصی وقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔  
اس سے قبل کہ وہ مایوس ہو کر واپس پلٹی تسنیم والے دروازے سے نکلتی زرد روشنی نے اسے متوجہ کر لیا۔  
اندھیرے میں جگنو کے مترادف تھی یہ روشنی۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھی۔ دروازے پر انگلیوں کا ذرا سا دباؤ  
ڈالتے ہی دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ماویٰ نے اندر داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

”شکر ہے تسنیم! تم نے لائٹ جلا دی ورنہ اتنے اندھیرے میں تو میں کسی دیوار کو ہی ٹکرا مارنے لگی تھی۔“  
حسب عادت تیز تیز بولتی وہ جوں ہی پلٹی۔ تسنیم کی جگہ خود سے محض چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ڈھانچہ نما  
وجود کو دیکھ کر بری طرح ڈر گئی اور الٹے قدموں بند دروازے سے جا لگی۔ وہ جو کوئی بھی تھا بے حد ضعیف اور بد فوق  
تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کمزور جلد سے باہر ابلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ٹٹکی باندھے ماویٰ کو دیکھ رہا  
تھا۔ اپنی تمام تر طراری کے باوجود ماویٰ کو اس سے بری طرح خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ چیخ کر تسنیم کو  
آواز دے لیکن قوت گویائی نے اس کا ساتھ دینا بند کر دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





”یہ نذیراں کہاں چلی گئی؟“  
صبح جب نیند سے اٹھی۔ نیم کی مسواک سے فارغ  
ہو کر وہ نذیراں کو اٹھانے واپس تھلے پر آئی تو نذیراں کی  
خالی چارپائی دیکھ کر اک لمبے کو خاموش رہ گئی۔ چھوٹا سا  
گھر تھا، کہیں چھپ تو نہیں سکتی تھی۔  
اندر کمرے میں باورچی خانے میں، جہی کہ بھینسوں  
کے پاڑے میں بھی دیکھ آئی کہ کہیں بھینس دوہنے تو  
نہیں گئی۔  
باتھ روم سے تو وہ خود نکلی تھی۔ گھر کے صحن میں  
لگے نلکے سے منہ دھو کر پھر نذیراں کو اٹھانے آئی تاکہ وہ  
ناشائے۔  
چائے کبابی چڑھا کر نذیراں آنا گوندھتی۔ چائے بن  
جاتی تو آگ سے جلنے کو نلکے نکال کر چولے کے باہر  
چائے کی ہنڈیا ان پر رکھتی تاکہ چائے گرم رہے۔ پھر  
خود چولے پر توجہ کر روٹیاں ڈالتی جاتی۔  
پھاتل پیالے دھو کر لکڑی کی چوکی پر آ بیٹھتی۔ جو  
بھی اٹھتا جاتا، اسے چائے کے پیالے بھر بھر کر دیتی  
رہتی اور وہ گرم گرم پر اٹھے اتار کر ان کو دیتی۔ ناشتے  
کے بعد وہ گھاس کا گٹھا باندھنے والا کپڑا اٹھاتی اور  
بھینس کے لیے چارہ کاٹنے کے لیے چلی جاتی۔  
جو زمین پر چلا جاتا۔

نذیراں واپس آکر رتن ماجھتی جھاڑو دیتی، لسی بناتی  
پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی۔

ان کی زندگی اسی ڈگر پر رواں تھی۔ گھر کے وہ تین  
افراد اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ خوش تھے۔ جیتجا اور  
جیتجی میں پھاتل کی جان تھی۔ اپنی بہن جیلہ کی بیٹی

صاحب سمجھتا نذیراں کی کبھی بھی اس سے نہ بنی تھی۔  
پھاتل نے جلدی سے دوڑ کر جو کو اٹھایا۔  
”جو اٹھ چھوڑا، نذیراں پتا نہیں کہاں چلی گئی۔“  
جو ہڑو کر اٹھا۔ پہلے گھر میں دیکھا، پھر باہر بھاگا۔  
کچی پگڈنڈی پر زنانہ مروانہ جو قوتوں اور موٹر سائیکل کے  
نشانات واضح تھے۔  
”چھوڑی بھاگ گئی۔“ آنا ”فانا“ خبر دو دور تک  
پھیل گئی۔ پھاتل کا بیٹا، جو اور نذیراں کا منگیتر ہر جگہ پتا  
کرتے پھر رہے تھے۔ تھانے میں جا کر اغوا کی رپورٹ  
درج کروا آئے۔ صبح سے شام ہو گئی۔ نذیراں نہ ملی۔  
”آخر وہ گئی کہاں؟ کس کے ساتھ؟ کچھ تو انا پتا  
رکھتیں تم۔“  
جیلہ کو غصہ آیا تو پھاتل پر برس پڑی۔  
”میں نے چند بار حمزہ کے پیچھے عزیز کے ساتھ اسے  
بات کرتے دیکھا تھا، پھر اس کے باہر نکلنے پر پابندی لگا  
دی۔ پھاتل نے مری ہوئی آوازیں بتایا۔





”کیا عزیز کے ساتھ۔۔۔؟ اسے شرم نہ آئی  
ان سے تو ہماری برادری بھی نہ تھی۔“ دشمن نے  
صدمے سے کہا۔  
”اگر مجھے پتا چل جاتا تو اس کمینی کو وہیں مار دیتا۔“  
جوجے طیش سے کہا۔  
”ارے! تب ہی تو نہیں بتایا۔“ پھاتل روتے  
ہوئے بولی۔  
”مگر کیا پتا تھا کہ وہ منہ پر کالک مل کر چل جائے گی۔  
ہمیں تو جیتے جی ماری کی گلیوں میں پھاتل منہ پر دو ڈھار گے  
بین کر رہی۔ ان کے دلوں میں آگ بھڑک اٹھی۔  
”آدی مارا۔ اب گھر سے چھوڑی اٹھا کر لے  
میں۔“

رات دن دوڑ دوڑ میں کتنے بھینس پیچیں  
قرضہ لیا۔ کوئی دوڑ اپھوڑا نہ نہ پولیس نہ عدالت۔  
پر نذیراں واپس نہ لی۔ الٹا اخبار میں دھیان طلب  
نولس آگیا۔  
جس میں نذیراں نے کہا کہ کسی نے اس کے  
ساتھ زبردستی کی ہے نہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ اس نے  
اپنی رضامندی سے عزیز سے نکال کیا ہے۔ اب اپنے  
گھر والوں سے اسے اور عزیز کو جان کا خطرہ ہے۔  
ڈی ایس پی صاحب سے گزارش ہے کہ ان کی حفاظت  
کی جائے اور اس کا یہ بیان ریکارڈ پر رکھا جائے۔  
نذیراں کے اس بیان کے بعد وہ بظاہر خاموش ہو کر  
بیٹھ گئے، مگر اندر ہی اندر گھجڑی پکٹی رہی۔ نذیراں کو  
مارنے یا واپس حاصل کرنے کے منصوبے بنتے رہے۔  
چار ماہ بعد پتا چلا کہ نذیراں اسی علاقے میں آگئی  
ہے، جہاں عزیز کا گھر تھا۔ حمزہ بھی جیل کٹ کر آگیا  
تھا۔ وہ کھلے عام کہتا۔

”میں نے جان بوجھ کر رمضان کو قتل تھوڑی کیا  
تھا۔ جھڑے میں لاٹھی کھپاڑی تو چلتی ہی ہے۔ اب وہ  
میر گیا تو میری خطا تھوڑی تھی، پھر بھی ہم نے معافیاں  
مالئیں، خون بہا دینے کو کہا، مگر وہ لوگ نہ مانے اور مجھے  
سزا دے دی رہے۔ اب میرے نتیجے نے میرا بدلہ  
لے لیا۔ ان دونوں نے نکاح کیا ہے۔ محبت کی ہے۔“

کوئی جرم تھوڑی کیا ہے۔ ایسی خبریں ان کو اور آگ  
لگا دیتیں۔ دشمن، محرم اور جوجے بندوقیل تن کر کھڑے  
ہو جاتے۔  
مگر پھاتل اور جلیہ ان کے پاؤں پر جاتیں غنٹیں  
کر تیں۔  
”کیوں اپنی جوانیاں اس کمینی چھوڑی کے پیچھے  
برباد کرتے ہو؟“  
”اہاں! تم لوگ ہمیں بزدل، بے غیرت بنا کر رکھنا  
چاہتی ہو۔“ محرم کو غصہ آتا۔  
”بیٹا! کام ایسے کرو کہ ہاری ہوئی بازی بھی جیت جاؤ۔  
موقع کا انتظار کرو اس طرح خود کو برباد کرنے سے کیا  
حاصل؟“

نذیراں کو پہلے تو سب نے سر آکھوں پر بٹھایا  
لیکن کچھ عرصہ گزر تو دوڑے تبدیل ہونے لگے۔ گھر  
کے کام کا سارا بوجھ اس پر آگیا۔ کام کی تو خیر تھی۔ عزیز  
کے لیے وہ جان بھی دینے کو تیار تھی، مگر جو ساس اور  
نندیں طخوں کی مارا تیں تو نذیراں کا سراپے ہی کیے  
پر شرم سے جھک جاتا۔  
وہ بار بار کہتیں۔ ”خج ہماری محبت ہماری پہلے ان  
کا قتل کیا، پھر لو کی بھگلی۔ ارے! ایسے غیرت مند  
ہوتے تو چلو پھر پانی میں ڈوب مرنے۔“  
ہر آئے گئے کے سامنے ذکر کیا جاتا۔ ٹھٹھہ لگائے  
جاتے نذیراں کو اپنے کیے پر پشیمالی ہونے لگی تھی۔  
مگر پھر اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے  
الٹیاں آنے لگیں۔ ساس نے سارے میں خبر پھیلا  
دی۔

”اب ان کی لڑکی ہمارا وارث پیدا کرے گی۔“  
یہ خبر پھاتل کو بھی پہنچی۔ وہ بے چین ہو گئی۔ محلے  
کی چند کنڈیوں کے پلو میں بیٹھے باندھ کر ڈیوٹی لگا دی  
نذیراں جیسے ہی گھر سے باہر نکلے، مجھے اطلاع دیتا۔  
نذیراں کا برا حال تھا۔ بخار، الٹیاں طبیعت سنبھلنے کا  
نام ہی نہ تھی۔ وہ ماہ گزر گئے، کھانا پینا بھی حرام۔

مارے ڈر کے وہ اسے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جانے  
سے گریزاں تھے۔ کیا پتا راستے میں وہ آکر ان کو مار  
جائیں، مگر نذیراں کی بڑبڑتی حالت کو دیکھ کر عزیز سے رہا  
نہ گیا۔ شلوار میں پستول اڑسا اور نذیراں کو موٹر  
سائیکل پر بٹھا کر شہر لے گیا۔ راستہ خیریت سے نکلا۔  
ڈاکٹر صاحب نے ڈرپ چڑھائی۔ انجکشن لگایا اور  
دواؤں کا نسخہ تصدیق کیا۔  
وہ نذیراں کو لے کر ابھی گاؤں کے راستے پر آیا ہی  
تھا کہ سانسے سے آنے والی گاڑی نے ان کا راستہ  
روک رکھا۔ کچی پگڑنڈی پر دونوں طرف کھیت تھے۔ وہ  
چانے کے باوجود موٹر سائیکل سائڈ سے نکال نہ پایا۔  
دشمن اور جوجے بندوقیل تانے گاڑی سے باہر نکلے  
اسے شلوار میں اڑسا پستول کو نکالنے کا موقع مل ہی  
نہ سکا۔

نذیراں موٹر سائیکل سے اتر کر ان کے سامنے  
کھڑی ہو گئی۔  
”خدا کے لیے عزیز کو نہ مارو۔ میں چلتی ہوں  
تمہارے ساتھ۔“  
اس نے دشمن کے ہاتھ سے بندوقیل پھیننے کی  
کوشش کی۔ جوجے اسے بازو سے پکڑا۔ دونوں کی  
توجہ نذیراں کی طرف تھی۔ اسی لمحے عزیز نے گنے کے  
کھیت میں چھلانگ لگا دی اور فوراً ”نظروں سے اوچھل  
ہو گیا۔ انہوں نے نذیراں کو کھیت کر گاڑی میں ڈالنا  
اور عزیز کو گالیاں دینے لگے، جو ان کے ہاتھوں سے بچ  
نکلا تھا۔

نذیراں کو وہ دوسرے گاؤں میں دوڑے کے گھر  
جھوڑے۔ پھاتل وہاں پہلے سے موجود تھی۔  
اس نے جی بھر کے نذیراں کو لعین طعن کی، برا بھلا  
کہا۔ دوڑے کی بہن نے اسے سمجھایا۔  
”دیکھو! تمہارا برا بھلا کہنے سے لڑکی تمہاری نہیں ہو  
گی۔ عدالت میں تمہارے خلاف بیان دے دے گی تو  
کیا کرو گے؟ عقل سے کام لو۔“  
بات پھاتل کی سمجھ میں آگئی۔ اب اس نے  
مظلومیت کا چولا پہن کر محبت کا جاوہر دکھایا۔

محبت تو بڑے بیوں کو بے وقوف بنا دیتی ہے۔ وہ تو  
نذیراں تھی۔ پھاتل کی گودوں پلی۔ پھاتل کی محبت  
اس سے ڈھکی چھپی بھی نہیں تھی۔  
یہ حقیقت تھی کہ پھاتل نے اسے محبت سے پالا  
تھا۔ اس کو سگی ماں کے نہ ہونے کا احساس کبھی بھی  
نہیں ہوا۔  
کتنے ہی دن پھاتل اسے سمجھاتی رہی۔ اپنی محبت کا  
رشتے کا احساس دلاتی رہتی۔  
”دیکھ نذیراں! تو ہماری ہے۔ ہماری بہن۔ عدالت  
میں ہمارے حق میں بیان دے۔ ارے بیٹا! وہ عزیز  
والے ہمارے قاتل ہیں۔ وہ تیرے بچن نہیں بن  
سکتے۔“

”ٹھیک ہے! میں آپ لوگوں کے حق میں بیان دوں  
گی۔ ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی، مگر نہ تو عزیز سے  
طلاق لوں گی نہ ہی دشمن سے شادی کروں گی۔“  
نذیراں پھاتل کی محبت بھری باتوں سے متاثر ہو کر  
رضامند ہو گئی۔

”ارے! وہ لوگ دشمن ہیں۔ ہمارے دشمن۔“  
پھاتل دانت پیس کر کہتی۔  
”طلاق تو پھر بھی نہیں لوں گی۔“ نذیراں اس بے  
پردائی سے سر نفی میں ہلا کر کہتی۔ پھاتل سر پیٹ لیتی۔

دشمن فون پر پوچھتا۔  
”ماسی! نذیراں مانی کی نہیں؟“  
وہ کوئی کونا ڈھونڈتی، جہاں نذیراں نہ سن سکے۔  
”کیا کروں دشمن! چھوڑی مانتی ہی نہیں۔ تیرے  
ساتھ شادی کرنے پر تو قدم ہی نہیں جماتی۔ صاف  
انکاری ہی کھڑی ہے۔“

”ماسی! اس کا علاج جو تپا ہے جو تپا لے آسے۔  
دیکھا ہوں کیسے نہیں مانتی۔“ دشمن تلملاتا۔  
بس کر دشمن! تجھے بھی لاکھا کہا، سمجھایا کہ برائی  
عورتوں کو نہ تاڑ۔ اپنی منگ کا دل جیت، مگر تو نے تو ایک  
نہ مانی۔“ پھاتل نے جلے دل کے پھپھو لے پھوڑے۔



”ارے ماسی! مجھے کیا پتا تھا کہ وہ عزیز کے ساتھ اندر ہی اندر چکر چلا رہی ہے۔ سوچا یہ تو آگے پیچھے میری ہی میری ہے۔“

”ہاں! یہ تو ہے۔ ہمیں تو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ پتا تب چلا جب پانی سروں سے اونچا ہو گیا۔“

پھانیاں نے کچھ رنج سے کہا۔

”ارے ماسی! عزت کا جنازہ نکال دیا اس نے۔“

شمن کو ایک بار پھر غصہ آیا۔ ”کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا بد بخت نے۔“

”اچھا! چھوڑو جو ہونا تھا ہو گیا۔ اپنا جی کیوں جلا رہا ہے۔ بس اب کوئی تدبیر سوچ جس سے نذیراں ہمیشہ کے لیے انہیں بھول جائے۔“

نذیراں اسے فون پر چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھ کر کڑھتی۔

”پتا نہیں کیا سازشیں کرتی رہتی ہے جو چھپ کر فون پر باتیں کرتی ہے۔“

وہ بڑبڑاتی۔ برآمدے میں بیٹھی بی بی سے کہتی۔

”دیکھ لینا! آپ کے گھر سے کے جا کر یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔“

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ہماری بڑا میں ہو تمہارے گھر والے تمہیں ہرگز نہیں مار سکتے۔ میرا بھائی تمہیں ایسے تھوڑی ان کے حوالے کرے گا۔ پہلے تمہاری برادری یا ڈیرے کو بطور ضامن ڈالے گا کہ لڑکی کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ پھر بھی تم اپنی رضا مندی سے ہی جاؤ گی۔“ بی بی اسے سمجھاتی دلاسا دیتی۔

نذیراں کے دل کو کچھ ڈھارس ملتی۔

”آجھا تم لوگوں کی تو ان سے دشمنی تھی۔ آنا جانا ہی نہیں تھا پھر عزیز سے کہاں ملیں؟“ بی بی نے حیرت سے پوچھا۔

نذیراں کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ محبت کے رنگ اس کے سانولے چہرے پر بکھر گئے۔

”میں بھینس کے لیے چارہ کاٹنے جاتی تھی۔ وہیں عزیز بھی اپنی بھینسوں کا چارہ کاٹنے آ جاتا تھا۔“ نذیراں



دن گزرتے گئے اور اسے دو مہینے حویلی میں گزر



گئے فیصلے کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ بیچ میں سردار آیا۔

پھانسی نے شرط رکھ دی۔ ”اگر عزیز اپنی بہن کا رشتہ بدلے میں شمن کے لیے دے تو ہم نذیراں عزیز کے حوالے کر سکتے ہیں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ عزیز تو سن کر ہی بھڑک اٹھا۔ ”میں اپنی محبت کی خاطر اپنی بہن کو زندہ درگور کر دوں گا کہ وہ اسے سکا سکا کر مار دے۔“ نذیراں کی شادی کا بدلہ بھی لے لیں اور حمزہ نے چاچا کو قتل کیا تھا۔ اس کا حساب بھی پورا کر لیں۔“

”پھر تم دستبردار ہو جاؤ اپنی بیوی سے۔“ برادری کے سردار نے فیصلہ سنایا۔

”ٹھیک ہے۔“ نذیراں میری بیوی ضرور ہے۔ لیکن میں اس کے لیے اپنی بہن کو قربان نہیں کر سکتا، ویسے بھی معاملہ کورٹ میں ہے۔ نذیراں کو مجھ سے محبت ہے تو وہ کورٹ میں بیان دے دے اور اپنا گھر بسائے اگر اس کی خوشی ہے۔“

عزیز کے اس رویے کا جب نذیراں کو پتا چلا تو اسے بے حد دکھ ہوا۔ جی بھر کے روئی۔ اسے عزیز سے یہ توقع نہ تھی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ عزیز اسے حاصل کرنے کے لیے بدلے میں بہن کا رشتہ دے گا۔ اس کے دل میں پہلی بار عزیز کے خلاف میل آیا۔ گھر میں سب عورتیں اسے سمجھاتیں۔

”دیکھ نذیراں! عزیز جو نا تھا دعا باز۔ صرف تیرے بھائی کی عزت ملیا میٹ کرنا چاہتا تھا، تب ہی تو صلہ کی بات نہ کی۔ تجھے اس نے بہت سنا سمجھا تھا۔ اپنی بہن کو بہت اونچے شے سمجھتا ہے۔ کیوں ایسے بے وفا شخص کے پیچھے اپنی اور اپنے گھر والوں کی عزت برباد کر رہی ہے؟“

بات کچھ کچھ نذیراں کی سمجھ میں بھی آگئی۔ پہلی بار وہ دل سے راضی ہوئی۔ کمر اعدالت میں نذیراں نے کہا۔

”میں واپس اپنے بھائی کے پاس جانا چاہتی ہوں اور مجھے عزیز سے طلاق چاہیے۔“

مگر اسی وقت عزیز کے وکیل کی دلیل نے کیس کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس نے کہا کہ ”طلاق تب تک نہیں ہو سکتی جب تک نذیراں بچے کو جنم نہ دے دے۔“

بیچ نے ایک ماہ کے لیے پیشی ملتی کرتے ہوئے نذیراں کی میڈیکل رپورٹ مانگ لی۔

”ان چکروں میں تو میں یہ بات بھول ہی گئی تھی۔ بھوری! تو بھی چھپائے بیٹی رہی۔“ پھانسی بگڑی۔

”مائی! یہ بات چھپانے والی تھوڑی ہے، جو میں چھپاتی۔ تم لوگ ہی بیوقوف ہو جو سمجھ نہ سکتے۔“

”لو! اب قاتلوں اور دشمنوں کا بچہ ہمارے گھر میں پلے گا۔ ایسا تو ہر گز نہیں ہو گا۔“ پھانسی کے سر پہ لگی تلووں پر ہنسی۔

نذیراں شیرینی کی طرح پھر گئی۔

”دیکھ مائی! میرے بچے کا نام بھی نہ لیتا۔“ وہ صمکی آئینہ انداز میں بولی۔ ”میرا بچہ ناجائز نہیں ہے۔ اسی کے سارے زندگی گزار لوں گی۔ ارے مائی! اسی کے آسرے رتو تو عزیز سے طلاق لے رہی ہوں کہ کم از کم اب میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ ساتھ میں اپنا بچہ ہو گا۔“

پھانسی تنہے پھلا کر نفی میں سر ہلاتی رہی۔ گھر میں کچھڑی کھینچنے لگی۔ شمن، جو سب اپنی غیرت کے بلوں سے بلبلانے نکل آئے۔

”اس خبیث کا بچہ ہمارے گھر میں پیدا ہو گا۔ ہم کھلا پلا کر اسے جوان کریں گے۔ دیکھ مائی! اس کا بندوبست کرورنہ بچے سمیت مار دوں گا اسے۔“ شمن نیچے میں اڑے پستول کو نکال کر طیش سے بولا۔

اور ایک منچ پھانسی نے پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھایا اور ایک چھوٹے سے قصبے میں نرس کے حوالے کر دیا۔ وہ چچی چلائی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ تین دن تک نرس اسے ڈرپ پر ڈرپ اور بالکل بے لگاتی رہی۔ درد کی لہر پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ اک اک جوڑا کھڑکرا پانی جگہ سے ہٹ گیا۔ تب ترپ ترپ کر

اس نے جس بچے کو جنم دیا۔ وہ دنیا میں ایک سانس بھی نہ لے سکا۔ ساتواں مہینہ پورا ہونے کو تھا۔ وہ ننھا سا پسیدہ وجود اس کی یادداشت میں گر گیا۔ متاثرہ ترپ اٹھی وہ اسے ایک لمحے کو بھول نہ پائی جب پھانسی نے وہ ننھا وجود پرانے دوپٹے میں لپیٹ کر شمن کے حوالے کیا تھا کہ جا کر دفن کر آئے۔

گھر آکر وہ دہرے درد سے ترپتی رہی۔ اک جسمانی دوسرا قلبی۔

وہ ہر بات بھول گئی۔ بس اسے صرف اپنا بچہ یاد رہ گیا۔ وہ راتوں کو سونے پانی۔ پیٹ کے اندر اس کے ہلنے چلنے کا میٹھا سا احساس جما رہتا۔ اس کی متاثرہ ترپ اٹھتی۔ تخلیق کا کرب اور لذت ادھوری رہ گئی۔ گود بھری بھر خالی رہ گئی۔

اس کے اندر دھواں بھرنے لگا۔ اس کی گود خالی تندوری طرح دکھتی تھی، جس میں وجود اندھ بن کر جلتا۔ وہ جلتی کڑھتی رہتی۔ کسی کل چین نہ آتا۔

چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی پوروں کا لمس اپنی آنکھوں پر محسوس کرتی۔ آنکھیں بند کرتی تو وہ ننھا وجود اس کے سامنے آ جاتا۔ اس کے گلابی لبوں کا میٹھا سا لمس اپنے سینے پر محسوس کرتی۔ اک گدگد سا احساس پورے وجود پر ریٹکتا۔ اس کی روح سرشار ہو جاتی۔ یہ سرشاری نکاتی ہوتی۔ آنکھیں کھولتی تو بد صورت حقیقت قریب آ جاتی۔ سپنا ٹوٹ جاتا اور پورے وجود میں درد پھیل جاتا۔ وہ جو جنت یاؤں تلے تعمیر کرنے گئی۔ وہ گارابن کر سیلاب میں بہہ گئی۔ اس کی اندھیری کھوکھ روشنی سے بھری تھی مگر پھر سے تاریک مٹا رہ گئی۔

اسے۔ اسے تو اپنی تخلیق سے ہی محروم کر دیا گیا تھا۔ یہ غم کھائے جا رہا تھا۔ دکھ رلائے جا رہا تھا۔ عزیز نہ سہی عزیز کا بچہ تو ساتھ ہو گا۔ زندگی کا سفر کٹ ہی جائے گا اس بچے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کی بات مانی۔ عدالت میں دنیا کے سامنے ان کی بات رکھی مگر انہوں نے کیا کیا۔

حمزہ کے لیے ان کی غیرت نہ جاگی جو پورے گاؤں

میں دندناتا پھرتا۔ میرے معصوم بچے نے ان کا کیا کاڑا تھا جس کو دنیا میں اک سانس بھی نہ لینے دی۔ نذیراں اپنی اجڑی گود کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اندر شمن ہنس کر پھانسی کو بتا رہا تھا۔

”اس پلید سے جان پھوٹ گئی ہماری مائی! تم نے بہت اچھا کیا۔“ کون پر ایسا گند پاتا۔ اچھا ہوا پیٹ سے ہی مر کر آیا۔“ نذیراں کے بدن میں درد کی لہر ویسے ہی ابھری جیسے مرہٹے بچے کو جنم دیتے وقت ابھری تھی۔

”اب پیر کو جو شغوائی ہو گی اس میں بچہ نہ ہونے کا میڈیکل سرٹیفکیٹ دکھاؤں گا۔ بس پھر نذیراں کو طلاق ہو جائے گی۔ سارے کس بل نکال دوں گا اس کے۔ جب آئے گی میری جوتی کی نوک کے نیچے۔“

نذیراں سے آگے کچھ نہ سنا گیا، مگر اس کے مرہٹے بچے کو گھٹیا الفاظ دناس کی برواشت سے باہر ہو گیا۔

آج ہفتہ ہے۔ بیچ میں صرف اتوار تھا۔ نذیراں نے دو سو روپے اپنی پڑوسی لڑکی کو دیے کہ موبائل میں بیلنس ڈلوائے اور اسے موبائل پر بات کرنے دے لڑکی خوش ہو گئی کہ نذیراں دو منٹ بات کرے گی باقی کا بیلنس اس کو ملے گا۔

اس نے ہاتھ روم میں جا کر دو منٹ ہی بات کی۔ موبائل چھپا کر لڑکی کو دے دیا۔

اسی لڑکی نے رات کو نذیراں کو چپکے سے ایک پڑیالا کر دی۔ نذیراں نے اس پڑیالا میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر لڑکی کو تمھارا اور کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنے کا وعدہ لے لیا۔ رات نشہ آور دودھ پی کر سب گہری نیند سوئے رہے۔ لمبی اور گہری نیند۔ اور نذیراں خود اپنی اجڑی گود کا انتقام لینے کو گھر کی چوکھٹ پار کر گئی۔

جہاں عزیز گاڑی لیے اس کا منتظر تھا۔

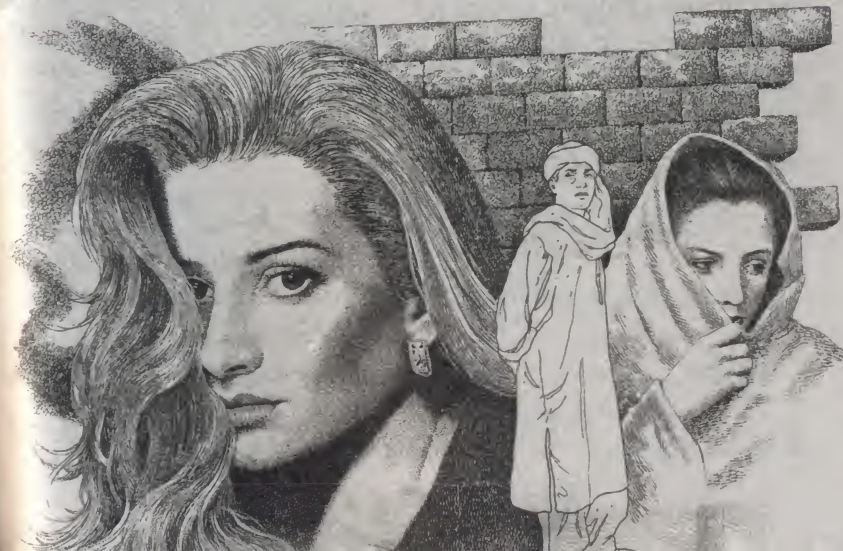




# اکسی سٹریلا

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میٹھا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پر شکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مرنے سے قبل نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں، زینبی اور ربی کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی مہنگی ترکار کو چھوڑ کر مہرے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر مہر واپس آگئی مگر وہ میٹھا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پر شکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میٹھا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مرنے میٹھا کی تعلیم پھرادی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میٹھا پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پر شکوہ خانم میٹھا کو گھر ہی میں رکھنے لگیں۔ انہیں میٹھا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پر اسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

## دوسری قینطرب





میشا لکڑی کے سال خوردہ پھانک سے جھلتی باہر جھانک رہی تھی اور چہرے پہ ذی تمامہٹ تھی جو بچپن سے ہی اس موقع پہ اس کے گالوں سے جھلکنے لگتی تھی۔ جب بھی کسی اپنی سائیکل لیے اس بھورے پتھروں والی گلی سے گزرتا تھا اور اس کے ہر سال گزرنے کے یہی ایام ہوا کرتے تھے جب پوری گلی سفید پھولوں سے بھری ہوتی تھی اور ہر شاخ سیب اور خویلی کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

کودل بھلانے کے لیے سب ملے گا۔ اس علاقے کا سب سے مشہور میلہ۔۔۔ سالانہ میلہ۔۔۔

☆☆☆

”ماما! وہاں بہت سے فوڈ اسٹال ہوں گے۔ چائے پانی پوری۔۔۔ سموے۔۔۔ جلیبی۔۔۔ میں سب کچھ کرائی کروں گی۔“

ایمی نے چٹاٹہ بھرتے ہوئے کہا۔

”میں تو کھانے کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں۔۔۔ میں تو وہاں خوب شاپنگ کروں گی۔۔۔ جیولری تو اتنی زیادہ لول کی۔۔۔ میرے پاس رنگرز کی کوئیکشن وین بدن کم ہو رہی ہے اور ہاں ماما۔۔۔ میں مہندی بھی لگواؤں گی۔ انڈین اسٹال بھی لگے گا ناں بیشہ کی طرح۔“

مہران دونوں کا جوش و خروش دیکھ کے مسکرا دی۔ اس چھوٹے سے قصبے میں جہاں زندگی کی گما گما اور رونقیں نہ ہونے کے برابر تھیں اور جہاں ملنا ملانا بھی کم کم ہی تھا۔ عزیز واقارب اور رشتے دار تو تھے نہیں۔ ایسے میں اس طرح کے میلے کی خبر سونگے دھانوں پہ مہینہ رہنے کے برابر تھی۔

”تم لوگوں کا جودل چاہے کر لیتا۔ سال میں ایک ہی بار تو لگتا ہے یہ میلہ۔ میں بھی بنگلہ اسٹال سے کچھ اچھی ساڑھیاں لے لوں گی۔“

میشا پیانو سے دھول بجاتے ہوئے بیس کان لگائے ہوئے تھی۔ پچھلے دو سال سے کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس میلے میں شرکت کرنے سے محروم رہی تھی اب تو تین سال پہلے والا میلہ یاداشت سے محو ہونے لگا تھا۔

”میں کون سا ڈریس پہنوں ماما!“

”ابھی پچھلے مہینے تو تم نے اپنی دوست کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے نئے کپڑے بنوائے تھے وہ پہن لیتا۔“

”مگر وہ مجھے ٹائٹ ہو گیا ہے۔“

ایمی کے منہ بسور نے یہ زبانی ناک چڑھائی۔

”تو کم کھایا کرو ناں مونی!“

”مگر میں کیا پہنوں گی۔۔۔ میں نے پچھلے مہینے تو کیا پچھلے سال بھی کوئی نئے کپڑے نہیں بنوائے۔“

میشا کو پتا تھا اس کی بات کا جواب اسے کیا ملے گا اور کس انداز میں ملے گا مگر وہی جان بوجھ کے بلکہ بڑے شوق سے آتش نمود میں کودنے والی عادت۔۔۔ باز نہیں آتی تھی۔

”تم نے کرنے کیا ہوتے ہیں نئے کپڑے!“

وہ مہر کے گھورنے کو ذرا خاطر میں نہ لاتی۔

”تو کیا میں میلے میں پرانے کپڑے پہن کے جاؤں گی؟“

”چہرہ واقعی یہ تو ہے۔“ زبانی نے ہمدردی دکھائی۔

”پرانے کپڑے پہن کے اتنے بڑے فیشنل میں جانا تو اپنی انسلٹ کروانے والی بات ہے۔“

”اور کیا؟“ میشا نے اس کی آنکھوں سے جھلکتا تسخیر نہ دیکھا اور صرف اس کی ہمدردی پہ ہی لٹو ہو گئی۔

”وہاں اتنے لوگ ہوں گے۔ ایک سے ایک خوب صورت لباس میں۔۔۔ تمہیں اتنے گندے اور رف جلیے میں دیکھ کر تلافی ملے گی۔“

”بالکل۔“ میشا نے مہر کی جانب دیکھ کے تائیدی انداز میں گردن کافی زور و شور سے ہلاتی جو خود بھی زبانی کے پٹری بدلتے پہ ذرا حیران پریشان اسے تک رہی تھی۔

”اس لیے بہتر ہے کہ۔۔۔ کہ تم وہاں جاؤ ہی نہیں۔“ بالآخر زبانی نے اپنے ہمدردی کے غبارے سے ہوا نکال ہی دی اور کھکھلا کے ہنس پڑی۔ ایمی کا وجود بھی تھل تھل کرنے لگا۔

”کیا؟“ میشا کا دل دھک سے رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار تو اسے گرینی کے علاوہ بھی کسی اور کی حمایت ملی تھی اور وہ بھی بس اتنی ہی دیر کے لیے؟

”تمہارے پاس ٹائم کہاں ہے ان سب نے لیے۔ اپنا دھیان ان کاموں کی طرف رکھو جو تم سے کبھی پورے ہی نہیں ہوئے۔“ مہر نے اس کی لگائیں

کیں۔

”تم تو ہر وقت گھر۔۔۔ موج میلہ کرتی رہتی ہو تمہارے لیے تو جو بیس کھٹے عیش ہی عیش ہے یہ دونوں آدھا دن کان میں اور باقی کا آدھا دن گھر پہننے میں گزارتی ہیں۔ ان کو تو بیک چاہیے دل بھلانے کے لیے تفریح چاہیے۔ تمہیں فاسر غیتھے بیٹھے کیوں مستیاں سوچ رہی ہیں۔“

میشا منہ ہی منہ میں منمنکا رہ گئی۔ بھلا مہر ماما کے سامنے وہ اور کتنا بول پاتی۔

☆☆☆

”یا اللہ! ایسے حادثے میں ان کے ساتھ میلے میں پچھلی بار بھی نہیں گئی اور اس سے پچھلی بار بھی نہیں۔۔۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے جھولے لیے۔ بڑھیا کے بال کھائے۔۔۔ اف۔“

ایمی کے کپڑے استری کرتے ہوئے وہ مسلسل اسی فکر میں غلط تھی جب زبانی نے اس کے منہ پہ اپنا سوث مارا۔

”یہ بھی پریس کرو جلدی۔“

”ابھی ایمی کا کر رہی ہوں۔“

”وہ تو ایک گھنٹے سے کر رہی ہو۔۔۔ ماما ٹھیک کہتی ہیں تم سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”اور تم سے کوئی کام سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ نہ ٹھیک نہ خراب۔“

میشا کا کڑوا ج زبانی کو بری طرح تپا گیا۔

”کیا۔۔۔ کیوں کرتی ہو آگے سے میں ابھی جا کے ماما کو بتاتی ہوں کہ ایک تو تم میرے ساتھ بد میزبانی کر رہی ہو اور اوپر سے جان بوجھ کے ایمی کے کپڑے پریس کرنے میں دیر بھی لگا رہی ہو۔“

”ہاں تو تم اپنی بہن کے کپڑوں کا ساڑز بھی تو دیکھو۔ تین کے برابر ہے ٹائم تو لگے گا۔“

زبانی کا دایاں ابو مکمل کی طرح اٹھا۔ اور وہ اونچی آواز میں چلائی مگر سے سے نکلی۔

”ایمی! لکھو یہ میشا کی بچی تمہارے بارے میں کیا



کہہ رہی ہے کہ ایسی کاسائز تین لوگوں کے برابر ہے۔

یشا سر جھٹک کے دوبارہ کپڑے استری کرنے لگی۔ مہر کی پھیٹی کھاتے کھاتے اب بھلا وہ ان پھوٹی موٹی مصیبتوں کو کہاں خاطر میں لاتی تھی مگر وہ اپنے ذہن سے یہ فکر نہ نکال سکی کہ میلے میں جانے کے لیے کون سی تدبیر اختیار کی جائے۔

”گرینی سے کہو۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ اور سب باتیں تو مان لیتی ہیں مگر اکیلے نہیں جانے نہیں دیتیں۔ کتنی ہیں جنہاں جانا ہے میرے ساتھ جاؤ۔ اب میلے میں کہاں لے جاؤں ان کو ساتھ۔۔۔ وہ تو دس منٹ میں تھک جائیں گی۔“

اسی الجھن میں اسے بتا ہی نہ چلا کہ کب تک وہ استری ایسی کی میس پر رکھے گھڑی رہی۔

”کیا کاما نے میرا سائز تین کے۔۔۔“

ایسی اندر گھسی تو زین کے بھرے ایندھن کی وجہ سے عرصے سے پھنکار رہی تھی مگر جو اپنی نئی میس کو استری تلے بادحوال چھوڑتے دیکھا تو چپس ہو کے رہ گئی۔

”یشا کی پتی۔۔۔“

پھر ایسی اسے کھینچ کے مہر کے دربار میں لے گئی تھی چاضی کے لیے جہاں مہر اپنا عتاب اس پر نازل کر رہی تھی اور ایسی برگر کے بڑے بڑے نوالے لیتے ہوئے

یشا کو ایسے گھور رہی تھی جیسے ہرنوالے کے ساتھ اسے چبارہ ہو جبکہ یشا مہر کی ساری ڈانٹ پھنکار ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے نکالتے ہوئے تسلسل کن اکیوں سے ایسی کے نوالے گن رہی تھی۔

”کیا فائدہ میرے اتنے بک بک کرنے کا۔۔۔ اپنے ہی سر میں درد کر لیا ہے میں نے۔ اس ڈھیٹ پہ ذرا جو اثر ہو۔“

”چار۔۔۔ پانچ اور چھ نوالے میں یہ برگر پورے کا پورا ایسی کے پیٹ کے ٹکڑے میں۔۔۔ اف اگر مجھے کھانا پڑتا تو بھلا کتنے نوالے لینے پڑتے؟ یہیں نہیں بائیں۔“

”جنگ کر کے رکھ دیا ہے اس لڑکی نے۔ روز ایک نیا تماشا۔“

”آپ کس لڑکی کی بات کر رہی ہیں ماما؟“

وہ معصومیت سے گویا ہوئی اور یہی معصومیت مہر کے لیے ہمیشہ زہر کا گھونٹ ثابت ہوئی تھی۔

”تمہارے علاوہ یہاں کون ہے جو دوسروں کو عاجز کر دینے میں اتنی مہارت رکھتا ہو۔“

”مگر میرا نام تو یشا ہے اور آپ کو پتا بھی ہے۔ پھر آپ ہمیشہ یہ لڑکی۔۔۔ یہ لڑکی کیوں کرتی ہیں۔“

”میرا بس چلے تو میں بھی بھی نہیں مخاطب نہ کروں۔“

”ریکی؟“ وہ بے تحاشا۔۔۔ بے حجاب کھل اٹھی۔

”تو پھر آپ ایسا کرتی کیوں نہیں؟“

”شٹ اپ۔۔۔ مہر چلائی۔“

”ماما! اس نے میرا سب سے نپا سوٹ جلا دیا ہے۔ اب میں میلے میں کیا پن کے جاؤں گی۔“

”اسی کو پن جانا ناں۔۔۔ جہاں سے جلا ہے وہاں ایک Patch لگا لو۔۔۔ بالکل ایسا۔“

اس نے اپنی میس اٹھا کے اس پر لگا پوند کھایا۔

”ماما۔۔۔ اسے بتا میں ناں جب میرا یہ اکلوتا سوٹ بھی پرانا ہو کے پھٹ گیا تھا اور میں نے آپ سے یہی سوال کیا تھا کہ اب میں کیا پنوں تو آپ نے یہی بتایا تھا کہ خراب ہوئے کپڑوں پہ patches لگا کے کب تک استعمال کیا جاسکتا ہے اسے بھی بتائیں ناں۔“

وہ معصومیت سے پڑ پڑ پڑ پڑ جھپکتی یہ مشورے دیتی مگر کوئی ہر لگ رہی تھی۔

”تم اپنا مقابلہ میری ایسی سے کر رہی ہو؟“

”میں کیسے کر سکتی ہوں ایسی سے مقابلہ۔۔۔ میں کوئی ریسلو ہوں؟“

”ماما! ایسی چلائی۔“ یہ مجھے ریسلو کہہ رہی ہے۔“

”لڑکی گو گئی کیوں نہیں ہو جاتی؟“

مہر نے دوبارہ اپنا سر پکڑ لیا۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ آہٹ ہونے پہ پر شکوہ خانم نے کتاب سے نظر ہٹا کے سامنے دیکھا یشا ٹرے ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

وہ مسکرائیں۔۔۔ ”گتا ہے“ آٹھ بج گئے۔“

”جی بالکل پورے آٹھ۔“ وہ ٹرے ان کے سامنے رکھ کے ان کی گود میں نیپکن کھول کے رکھنے لگی۔

”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے گھڑی دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پورے سات بجے ناشتہ۔۔۔“

پورے نو بجے میڈیسنز پورے بارہ بجے جوس۔۔۔ دو بجے پانچ چار بجے چائے ایک منٹ ادھر سے ادھر نہیں ہوتا۔“

”لیکن پھر بھی مہر! کتنی ہیں کہ میں کوئی بھی کام ٹائم پہ نہیں کرتی۔“

”مہر بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے غیر جانب داری سے تجزیہ کیا۔

”اس کا کوئی بھی کام تب کم وقت پہ کرتی ہو اور نہ ہی ٹھیک طریقے سے کرتی ہو۔“

”وہ تو اس لیے کہ وہ تنگ آ کے مجھ سے کام کروانا چھوڑ دیں۔ مگر نہیں اصل میں ڈھیٹ میں نہیں وہ ہیں۔“

”ہری بات یشا! بڑوں کو ایسے نہیں کہتے۔“

پر شکوہ خانم کو ہنسی تو بڑی اتنی دل پر لگی تھی بات واقعی مہر کی ڈھٹائی میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتی تھیں مگر یشا کو سرزنش کرنا بھی ان کی تربیت کا حصہ تھا۔ اس لیے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے

انہوں نے سر جھکا کے سوپ کا چمچ منہ میں ڈالا اور ڈانٹنے لگیں۔

”ویسے بڑی خاموشی ہے نیچے۔۔۔ ہیں کہاں سب؟“

”ڈنر کے لیے باہر گئے ہیں۔“

”مگر کھانا تو بنا ہے۔“

”ہاں لیکن اس میں نمک زیادہ ہو گیا تھا ناں۔“

”نمک؟“ انہوں نے اپنے منہ سے دہرایا اور قیمہ اور سبزی کا سالن اور وال دو نوں کو باری باری چکھا۔

”نمک تو بالکل ٹھیک ہے۔“

”یہ تو میں نے آپ کے اور اپنے لیے پہلے سے نکال لیا تھا بعد میں مٹی کے کھانے میں نمک ملایا تھا۔“

”یشا تم کتنی فضول حرکتیں کرنے لگی ہو۔“

”اور وہ جو کچھ کرتی ہیں اس کا کیا؟“ یشا نے منہ بسورا۔

”دیکھیں ناں، مجھے پھر سے میلے میں جانے سے منع کر دیا۔ خیر ان کے منع کرنے کی پروا کسے ہے۔ ویٹو پاور تو آپ کے پاس ہے۔“

”مگر میں بھی نہیں چاہتی کہ تم جاؤ۔“

”مگر کیوں گرینی؟“ وہ روہائی ہوئی۔

”بس میں نے کہہ دیا کہ تم نہیں جاؤ گی تو تم نہیں جاؤ گی۔ یہ میرا آرڈر ہے۔ کیا تم اپنی گرینی کی بات نہیں مانو گی۔“

”تو کیا گرینی اپنی یشا کی بات نہیں مانیں گی۔“

”نہیں۔۔۔ کم از کم یہ تو نہیں۔“ ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”آپ نے اس سے پہلے میری کون سی باتیں مان لی تھیں۔ پچھلے سال بھی نہیں جانے دیا۔ آخر کیوں؟“

سب لوگ توجہ دیتے ہیں۔

”سب میں اور تم میں بہت فرق ہے یشا۔“ ان کی سر مٹی آنکھوں میں خوف سا لہرایا۔

”کوئی فرق نہیں ہے۔۔۔ بس مجھے پتا ہے۔ آپ نہیں چاہتیں کہ میں آپ کے پاس سے ذرا بھی دور جاؤں۔“

”یہی سمجھ لو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔ ایسے میلوں ٹھیلوں میں بھانت بھانت کے لوگ ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کون کون کہاں کہاں سے آیا ہو۔ میرا بس چلے تو میں نہیں چھپا کے رکھ لوں۔“

”آپ مجھے کس سے چھپانا چاہتی ہیں گرینی؟“



یہاں کے سوال یہ ان کے چہرے پہ شگنی سی در آئی۔  
 ٹرے پرے کھسکا کے انہوں نے سرو مہی سے کہا اور  
 کتاب چہرے کے آگے کر لی۔  
 ”اب تم جاؤ مجھے کچھ پڑھنا ہے۔“

☆☆☆

”کیا؟ تمہیں پکا یقین ہے سارا۔۔۔ کہ تم اسی کی  
 بات کر رہی ہو؟“

مرہ ریسور کان سے لگائے ماتھے پہ بے پناہ بل لیے  
 بات کر رہی تھی۔

پر شکوہ خانم وہیل چیردھکیلی ٹیبل تک صرف  
 اخبار لینے آئی تھیں مگر سارا کا نام سن کے ان کے ماتھے  
 پہ مہر کے ماتھے سے بھی دھگے بل جگہ بنا گئے۔ زہر لگتی  
 تھی انہیں سارا امر کی دوست اور پڑوس۔  
 ”اکہلی آ رہی ہے کیا؟“

مہر کے لہجے کی تشویش نے انہیں کھلنے پہ مجبور  
 کیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے اس سے ملنے جانے کی نہ  
 میں نے پہلے کبھی اسے لفٹ کرائی تھی نہ اب کراؤں  
 گی اور تم جانتی ہو کہ مجھے اس کے نام سے بھی چڑھے تو  
 بطور خاص مجھے فون کر کے یہ منحوس خبر دینے کی کیا  
 ضرورت تھی۔“

مہر کے کھٹ سے ریسور رکھ دینے پہ پر شکوہ خانم  
 نے دبے دبے طنز کے ساتھ کہا۔

”یہاں تو صبح سے اسٹور روم کی صفائی کر رہی ہے  
 اس نے تو تمہیں تنگ بھی نہیں کیا آج۔۔۔ بلکہ شاید  
 تمہارا اور اس کا آمناسنا بھی نہیں ہوا۔ پھر موڈ کس  
 وجہ سے خراب ہے۔“

”میرا موڈ خراب کرنے کے لیے اور بہت سے  
 لوگ ہیں۔ کچھ پہلے سے موجود تھے۔ کچھ اب آ رہے  
 ہیں۔“

مہر نے لہجے میں نخوت بھر کے کہا۔

”کون آ رہا ہے؟“

”کھارا۔“

”کھارا۔“ پر شکوہ خانم پہلے چو نکلیں پھر خوشی سے  
 بھرپور کپکپاتے لہجے میں پوچھنے لگیں۔  
 ”کھارا واپس آ رہی ہے ہمیشہ کے لیے؟“

”ہمیشہ کا تو پتا نہیں۔۔۔ مگر دس سال بعد آخر وہ  
 واپس آ رہی ہے۔“

”تو تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو اس کے آنے  
 سے۔“

”اور آپ اتنی خوش کیوں ہو رہی ہیں؟“ وہ جزبزی  
 ہوئی۔

”میں تو اس لیے خوش ہوں کہ وہ میری منہ بولی بیٹی  
 ہے۔ بہت محبت ہے ہمارے درمیان جسے فاصلے بھی  
 کم نہیں کر سکے اور میں دس سال بعد اس سے ملوں  
 گی۔ مگر تم اب سیٹ کیوں ہو؟ کھارا اسے تمہاری دشمنی  
 کی تو اسبوجہ بھی باقی نہیں رہی۔“

”وجہ ختم ہوئی تھی۔ دشمنی نہیں اور ہاں آپ اس  
 سے ہرگز نہیں ملیں گی۔“

مہر کی تنبیہ انہیں مشتعل کر گئی۔  
 ”مہرا میں کس سے ملتی ہوں کس سے نہیں یہ  
 میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں نے اپنے فیصلے کبھی کسی  
 کے مشورے سے نہیں کیے۔“

”تو کم از کم اس گھر میں وہ آپ سے ملنے نہیں آئے  
 گی۔ آپ کا دل بہت ادا اس ہو رہا ہے اپنی بھانجی سے  
 ملنے کے لیے تو جا کے مل آئیں۔ مگر پہلے پتا ضرور کر  
 لیجئے گا کہ آپ کی امیر کبیر بھانجی یا منہ بولی بیٹی آپ سے  
 ملنا بھی پسند کرتی ہے یا نہیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد  
 اس کی چھوڑی ہوئی دولت اور جائیداد میں ہر سال  
 اضافے ہوتے رہے ہیں۔ ان دس سالوں میں تو وہ اور  
 بھی تو پچھڑ بن گئی ہوگی۔ پتا نہیں آپ کو پچھڑ بنی بھی  
 ہے یا نہیں۔“

☆☆☆

یہاں اپنے بستر پہ اوندھی لٹی پو کو دوپچے اس سے  
 گلے شکوے کر رہی تھی۔

”تم نے دیکھا پوسہ کرینی بھی مہرما سے ڈرتی ہیں“

کتنی بکی ہیں کہ انہیں زمانے سے ڈر لگتا ہے مجھے کسی  
 سے نقصان نہ پہنچ جائے اس بات سے ڈر لگتا ہے  
 لیکن سچ تو یہ ہے کہ انہیں مہرما سے ڈر لگتا ہے۔ ان کی  
 مرضی کے خلاف وہ مجھے نہیں جانے دیتیں۔ مگر  
 یہاں کو مہرما سے اتنا ڈر نہیں لگتا ہے پتا ہے آج میں نے  
 کیا کیا؟ ان کے کھانے میں اتنا نمک ملا دیا کہ وہ مہرما کی  
 زبان سے بھی زیادہ کڑوا ہو گیا۔“

کھلکھلا کے ہنستے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔ اب پو  
 کے بجائے ٹوٹی اس کی ہتھیلیوں میں دینی اس کے  
 چہرے کے اوپر مسکرا رہی تھی۔

”اور ٹوٹی۔۔۔ تم نے زینی کے بال دیکھے؟ بالکل  
 ہنسل اینڈ گریٹل کی اسٹوری والی witch  
 جادو گرینی جیسے ہو رہے تھے۔ پتا ہے کیوں؟ یہاں اس  
 کے شیپو میں کیننگ سوڈا جولا دیا تھا۔“

نہی سے لوٹ لوٹ ہوتی وہ اپنے کارنامے سن رہی  
 تھی۔ اسے لگ رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ سب ہنس  
 رہے ہیں۔ پوسہ ٹوٹی کی ماؤس، ڈونلڈ ڈک، ٹام۔۔۔  
 اور۔۔۔ اور۔۔۔ سنڈریلا کے اواس سے چڑھے پہ بھی  
 مسکراہٹ جھلک رہی ہو۔ وہ سنڈریلا کے سامنے جا  
 کھڑی ہوئی۔

”دوست۔۔۔ تمہاری اور میری کتنی بہت سی باتیں  
 ایک جیسی ہیں نا میں بھی تمہاری طرح کیوٹ ہوں  
 تمہاری طرح مجھے دیکھ کے بھی سب کو پیار آ جاتا ہے۔  
 سوائے مہرما کے۔ تمہاری طرح میری بھی ایک  
 کھڑوس اسٹیپ مام ہے۔ دو ڈفرس اسٹیپ سسٹرز  
 لیکن جاتی ہو تمہارے پاس وہ نہیں ہے جو میرے  
 پاس ہے۔ کیس کرو۔۔۔ نہیں پتا نا؟ اول۔۔۔ ہول۔۔۔ میں  
 گرینی کی بات نہیں کر رہی۔ اگر میرے پاس گرینی ہیں  
 تو تمہارے پاس فیبری بند ہیں۔ مگر میرے پاس وہ چیز ہے  
 جو تمہارے پاس بھی ہو ہی نہیں سکتی۔ میرے پاس  
 اپنی زندگی خود جینے کا حوصلہ ہے، امید ہے، خواب ہیں  
 اور ہاں ہمت بھی ہے۔“

وہ کھل کے مسکرائی۔  
 اس کے چہرے کے ہر نقش میں تابندگی جاگ

اٹھی۔

پھر ایک کوند اسالاس کے ذہن میں اپکا۔  
 ”وہ۔۔۔ لیس۔۔۔ حوصلہ۔۔۔ ہمت۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے  
 اپنے خواب پورے کرنے کے لیے کسی کام نہ دیکھنے کی  
 ضرورت نہیں ہے۔ میں میلے میں جاؤں گی اور ضرور  
 جاؤں گی اور زبردست ساڈریس بھی بناؤں گی۔ دیکھتی  
 ہوں کون روکتا ہے مجھے۔“

اس نے پل بھر کے لیے اپنی آنکھیں میچیں۔ جگر  
 جگر کرتے ہیرے جیسے کسی نے اوٹ میں چھپا دیے۔  
 پھر اپنی سدا کی شریر مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے  
 نکلی۔ اس کا رخ خامی اور زینی کے کمرے کی جانب تھا۔  
 دونوں اس وقت کالج میں تھیں۔ بیڑ۔ وہ لباس پھیلا  
 کے رکھا ہوا تھا جس کے بارے میں ابھی تک یہ طے  
 نہیں ہوا تھا کہ میلے میں اسے ان دونوں میں سے کون  
 پہن کے جانے والا ہے۔ دونوں کا دل ہی اس پہ آیا ہوا  
 تھا۔ بڑی باری ستاروں والی لیس سے سجی میکسی  
 تھی۔ جس کی آستینوں پہ بڑے بڑے نگ ٹنکے تھے۔  
 میٹھا نے پشت پہ چھائی فینچی نکالی اور نہ صرف لیس  
 کو جگہ جگہ سے ٹکراتا رہا، بلکہ آدھے سے زیادہ  
 نگ بھی اس بے دردی سے نوچے کہ وہاں سے کپڑا ہی  
 پھٹ گیا۔

☆☆☆

”سو پ ٹھنڈا ہو رہا ہے گرینی۔“

یہاں پر شکوہ خانم کے سامنے سلاد رکھتے ہوئے  
 انہیں مخاطب کیا جو مہر کے بگڑتے موڈ کو بھانپ کر خود  
 بھی بد مزگی کی محسوس کر رہی تھیں۔ زینی ابھی کالج  
 سے نہیں لوٹی تھی اور ای می آتے ہی کھانے پہ لوٹ پڑی  
 تھی۔

”تو آپ کارا کو فون کرنے سے باز نہیں آئیں۔“

آخر میرے اپنے اندر کالا اگل دیا۔

”اب تم میری جاسوسی بھی کرنے لگی ہو؟“

”میں نے فون پہ ڈائل نمبرز میں دیکھا تھا۔“

”اسی کو جاسوسی کہتے ہیں مہر۔“ انہوں نے



ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”اور تم نے خود کہا تھا کہ میں اس کے گھر جا کے اس سے ملنا چاہوں تو جاسکتی ہوں تو اس کے لیے مجھے اسے فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دینی تھی۔“

”آخر یہ کارا ہے کون؟“ امی نے دونوں نوالوں کے درمیان وقفے کے دوران پوچھنے کی زحمت کی۔

”میری منہ بولی بیٹی۔ مجھے آنی کتنی ہے۔ اس لیے مجھ سے میری بھانجی ہے۔“

”واؤ۔ یعنی آپ ان کی آنٹی ہیں تو وہ ہماری آنٹی ہوئیں۔“

امی نے مہر کی شعلہ بارنگا ہوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے اشتیاق ظاہر کیا۔

”گریٹی۔ مجھے ضرور ملوایئے گا ان سے۔“ پیشانے بھی جھٹ فرمائش کی۔ ”میں نے کبھی کوئی آنٹی نہیں دیکھی۔“

”دیکھا تو تم نے اپنی ماں کو بھی کبھی نہیں ہے۔ تم اس سے ملنے کیوں نہیں چلی جاتیں۔“

مہر کے سگلتے لہجے پہ پیشا بھجھی گئی اور اپنی پلیٹ میں کھانا نکالتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ پلوں پہ انگے آنسو لیے وہ کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گئی اور امی نے دُش اپنی جانب سرکالی۔

”مہر۔ تم کیوں اس بچی کا دل دکھاتی ہو؟“

پیشا کو خام نے ملال سے اسے جاتے دیکھا جو صبح سے خالی پیٹ اتنے بڑے سارے گھر کی صفائی سہرائی میں ہلکاں تھی۔

”اور جو میرا دل دکھ رہا ہے اس فتنے کے آنے سے۔ میں کیسے اس عورت کو برداشت کروں جو میرے شوہر کی منگیتر تھی۔“

”سکلی۔ بابا کی فیاضی۔“

”چپ کو تم۔ کھانا کھاؤ اپنا۔“ مہر نے امی کے بار بار جند بانی ہو جانے پہ اسے گھر گا۔

”تم بچیوں کے سامنے کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو؟ سیف اللہ نے تمہاری خاطر کارا سے مٹائی توڑی تھی۔ نفرت تو کارا کو تم سے ہونی چاہیے تھی۔“

”وہ تو شکر ادا کرے“ میں نے اسے سیف اللہ کی بیوی بن کے یہ کھٹی ہوئی زندگی نہیں گزارنے دی۔ ورنہ آج وہ میری جگہ بیٹھی اس کھنڈ میں آنے آنے کا حساب لگا رہی ہوتی اور سوکن کی اولاد کو بھی بھگت رہی ہوتی۔ وہ تو مزے میں رہی۔ سیف اللہ کے مٹائی توڑتے ہی ایک امیر کبیر اس کے ہاتھ لگ گیا۔ جس کے مرنے کے بعد اس کی پیرس والی ساری پر اپنی پر وہ راج کر رہی ہے۔ سنا ہے شاہانہ طرز زندگی جی رہی ہے وہاں۔“

”اوه خدا یا۔۔۔ تم اب تک بے کار کی دشمنی بالے بیٹھی ہو۔ اب ان باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سیف اللہ اس دنیا میں نہیں رہا اور کارا ایک بیوہ عورت ہے۔ مال دار بیوہ کسی سے کمر ہے تو یہ وہ۔ تنہا یہ باتیں کرنا اب ذہب نہیں دیتا۔“

پیشا کو خام نے سمجھا چاہا مگر وہ مزید بھڑکی۔

”ہاں اور تب ذہب دیتا تھا جب وہ جوان بیوہ تھی اور جب سیف اللہ اس دنیا میں تھا۔ کتنا ایڑی چوڑی کا زور لگایا تھا آپ نے کہ کارا کی دوسری شادی سیف اللہ سے ہو جائے۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔ ہاں۔ میں نے اس کی جوان بیوگی اور بے شمار دولت و جائیداد دیکھ کے یہ ضرور مشورہ دیا تھا اسے کہ وہ کسی پر خلوص بندے کا ہاتھ تھام لے۔ اپنی جوانی بیوگی کی نذر نہ کرے ورنہ دنیا اسے لوٹ لے گی۔ مگر وہ خود ہی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”آپ نے اپنی خواہش دوسرے طریقے سے پوری کر لی۔ مجھے سوچنے لانے کی خواہش۔ میں تو ہمیشہ سے آپ کو ناپسند تھی۔ صرف مجھے زنج کرنے کے لیے آپ نے سیف اللہ کو اکسایا دوسری شادی کے لیے۔“

پیشا کو خام کے پاس ہمیشہ کی طرح آج بھی ان الزامات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

پیشا آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے میں

آئی تھی۔ چند منٹ بیڈ پر بیٹھ کے ٹانگیں ہلا ہلا کے مہر کو کونے کے بعد وہ جھکی۔ بیڈ کے نیچے سے وہ ٹوکری گھنٹ کے نکل۔ جس میں گل سے لے کر اب تک کلنی بال مسروقہ جمع کر رکھا تھا۔

ایمی کی میکسی سے اتاری لیں۔

بڑے بڑے جھیلے ننگ۔

کچھ مختلف رنگین ریشمی کپڑوں کی چھوٹی بڑی کترینیں۔

زینی کے کچھ زیورات۔

مہر کے کمرے سے چرائی لپ اسٹک اور ہنڈیا۔

اس کی آنکھوں میں بھرے شرارت کے ستارے جھلنے لگے۔ وہ ہنڈیا ماتھے پہ چپکا کے مختلف کترینوں کو جوڑ گئے ایک ساتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھ لینا۔ ایسا شان دار لباس بناؤں گی۔ اتنی اچھی اتنی پیاری لگوں گی کہ بس۔“

☆ ☆ ☆

ایمی بھرے پیٹ کے خمار سے ڈولتی۔ جھومتی کمرے میں داخل ہوئی اور بیڈ پہ پھیلی میکسی کو دیکھ کے مسکرائی۔

”اسے تو میں ہی پنوں گی چاہے کسی بھی طرح پھنسا پڑے۔“

اس نے بڑے شوق سے میکسی اٹھائی اور اپنے ساتھ لگنے ہی لگی تھی کہ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ عین اسی وقت زینی اندر داخل ہوئی۔ وہ صبح کی گھر سے نکلی اب لوٹ رہی تھی۔

”اوه گاٹ۔ اتنا گھوٹے آج ہم۔ کس۔“

اور جب اس نے میکسی کا حشر دیکھا تو پورا حلق پھاڑ کے چلائی۔

”مئی کی بچی۔“ اس کی چیخ کی بازگشت سے امی بھی سکتے سے باہر آئی اور خود بھی چیخنے لگی۔

”مٹولی۔ یہ کیا کیا تم نے؟“

”میں نے یا تم نے؟“ امی بھی اس سے جھپٹی۔

”میں ایسا کیوں کروں گی۔ مجھے تو یہ کل شام میلے

میں پہن کے جانا تھا۔“

”تم نے نہیں۔ میں نے پہنا تھا۔ اسی لیے تم نے اسے خراب کیا“ تاکہ میں نہ پہن سکوں بھل کڑی۔“

”شٹ اب امی۔ اصل میں تم نے ہی اسے خراب کیا ہے کیونکہ اسے پہن کے تم کی بوری لگتیں۔ بلکہ تم اسے پہن ہی نہیں سکتی تھیں۔ یہ تمہارے بارہ من کے وجود پر پوری اتنی نہیں سکتی تھی۔ اسی غصے میں تم نے اسے برباد کیا ہے“ تاکہ تم نہیں تو کوئی اور بھی اسے نہ پہن سکے۔“

”ماما۔“ امی روٹی پر پختی باہر کو نکلی۔

☆ ☆ ☆

بیڈ کے پائنٹی دیک کے بیٹھی بیٹا گود میں کترینیں رکھے انہیں سوتی دھاگے کی مدد سے جوڑ رہی تھی۔ لیپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے یہ کام کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مگر وہ لاسٹ بھی ان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سب ہی جانتے تھے، نیند کی کتنی بچی ہے۔ اتنی دیر تک جاگ نہیں سکتی۔ اس کے کمرے سے روشنی آتے دیکھ کے ضرور کسی نہ کسی نے ٹوہ لینے کے لیے اندر جھانک لینا تھا۔

”تمہیں پتا ہے پوس۔ ایہ میٹ میں نے ماما کے روم کے کرٹن سے اتاری ہے۔ وہ سمجھیں گی چوہا کتر کے لے گیا اور اس کو میں ایسے رن کی طرح یہاں لگاؤں گی اور یہ گریٹی کی ساڑھی کا بارڈر۔ وہی ساڑھی جو پچھلے سال مجھ سے استری کرتے ہوئے جل گئی تھی۔ اس کا بارڈر میں نے اتار کے سنبھال کے رکھ لیا تھا۔ اسے میں یہاں یہ لگاؤں گی تو کتنا جگ جائے گا نا۔ واہ۔“

رنگ برنگی کترینیں جوڑ کے بنایا لباس اس نے اپنے سامنے پھیلا کر رکھا تو کھوسی گئی۔

سالوں سے خوابوں میں سنے متروں کی گونج آج کھلی آنکھوں کے ساتھ بازگشت بن کے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور جلدی سے لباس کو گول مول کر کے ٹوکری میں رکھ کے ٹوکری بیڈ کے نیچے دوبارہ کھسکا دی۔



”چلو اب سو جاؤ یشا! صبح بہت کام ہے۔“

اور صبح اسے واقعی بہت کام تھا۔ خیر کام تو وہی سب تھے جو روز ہوتے تھے۔ مگر پہلے ان کاموں کو نمٹاتے نمٹاتے اسے صبح سے رات ہو جاتی تھی۔ مگر آج اسے ہر حال میں دوسرے تک ان کاموں سے فراغت حاصل کر سکتی تھی۔ اس لیے وہ پھر کی بن گئی۔ ابھی بیڑھیوں پر پوجا لگا رہی ہے تو ابھی جالے اُتار رہی ہے۔ ابھی پن کی کینٹ خالی کر کے صاف کر رہی ہے تو ابھی کپڑے دھو رہی ہے۔ ساتھ ساتھ کھانا بھی بن رہا تھا۔ پر شکوہ خانم نے اس کی پھرتیاں دیکھ کے پوچھ ہی لیا۔

”کیا ہو گیا ہے یشا۔ سکون سے۔۔۔ مشین کیوں بن رہی ہو؟“  
”آپ نہیں جانتیں۔۔۔ مرہما نے کتنی لمبی لسٹ بتائی ہے کاموں کی۔“  
”ہاں تو ان کی سی نئی بات ہے اور وہ تو ابھی شام ہونے تک دونوں لڑکیوں کے ساتھ نکل جائے گی۔ میلے کے لیے اور ظاہر ہے رات کو دیر سے لوٹے گی۔ تم آرام سے کام کرتی رہنا۔“  
”نہیں۔۔۔ مجھے شام سے پہلے پہلے فارغ ہونا ہے۔“

اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔  
”کیوں، شام سے پہلے کیوں؟“ وہ خشکیں تو یشا ذرا سنبھل گئی۔  
”دوسرے دراصل۔۔۔ ایک بہت اچھی بک ملی ہے مجھے اسٹور روم کی صفائی کرتے ہوئے، وہ پڑھوں گی وہ بھی روم بند کر کے نماز آتے آتے ناکیلے میں پڑھنے کا۔“  
”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔“ وہ مسکرائیں۔ ”چلو۔۔۔ شکر ہے تم نے بھی کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کا سوچا۔ میں نہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔“

☆☆☆

میلے میں ابھی شام کی سیاہی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ گدلی گدلی سی کمر میں روشنیاں اپنا راستہ بتا رہی

تھیں۔

ایمی کی نظریں کھانے پینے کی انواع و اقسام کی چیزوں پر پھٹک رہی تھیں تو زینی کپڑوں اور بننے سنورنے کے دیگر لوازمات کو لپٹا کر دیکھ رہی تھی۔ مہر اپنی دوست سارا کے اسٹال پر بھونٹائی محنت کش عورتوں کے ہاتھ کی بنی مصنوعات کا جائزہ لے رہی تھی۔ جن سے سستے داموں محنت کروا کے سارا یہ مصنوعات بڑے مہنگے داموں نیپال، سری لنکا اور بھارت جیسی بڑی مارکیٹوں تک بھیجا کرتی تھی۔ اس نے یہ گراپے مرحوم شوہر سے سیکھے تھے۔

”کتنی خوب صورت ہیٹ ہے۔“ مہر نے تینوں سے بنا ہیٹ چھوا۔  
”تم لے لو۔۔۔ تم پہ سوٹ کرے گا۔“ سرخ ہٹھکھکھ پالے بالوں والی سارا نے ایک کاروباری سی مسکراہٹ کے ساتھ پیش کش کی۔ جس سے مہر ہرگز ہرگز خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی سارا کے ”لے لو“ سے مراد ہے ”خرید لو۔“  
”نہیں۔۔۔ میں لے کر کیا کروں گی۔ ساڑھی کے ساتھ ہیٹ کتنا مضحکہ خیز لگے گا۔“  
”یہ چٹائی دیکھو ہاتھ کی بنی ہے۔“

”ہول۔۔۔“ مہر نے چٹائی کی بہت سے زیادہ اس سے لگے ٹیک کو زیادہ بغور سے دیکھا اور پھر دلچسپی ظاہر کی۔  
”کام بہت بڑھ گیا ہے مہر۔“ سارا نے اتر کے کہا۔  
”مجھ سے تو اب سچ پوچھو تو سنبھلا بھی نہیں جا رہا۔“  
”تم نے بتایا تو تھا کہ تمہارے سر نے تبت سے کسی کو بھیجا ہے تمہارے پاس۔“  
”ہاں۔۔۔ مگر سارلی رتے داروں پہ میں اتنی جلدی اعتبار نہیں کر سکتی۔“ وہ بھی اس صورت میں جبکہ میرے شوہر کے ساتھ بھی میرے تعلقات خاص اچھے نہ رہے ہوں۔“

مہر کو اس کے شوہر اور سسرال والوں کے تذکروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے وہ گردن گھما کے اپنی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔ زینی اینڈین اسٹال سے مندی لگوا رہی تھی اور ایمی کسی ایرانی اسٹال پہ کھڑی ان کی

ملھائیاں چیک کر رہی تھی۔

☆☆☆

یشا اپنے بالوں کی مانگ نکالے پنوں کی مدد سے جھومر سجا رہی تھی۔ جو اس نے مہر کے کسی پرانے مندو پتے سے نکالا تھا۔ چاندی کا جھومر۔ جو کالا پڑ رہا تھا۔ یشا جانتی تھی۔ لیکن یوں مہر کے سے چمکا کے اسے نئے جیسا کیا جاسکتا ہے۔ مہر اس نے ایسا کرنے کی قطعاً ”زمت نہیں کی تھی۔“ کا جمل اناڑی پن سے بہت زیادہ تھوپ لیا تھا اور بروں کے اوپر میوون نیل پالش سے نقطے سے بھی لگا رکھے تھے۔ یہ اس نے مہر کی شادی کی تصویروں میں دیکھا تھا۔ وہ کسی بنگالی مشاطہ سے تیار ہوئی تھی اور تبت شاید وہاں کی دلہنیں ایسے ہی افشال اور نیل پالش کی مدد سے چرے پہ گل کاریاں کیا کرتی تھیں۔ مانتھے پہ بڑی سی لہو رنگ بندیا۔ ہونٹوں پہ نارنجی رنگ کی لپ اسٹک تھوپنے کے بعد اس نے غور سے اپنا جائزہ لیا تو وہ ہٹھک سی گئی۔

”بس۔۔۔ یہ کیا ہے؟“ الجھن بھرے انداز میں وہ یاد کرنے لگی کہ یہ عجیب وغریب روپ اسے کس کی یاد دل رہا ہے۔ مگر وہ نہ نہ چھٹ سکی۔

ہندو دیو مالائی کر داروں والا لباس۔۔۔ زرق برق سجاوٹ کے ساتھ۔۔۔ دیے ہی بندھے بال۔۔۔  
”چلو۔۔۔ اچھا ہے۔۔۔ ایسے کوئی پہلی نظر میں مجھے پہچان بھی نہیں سکے گا۔“

اس نے بے فکری سے سوچا اور کھڑکی سے کود کے پچھلے راستے باہر نکلے گی۔

پر شکوہ خانم اپنے کمرے میں کتاب پڑھتے ہوئے اس اطمینان میں تھیں کہ آج ان کی پیاری پوتی بھی مطالعے میں مگن ہے۔

☆☆☆

”yupeeee“

یشا نے میلے کا گھوم گھوم کے جھوم جھوم کے جائزہ لیتے ہوئے خوشی سے لہو لگایا۔

اس کے پاس ایک nguttrain (بھونٹائی

کرنی) نہیں تھا۔ مگر وہ ان سب سے زیادہ چمک رہی تھی اور ان سب سے بڑھ کر نمل تھی جو جینٹیل بھر کے یہاں آئے تھے۔

وہ چوڑیاں نہیں خرید سکتی تھی۔  
پچکا (گول گے) نہیں کھا سکتی تھی۔  
مندنی نہیں لگو سکتی تھی۔

مگر وہ اس سرخ رواجی لباس والی رقاصہ کا لوک رقص تو دیکھ سکتی تھی۔ جو جمع کے درمیان بڑی مہارت کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

اس کا بھاری بھر کم لباس یشا کو پہننا پڑ جاتا تو شاید اس سے دو قدم چلنا بھی دو بھر ہوتا۔ اسی لیے وہ رشک سے اس کے زرت بھاؤ دیکھ رہی تھی۔

رقص دیکھنے والے مجمع کی اکثریت رقاصہ کے بجائے جب یشا کے عجیب وغریب لباس اور حد سے زیادہ نمائیاں ہوتے میک اپ بہ منبزل ہونے لگی تو یشا وہاں سے کھٹک گئی۔ اب وہ محض دیکھنے والے کے کمال دیکھنے میں مگن تھی۔

اس سے ذرا فاصلے پہ ایمی آسمانی جھولے میں پھنسی اوپر کی جانب جارہی تھی۔ یشا کی ایک جھٹک دیکھتے ہی وہ ہری طرح چو گئی۔  
”یشا؟“

اتنے میں جھولا گھوم گیا۔ اب ایمی کی پشت یشا کی جانب تھی۔ جھولے کی نشست میں بری طرح پھنس کے بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ گھوم کے اسے دوبارہ غور سے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی اور جب تک جھولا ٹرک کے دوبارہ پہلی والی حالت میں آیا۔ یشا کسی چھلاوے کی طرح ایک بار پھر غائب ہو چکی تھی۔

”کہاں گئی بالکل یشا جیسی ہی تھی وہ۔ اگر اتارنگ نہ محب رکھا ہوتا چرے پہ۔“

زینی کسی اور اسٹال پہ مہر کو زنج کیے دے رہی تھی۔  
”ماما۔۔۔ پلیز۔۔۔ لے دیں نا۔“

”بہت مزگاہے زینی۔ اور تمہارا پیاس پہلے سے بہت کپڑے ہیں۔“  
”نکس۔۔۔ ماما۔“



وہ ٹھنک کے ناراضی دکھانے لگی کہ دور کھڑی بیٹا پہ نظر بڑ گئی۔ جو غبارے والے کو ترسی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ایک غبارہ چھوٹ کے ہوا کے دوش پہ دور جانے لگا تو بیٹا لپک کے اسے پکڑنے لگی۔

”ماما۔۔۔ وہ دیکھیں وہ بیٹا ہے نا؟“

”بیٹا؟ وہ یہاں کیسے؟“

مرکی تمام حیات چوس ہو گئیں۔ اس کی عقابی نظریں بجوم میں اسے ڈھونڈنے لگیں۔

”میں نے ابھی دیکھا۔۔۔ وہ کچھ کچھ بیٹا جیسی ہی تھی۔“

”اوہ۔۔۔ کچھ کچھ لگ رہی ہوگی نا۔۔۔ میں سمجھی تم نے واقعی بیٹا کو دیکھ لیا ہے۔ ارے۔۔۔ یہ ایسی کو کیا ہوا؟“

دور سے ایسی کو جھولے سے اترتے اور الٹیاں کرتے دیکھ کے وہ بیٹا بیانی سے اس جانب بڑھی۔

”ماتا کھاؤ گی تو جگر تو آس گے نا جھولے۔“

زینی نے ناک سکوڑتے ہوئے اسے جھاڑا جس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

”جگر تو مجھے بیٹا کو دیکھ کے آئے تھے۔“

”بیٹا۔۔۔“ اب کے مر واقعی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ بیٹا کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ وہ نظروں میں

آچکل ہے۔ ساری تفریح پھینک بیٹ گئی تھی۔ وہ نظر بچا کے چلتی۔ چھٹی چھائی ایک جیسے کے پاس رک گئی۔

کسی سری لکھن جاو کر کاخمہ تھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ اندر گھس گئی۔

”واؤ۔۔۔“

خیمے کے اندر کا پر اسرار اور خواب ناک ماحول اس کی فطرت کو بے حد ہمایا۔

سیاہ پردے۔۔۔ سرخ قمقمے۔۔۔ سناٹا اور دیواروں پہ لٹکے عجیب و غریب نقوش والے مجسمے۔

ایک میز پہ رکھا ڈیر سارا ناٹاوس ساساں جو غالباً شجہ بے دکھانے کے کام آتا تھا اور ایک بنجرے میں

مقید سفید توتا۔

بیٹا نے کھونٹی سے لٹکا جاو گر کاسیہ چنڈ اتار اور پن لیا۔ ایک کرسی پہ رکھا سیہ چنڈے کا ہیٹ بھی سر پہ جمایا۔ حالانکہ اس میں سے اتھتی بدبو سے اس کا جی اٹنے لگا تھا۔ اب وہ مختلف شیشیاں وغیرہ اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگی۔ ایک میں سے سرمئی پاؤڈر کے قدرے موٹے ذروں والا سفوف نکال کے پتیلی پہ ڈالتے ہی اس کے کمانی ساز ذہن نے کر دٹ بدل۔

”شول۔۔۔ شول۔۔۔ نزل۔۔۔ نزل۔۔۔“ اب بیٹا جاو کے زور سے اس سفید توتے کو اپنے شزارے کا روپ دے گی۔

سفید کپڑوں والا شزارہ جو سفید ٹھوڑے پہ سوار روز رات بیٹا کے خوابوں میں آتا ہے اور اسے اپنے سنگ

گلابی پھولوں والی وادی میں لے جاتا ہے۔ جہاں سرخ پتھروں سے بنی آبشاریں ہیں۔ جن سے پھلی ہوئی

چاندی بہتی ہے اور جہاں کی جھیل میں اتنی نیلا ہٹ ہے، جتنی سنڈریلا کی تپلی میں ہے اور جہاں

بادلوں کے گولے ہاتھ سے اتنے ہی فاصلے پہ ہوتے ہیں جتنے فاصلے پہ انگوڑے خوشے میرے کمرے کی کھڑکی

سے۔۔۔ شول۔۔۔ شول۔۔۔ نزل۔۔۔ نزل۔۔۔ سفید توتے۔۔۔ اب تم سفید شزارے کا روپ دھار کے بیٹا کو

اپنے سفید ٹھوڑے پہ اس وادی میں لے جانے والے ہو۔ شول۔۔۔ شول۔۔۔ نزل۔۔۔ نزل۔۔۔

وہ آنکھیں بند کیے خواب ناک سی اور بھاری آواز بنائے جاو کرنے کی اپنی سی سعی کر رہی تھی۔ جب مار

خیمے کے آگے سے گزرتے ہوئے ان الفاظ کو سن کے مارے اشتیاق کے اندر قدم رکھ بیٹھا۔

”شول۔۔۔ شول۔۔۔ نزل۔۔۔ نزل۔۔۔“

بیٹا نے بند آنکھوں کے ساتھ اپنی مٹھی چہرے کے سامنے کی جس میں سفوف بند تھا اور اسے کھولتے

ہوئے زور کی پھونک ماری۔ سارا سفوف ہوا میں بکھر گیا اور مار کے چہرے کے آگے غبار سا چھا گیا۔

وہ چھینکنے لگا تو بیٹا نے فٹ سے آنکھیں کھول دیں اور مارے حیر کے گم صم ہو گئی۔

سفید لباس میں وہ بانگا جیلا شزارہ اس کے سامنے تھا جسے وہ اکثر خوابوں میں دیکھا کرتی تھی۔ اگرچہ اس

کے نقوش چہرہ واضح نظر نہ آنے کی وجہ سے وہ کبھی پہچان نہیں پاتی تھی۔ مگر وہ ہو، ہو ایسا ہی ہوگا۔ کھڑی ستوں ہانک۔۔۔ بڑی مغرور سی۔

سنہری دھاتی رنگت۔

نفیس مسکراہٹ۔

کاچی آنکھیں۔

خوشبو میں ڈوبا وجود۔ مار دونوں ہاتھوں سے غبار پرے ہٹا تا مسلسل چھینک رہا تھا۔

”what the hell do this“

بیٹا ایک دم جیسے ہوش میں آگئی اور اس سے پہلے کہ مار اس افتادے سے نپٹ کے اس پہ توجہ دیتا وہ یہاں سے بھی کھٹک گئی۔

☆ ☆ ☆

رات کے سناٹے میں فون کی گھنٹی کی کرخت آواز اور بھی کمرہ لگ رہی تھی۔ بر شکوہ خاتم کا کراہال سے

خاصا دور تھا۔ مگر یہ آواز انہیں بھی نیند سے بیدار کر گئی۔ بمشکل اپنی وہیل چیر دھکیلتی وہ کمرے سے

نکلیں اور تعجب سے بچے جھانک کر بیٹو میں۔

”کب سے فون بند رہا ہے۔ مر اور ایسی زینی تو گھر پہ نہیں ہیں۔ بیٹا کی نیند کب سے اتنی گہری ہونے لگی

کہ وہ فون کی آواز پہ بھی نہیں اٹھی۔“

اب ان کی وہیل چیئر کا رخ بیٹا کے کمرے کی جانب تھا۔ دروازہ کھول کے انہوں نے اندر جھانک کر

پکارا۔

”بیٹا! اور دھک سے رہ گئیں۔ کرا خالی تھا اور کھڑکی کھلی تھی۔“ کہاں گئی یہ لڑکی؟“

☆ ☆ ☆

”کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔“ مرنے فون کان سے ہٹا کے کہا غصے اور تملہاٹ سے اس کا برا حال تھا۔

”گرینی تو بیٹا کی ہیلپ کے بغیر نیچے آئی نہیں سکتیں فون سننے۔“

بیٹا جلتے جلتے ٹھنک کے رکے۔ انجانے میں وہ بالکل ان کے عقب تک پہنچی تھی۔

”اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ بیٹا گھر پہ نہیں ہے، بلکہ یہیں نہیں ہے۔“

”چلو ڈھونڈتے ہیں اسے۔“

”نہیں۔۔۔ یہاں اسے ڈھونڈنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں جلد از جلد گھر پہنچنا

چاہیے۔“ مرنے زینی کا آئینا سامت کر دیا۔

”کب تک یہاں گھومے گی، کبھی تو واپس لوٹے گی اور اگر وہ واقعی بیٹا ہے تو آج اس کی خیر نہیں ہے۔“

یہ سن کے بیٹا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ تیزی سے باہر کو جانے والے راستے کی جانب مڑی۔

”میں جتنی جلدی بھی نکلوں۔۔۔ ان سے پہلے تو نہیں پہنچ سکتی اور پھر یہ لادہ حال ہو گا کہ۔۔۔ سب سے

زیادہ ڈر تو گرینی سے ہے، پھر ماما تو زیادہ سے زیادہ ماریں گی۔۔۔ دو ٹام کھانا نہیں دیں گی، مگر گرینی کی ناراضی۔۔۔

اوہ فون۔۔۔“

وہ مہر کی پرانی کھنار اسی فون کی کے سامنے رکی اور پھر سر سے پن نکالتے ہوئے گھنٹوں کے بل نیچے بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

”وہ مام۔۔۔“ it is hell barring

مارتا تھے پہ شکن لیے لہجے میں جی بھر کے کوفت اور بے زاری سیٹے فون پہ بات کر تا پار کنگ کی طرف آرہا

تھا۔

”سوری۔۔۔ میں آپ کا ویٹ نہیں کر سکتا یہاں۔۔۔ میں واپس آرہا ہوں۔“

اپنی کار کے نزدیک آکے اس نے فون جیب میں رکھا اور ڈرائیونگ سیٹ کی جانب جاتے جاتے بری

طرح چونکا۔

”اوہ۔۔۔ فون ڈیم اٹ۔“

اس کا ٹائر پچر تھا۔

”ہو گیا۔۔۔ شاباش۔۔۔“

بیٹا کی آواز پہ وہ پلٹا۔ وہ فون کی کے نزدیک بیٹھی اس کا ٹائر پچر کرنے کے بعد ہاتھ جھاڑتی اٹھ رہی تھی۔



# پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں  
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے  
آپ اپنے بچوں کو تھکھ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے  
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”اوف۔ اوف۔ اوف۔“ نخرے کیوں کر رہے ہو؟“  
میشا نے اسے زور کا جھٹکا دے کر اندر کی جانب  
کھینچا۔ جس سے کشتی ایک بار تو ڈگمگاسی گئی۔  
”اوف۔“ مائز ڈولتے ہوئے اس کے کندھے تھام کر  
سہارا لے بیٹھا۔ ہلکا سا ہراس اس کے چہرے پر نظر  
آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کے میشا اپنے مخصوص انداز میں  
کھکھلا اٹھی۔  
”ڈرگئے؟ اور میں سبھی تم میرا ڈر دور کرو گے۔“

☆☆☆

مہر شید غصے کی حالت میں اپنی فوکسی کے پاس  
کھڑی تھی، جس کو مکینک پیچکر لگا رہا تھا۔ وہ مکینک  
جو خاصی تلاشِ بسیار کے بعد دستیاب ہوا تھا۔  
”یہ بھی اسی وقت پیچکر ہونا تھا۔“  
”مجھے بھوک لگی ہے ماما!“ ایمی کے منمنانے پر  
پھونکیں مار کے مہندی سکھائی زینبی اس پر الٹ پڑی۔  
”چپ کرو تم۔ سارا میلہ ہپ کر گئی ہو!“ اب بھی  
بھوک۔۔۔ ماما۔ ایک بار پھر فون کر گئے دیکھیں۔  
”کتی بار تو کیا ہے۔“

مہر نے کوفت سے کہنے کے بعد مکینک کو گھر کا۔  
”جلدی کرو ایک پیچکر لگانے میں اتنی دیر۔“  
”ماما! اگر وہ میشا ہی تھی تو کہیں ہم سے پہلے گھر نہ  
پہنچ جائے۔“  
”ایک دفعہ گھر جاتے ہیں۔ پھر۔۔۔ پتا چل جائے  
گا۔“

☆☆☆

مائز کا ڈراب کافی کم ہو چکا تھا۔  
وہ مکمل طور پر جھیل کے پر اسرار حسن۔۔۔  
چاندنی رات کے سحر۔ اور میشا کی گنگناہٹ کے  
ترنم میں گھویا ہوا تھا۔ جو چوچو چلاتے ہوئے مقامی زبان  
میں کچھ گابھی رہی تھی۔  
مگر جیسے ہی کشتی ایک بار پھر ذرا سا ڈگمگائی وہ ڈر گیا  
اور دونوں ہاتھوں سے کشتی کو تھام لیا۔ جسے دیکھ کے  
میشا کی گنگناہٹ پھر سے کھکھلاہٹ میں بدل گئی۔

دچپی محسوس ہو رہی تھی۔  
”کیونکہ اس کے مائز ہوتے ہی نہیں۔“ وہ  
کھکھلا کے ہنس دی تو مائز کے چہرے پر بھی تبسم  
کرن کی طرح پھوٹ پڑا۔  
”ایسی زبردست چیز تمہارے پاس ہے تو تم اکیلے  
کیوں نہیں چلی جاتیں۔“ اس بار وہ قدرے نرم لہجے  
میں بولا۔  
”مجھے اکیلے جاتے ڈر لگتا ہے نا۔۔۔ تم چلو گے نا  
میرے ساتھ؟“

اس نے اپنا ہاتھ سامنے پھیلا دیا تو مائز بے ساختہ  
اسے تھام بیٹھا اور کسی سحر کے عالم میں اس کے پیچھے  
کھنچتا چلا گیا۔ چھوٹی سی پہاڑی عبور کر کے وہ اسے  
جھیل کے کنارے لے آئی۔ جھیل کے اس طرف  
سرخ قلعے کے میناروں والا مندر رات کے اندھیرے  
میں ہولناک سا لگ رہا تھا۔ مگر چاند کی چاندنی جھیل  
کے پانی کو کھلی ہوئی چاندنی کی صورت بہتا دکھا رہی  
تھی۔

مائز نے ایک آدھ بار دن کے وقت اس جھیل کو  
سرسری سا دیکھا تھا۔ مگر اس وقت اس کا حسن دیکھ کے  
وہ مبہوت سا رہ گیا۔

”اس پہ جائیں گے ہم۔“ میشا نے کشتی کی ڈور  
کھولتے ہوئے کہا۔ ”یہ شارٹ کٹ ہے۔ میرا گھر  
پندرہ سولہ منٹ میں آجائے گا اور جو ایڈریس تم بتا  
رہے ہو وہ میرے گھر سے آگے ہے۔ بس کوئی آٹھ  
دس منٹ اور لگیں گے۔“

”مگر مجھے یہ پتا چلانا نہیں آتی۔“  
”مجھے تو آتی ہے نا۔۔۔ تمہیں کون کہہ رہا ہے  
چلانے کو۔ تم بس مجھے کمپنی دو رات کے وقت مجھے پانی  
سے بہت ڈر لگتا ہے، اب بھی نا۔“  
اس نے اپنا لباس دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے  
تھام کر ذرا سا اوپر کیا اور کشتی میں کود گئی، پھر اپنا ہاتھ  
برصا کے اسے بھی آنے کی دعوت دی۔  
مائز اس کا ہاتھ تو تھام بیٹھا مگر قدم برصا تے ہوئے  
جھک سا رہا تھا۔

”اوف۔ ہیلو۔“  
”شش۔۔۔ چپ۔“ میشا نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ  
کے اسے چپ کرایا۔ ”کسی کو بتانا نہیں۔۔۔ چپ۔“  
”تم نے میرا مائز کیوں پیچکر کیا ہے؟“  
اس کے برہم سے سوال پہ میشا کھکھلا کے ہنس  
دی۔  
”تمہارے مائز بھی ہیں؟ مجھے لگا، تم عام انسان ہو  
اور وہ عدد ٹانگوں سے کام چلا لیتے ہو گے۔“  
”میرا مطلب ہے۔۔۔ میری کار کے مائز۔“ وہ سٹ  
پٹا گیا۔

”یہ تمہاری کار نہیں ہے ایسی پیچکر کار پورے  
thimphu میں صرف ایک ہی ہے اور مجھے پتا ہے  
کس کی ہے۔“  
”میں اس کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے اپنی کار کی  
جانب اشارہ کیا۔ اس کے مائز کیوں پیچکر کیے تم نے؟“  
”میں کیوں کہوں گی پاگل ہوں کیا؟“  
”اور اس کے کیوں کر رہی ہو۔ پاگل ہو کیا؟“  
”اس کے پیچکر نہ کرتی تو ہاں۔۔۔ پاگل ہو ہی جاتی۔۔۔  
مگر تمہارے مائز۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہاری کار کے  
مائز پیچکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے میرے پاس۔“  
”اس کی وجہ ہے؟“

”ہاں ہے نا راستے میں بتاتی ہوں؟“ وہ اس کا بازو  
تھام کے آگے لے جاتے ہوئے احتیاطاً پیچھے مڑ کے  
دیکھنے لگی۔ کہیں سے مہر تو نہیں رہی۔

”راستے میں؟“ اس کی بے تکلفی پہ حواس باختہ مائز  
نے بازو چھڑا کے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ تم مجھے میرے گھر تک چھوڑ دو، اتنی رات  
کو میں اکیلی کیسے جاؤں گی۔“  
”مگر میرے مائز۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ میری کار کے  
مائز پیچکر ہیں۔ میں تو خود یہ سوچ رہا ہوں کہ اب واپس  
کیسے جاؤں۔“  
”ہم ایک ایسی چیز سے واپس جائیں گے جس کے  
مائز پیچکر بھی ہوتے ہی نہیں پوچھو کیوں؟“  
”کیوں؟“ مائز کو اس کی بے ربط بے تکی گفتگو میں



# ماہنامہ کرن

جولائی 2012ء کے شمارے کی ایک جھلک

- اداکار ”خالد انعم“ سے شائین ریڈ کی ملاقات
- اداکار ”سبیر حسین“ کے پھاڑے کے ساتھ
- ”آواز کی دنیا سے“ کے آ رہے ”منافع علی عسکری“ کی باتیں
- ”محبہ سے ملیے“ میں معنی ”انبلہ کن“ اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں
- ”درد دل“ خلیفہ زبیر کا دل سے وارنا دل
- ”دست کوڑہ گر“ فوزیہ یحیٰں کا دل سے وارنا دل
- ”تایاب ہیں ہم“ فتن علی کا دل سے وارنا دل
- ”میں دنیا قدم ساگر“ فرح خان کا دل سے وارنا دل
- ”زخم تازہ کی رازداں بارش“ فرحان نظر کا دل سے وارنا دل
- ”وہ ایک پری ہے“ ربانہ احمد بخاری کا دل سے وارنا دل
- ”یہ میری بھول تھی“ ماہر گل کا دل سے وارنا دل
- ”اعتبار حاصل زیست“ علی گل کا دل سے وارنا دل
- بڑی احمد علیک جیہ نہ انوار شہزادی عباس تانیہ رزان اور میر گل کے افسانے اور دلچسپ مضمون

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

کرن کتاب کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مجلہ سے پیش خدمت ہے، استفادہ کیجئے۔

”گر بنی!“ دونوں ہی ایک لمحے کے لیے سکتے کے عالم میں آگئی تھیں۔  
میشا ڈر کے مارے۔  
اور پر شکوہ خانم تعجب کے مارے۔  
دونوں پچی پچی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔  
”میشا!“ پر شکوہ خانم کے لیے میں حیرت کے ساتھ ساتھ بے پناہ بے یقینی بھی تھی۔ ”یہ سب کیا ہے میشا؟“

اچانک ان کی حیرت پہ غصہ غالب آگیا اور وہ زور سے چلا میں۔ غالباً ”سالوں کے بعد کسی نے ان کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔“  
”سوری۔ گرنی۔ وہ میرا بہت دل چاہ رہا تھا۔“  
”کیا مطلب ہے، دل چاہ رہا تھا؟ یہ فضول خیال تمہارے ذہن میں آتے ہی کیوں ہیں؟“  
”گر بنی۔ سوری ناں۔“ وہ قسم سی گئی، ان کا اتنا شدید رد عمل دیکھ کے۔  
”میں بھی آپ سے جھوٹ بول کے نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر آپ نے منع کر دیا تھا تو میں کیا کرتی۔ میرا بھی تو دل چاہتا ہے گھومنے پھرنے کو، مزے کرنے کو، آپ کیوں مجھے بند کر کے رکھنا چاہتی ہیں۔“  
”میں تمہارے جھوٹ بول کے جانے پہ اتنی ناراض نہیں ہوں میشا۔ جتنا آپ سیٹ میں تمہارے اس ڈریس اور طے کو دیکھ کے ہوں۔ کیوں بنایا تم نے یہ حلہ؟ کیوں اپنایا اس روپ کو؟ کیوں؟ کیوں؟“  
”شدت جذبات وغصہ سے ان کی آواز پھٹ سی گئی۔

”میرے پاس کوئی اچھا ڈریس بھی تو نہیں ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے اچھے اچھے کپڑے پہننے کو۔ ہاں ٹھیک ہے، میں نے چوری کی سب کی کچھ نہ کچھ چیزیں غائب کیں، مگر اس لیے کیونکہ مجھے یہ ڈریس بنانا تھا۔“  
”آخر یہ ہی کیوں؟ ایسا لباس ہی کیوں بنایا تم نے؟ آخر تم کیوں نہیں وہ سب بھول۔“  
”دکھ بھرے لہجے میں کہتے کہتے وہ چپ ہو گئیں۔

”دور؟“ وہ گھبرا گیا۔  
”تم کشتی کو سیدھا آگے لے جاؤ، آٹھ دس منٹ کے بعد کیپ پوسٹ نظر آئے گی۔ وہاں روک کر اتر جانا۔ رات ٹن لوگے تو سامنے وہ روڈ ہے، جس پہ تمہارا گھر ہے۔“  
وہ جاتے جاتے جلدی جلدی اسے ہدایات دینے لگی۔  
”ارے۔ مگر۔ سنو تو۔ لڑکی۔ مجھے کشتی چلانا نہیں آتی۔“

”وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ہائے۔ ہائے۔“  
وہ بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ڈر تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہ آجائے اور گھر تک کار اس نہ دیکھ لے۔ کیا پتا مہولہ سے شکایت لگانے پہنچ جاتا۔  
”اوہ گاؤ۔ اب کیا کروں؟“  
ماڑنے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔  
رات کی تاریکی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ گھبرا کے اٹھا تو کشتی کے ڈمک جانے پہ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ مگر پھر اس نے خود کو ہمت دلانی۔  
”کیا ہو گیا ماڑ۔ ذرا سی لڑکی اتنی دیر تک اکیلی چلائی رہی ہے۔ تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔“  
اس نے چو سنبھالے تب ہی اس کی نظر کشتی میں گرے بندے کی جانب گئی۔  
ماڑ نے جھک کے اسے اٹھالیا۔ چاندی کے بندے میں لگے سبز جینے سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ماڑ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے بندے کو تھیلی میں چھپاکے زور سے مٹھی بند کر لی۔

☆☆☆

میشا چوری چھپے دے پاؤں گھر کے اندر داخل ہوئی اور دائیں بائیں چوسک نظروں سے دیکھتی۔ سینڈل اتار کے ہاتھ میں پکڑے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آخری سیڑھی پہ پہنچ کے وہ ٹھٹھک کے رکی۔ کیونکہ سامنے پر شکوہ خانم کی وہیل چیرنے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

”لٹنا ڈرتے ہو؟“  
”میں اصل میں تم سے ڈر رہا ہوں۔“  
”مجھ سے۔ کیوں؟“  
”یہ تمہارا آؤٹ فٹ۔ یہ میک اپ۔ یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے تم کوئی witch (جادوگر) نہ نکل آؤ۔“  
اس کا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔ مگر میشا نے اسے خاصی سنجیدگی سے لیا۔  
”کوئی نہیں جی۔ جادوگر نیاں کوئی اتنی حسین ہوتی ہیں؟“

”تو تم حسین ہو؟ انٹر سٹنگ۔“  
”اور کیا؟ اتنی زیادہ۔“

”تو اپنے چہرے کو اتنے عجیب وغریب طریقے سے چھپا کیوں رکھا ہے تم نے۔ مجھے اس انداز میں صرف تمہارے ماتھے کا تھک۔ یہ گول گول سرخ دائرے۔ گندے طریقے سے لگی لپ اسٹک اور خطرناک حد تک پھیلا کاجل ہی نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے تم نے اپنی میٹھی میٹھی آنکھوں۔ لمبی ناک یا چہرے کے کسی اور نقص کو چھپانے کے لیے یہ سب کیا ہے؟“

وہ جان بوجھ کے اسے اکس رہا تھا۔ اس بہروپ بھرنے کی بوجھ جانا چاہتا تھا۔  
”جی نہیں۔ جن کے چہرے بہت زیادہ حسین ہوں وہ بھی خود کو چھپا کے رکھتے ہیں، تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے ان کو اور ان کے حسن سے کسی کا دل غنہ خراب ہو جائے۔“

”کس نے یہ خوش فہمی دلا دی ہے تمہیں؟“  
”سب ہی کہتے ہیں کہ میں بہت سوٹ اور بہت ہی کیوٹ ہوں۔ ارے۔ میرا گھر آنے والا ہے۔“  
وہ کشتی روک کے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”کہاں ہے گھر؟ مجھے تو یہاں کوئی گھر نظر نہیں آ رہا۔“

”بس۔ پاس ہی ہے۔ مجھے یہاں سے پیدل جانا ہوگا۔“



کیونکہ میٹھا ان کی ادھوری بات کا مفہوم جاننے کے لیے نیموالب لیے ان کو تک رہی تھی۔  
”جلدی کرو، کپڑے بدل کے آؤ۔ مجھے دویہ لباس ایک منٹ سے بھی پہلے آئندہ میں تمہیں اس طرح کے چیلے میں نہ دیکھوں اور فوراً اسے پیشتر اپنا منہ دھو کے آؤ۔“

اور جب تک میٹھا رگڑ رگڑ کے اپنے منہ سے وہ رنگ اتار کے آئی گریبی احاطے میں موجود اس لباس کو مٹی کا تیل چھڑک کے دیا سلامی دکھا چکی تھیں۔  
وہ چپ چاپ سنجیدہ سی شکل بنائے ان کے برابر کھڑی ہوئی اور آگ کے لپکوں پہ نظر جمادی۔  
مری اور زینی کے ساتھ بڑی شبلی سے اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر احاطے کے عین وسط میں الاؤ دکھتا دیکھ کے وہیں ٹھم گئی اور سب سے پہلے میٹھا کو تیز نظر سے گھورا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“  
”دیکھ رہی ہیں۔ رو رہی ہوں۔“ ”کیوں؟“  
زینی نے تنک کے پوچھا۔  
”جتنا کام تمہاری ماں اسے سوئپ کے گئی تھی اس کے بجائے تمہیں کرنا پڑتا تو تم بھی رو رہی ہوتیں۔“  
اس بار جواب پر شکوہ خانم کی جانب سے آیا۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے مہرنے بدستور شک بھری نظریں میٹھا جمائے پوچھا۔  
”کام کیے بھی ہیں۔ یا؟“

”آپ جانے چیک کر لیں۔ ایک ایک کام کر کے گئی تھی میں۔“ بے ساختہ کہتے ہی اس نے زبان کی نوک دانتوں تلے دبائی۔

”کہاں؟ کہاں گئی تھیں تم؟“  
”میرے ساتھ اسٹور روم کی صفائی کرنے گئی تھی اور اسے کہاں جانا تھا۔“  
پرشکوہ خانم نے مہر کی تشفی کرائی۔ جو بہر حال ابھی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ وہاں سے سوال پہ سوال نشر ہونا تھا۔

”وہ یہ کیا جلایا جا رہا ہے؟“

”بنایا تو ہے اسٹور روم کی صفائی کروائی ہے، کچھ فالتو سلمان نگلویا ہے وہ ضائع کر رہی ہوں۔“  
”ماما نے اتنے فون کیے، کوئی فون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔“

”ہم اسٹور روم میں تھے وہاں تک کیسے آواز جاتی۔“

”آخر یہ اسٹور روم میں رات کے وقت جانے کی کیا تک تھی۔“ ”مہر خود بھی رنج ہو رہی تھی ان کو بھی کر رہی تھی۔“

”تم بیٹیوں ماں بیٹیوں کو سوال در سوال کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ میرا گھر ہے۔ میرا جب دل چاہے گا، جہاں چاہے گا صفائی کراؤں گی، تمہیں خیال نہیں ہے ان سب باتوں کا تو کیا مجھے بھی نہیں ہوگا“  
خبردار جواب کوئی اور سوال کیا تو چلو میٹھا! مجھے اندر لے چلو۔ میں تھک گئی ہوں کام سے کم اور اس تفتیش سے زیادہ۔ تم بھی شام سے میرا سایہ بنی ہو۔ اب چل کے آرام کر لو۔“

میٹھا مسکین سی شکل بنائے ان کی وہیل چیئر اندر لے جانے لگی۔ مہر وہیں کھڑی ذرا غیر مطمئن سے انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔  
”مطلب وہ کوئی اور تھی جو ہمیں وہاں ملی؟ بس ذرا ذرا میٹھا جیسی تھی۔“

ایمی نے منگے جیسا سر ہلایا اور زینی نے سوال کیا۔  
”آپ کو کیا لگتا ہے ماما؟“  
”مجھے نہ اس لڑکی پہ اعتبار ہے، نہ تمہاری گریبی۔“

”تو آپ نے کچھ کہا کیوں نہیں؟“  
”تمہاری گریبی سے کوئی بحث کر سکتا ہے بھلا اور میرے پاس ثبوت بھی تو نہیں ہے۔“  
”میرا خیال ہے ماما۔ ہمیں ہی غلط فہمی ہوئی ہے، وہ وہاں ہوئی تو یہاں پہ سب کام کون کرتا۔ اور ہم سے پہلے وہ واپس کیسے پہنچتی۔“ ایمی جلدی مطمئن ہونے والوں میں سے تھی۔

☆ ☆ ☆

دن میں جب ایمی اور زینی کالج میں تھیں۔ میٹھا اسی طرح دبے پاؤں وہ سب چیزیں رکھنے ان کے کمرے میں گئی۔ جیسے لینے گئی تھی۔

”یہ ایمی مولیٰ کا بازو ہے۔ یہ زینی سڑیلی کا کلپ ہے۔ یہ آئی لانفو۔“

الما ری کھول کے دراز میں رکھتے ہوئے وہ احتیاطاً مہر کے اوہ کھلے دروازے کی جانب بھی دیکھ رہی تھی کہ مہرنے آجائے۔

”وہ یہ زینی کے بندے، ارے اس کے ساتھ کا دوسرا کہاں گیا۔“

بندے رکھتے ہوئے وہ جو گئی۔ وہ بس ایک ہی تھا۔ سبزنگ والا چاندی کا بندا۔

”او فوہ۔ شاید گرا آئی ہوں۔ مصیبت۔ چلو۔ یہ ایک ہی رکھ دیتی ہوں۔ وہ تو پتا نہیں اب کہاں ہوگا۔“

☆ ☆ ☆

مازی کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمیر تھا۔ رات جھیل کے راستے سے واپس آنا اور خود کشتی چلا کے آنا اس کے لیے ایک نیا، مگر تھکا دینے والا تجربہ تھا۔ رات بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ مگر کبھی نیند جاگنے کے باوجود وہ خود کو پراہش باشش محسوس کر رہا تھا۔

فرانسیسی طرز کے بنے درتچے سے آتی نرم گرم شعاعوں نے اس کے سنہری گندم کے خوشوں کی رنگت والے چہرے پر ایک نکھار سا روشن کر دیا تھا۔ وہ ہونٹوں پہ ہلکی ہلکی محفوظ ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ باہر دیکھنے لگا۔ جہاں یوں بس روز قطار در قطار ہمار دکھا رہے تھے۔ انکوائی لیتے ہوئے وہ اٹھا تو کچھ ہلکا سا اس کے پیروں پہ دھم سے آن گرا۔ اس نے جھک کے دیکھا۔

وہی سبزنگ والا چاندی کا بندا تھا۔  
وہ مسکرایا۔ اسے میٹھا کی باتیں نئے سرے سے یاد آئے لگیں۔

”ارے ڈر گئے۔ اور مجھے لگا، تم میرا ڈرور کرو

گے۔“

وہی بے ساختہ کھلکھلا ہٹ مارنے بند اٹھا کے اپنی ہتھیلی پہ رکھ لیا۔

”سب کہتے ہیں۔ بہت سوٹ اور کیوٹ ہوں؟“ مازی مسکراہٹ کچھ اور گرمی ہوئی۔

”ضرور ہوگی۔ جس کی باتیں اتنی سوٹ اور کیوٹ ہیں وہ خود کیسی ہوگی۔“

اس نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے اسے تصور کرنا چاہا۔ مگر ایک بھی نقش واضح طور پہ ذہن میں نہیں ابھر رہا تھا۔ ایک تورات کی سیای، دوسرا اس کا عجیب و غریب سوانگ۔

”مگر تم جو بھی تھیں۔ تمہیں بہت دلچسپ اور صاف اور شفاف بھی، کیسے ڈھونڈوں تمہیں، کیا اس بندے کے سارے۔“

وہ ہتھیلی پہ رکھے بندے کو کتنے لگا۔

اور دور نہیں جھیل کے اس پار کا ہی زندہ اینٹوں سے بنی خورد و جھاٹوں میں چھپی اس عمارت کے سب سے پچھلے کمرے میں کھڑی میٹھا دیا پر بنی اس پینٹنگ کو سحر کے عالم میں تک رہی تھی۔ جہاں ایک شہزادہ شیشے کی سینڈل ہاتھ میں لیے اپنی سینڈر لیل کو ڈھونڈ رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ (ن شاء اللہ)

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

کوئی ایسا اٹل دل ہو

فیصلہ عتیق

قیمت --- 250/- روپے

مکھوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔





مریم عزیز

## رنگ کی رگ گردن تھی

”ایک تو میں اس لڑکی کی سونے کی عادت سے  
تخت پریشان ہوں۔ پتا نہیں کیسے اتنا سونے لگتی ہے۔“  
زائدہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو  
اسانٹھنٹھاتی ریشم نے چونک کر انہیں دیکھا۔  
”کس کی بات کر رہی ہیں امی!“  
”نمرہ کے علاوہ اور کون ہے اس گھر میں جسے سونے  
کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔“  
ریشم ہنس پڑی۔ ”کیا ہو گیا امی! بے چاری سوتی ہی  
تو ہے۔“  
زائدہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ ”جاؤ جا کر اسے  
اٹھاؤ“ اس سے پہلے کہ میں اسے جوتیاں لگا کر  
اٹھاؤں۔“  
ان کے دھمکی آمیز انداز پر وہ ابرو اچکاتی کھڑی  
ہو گئی۔ ریشم کمرے میں داخل ہوئی تو وہ گہری نیند میں  
تھی۔ اس کے دو تین دفعہ آواز دینے پر بھی جب وہ  
ٹس سے مس نہ ہوئی تو ریشم نے اسے جھجھوڑ ڈالا۔  
”کیا ہوا؟“ اس اچانک افتاد پر وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔  
”ابھی تو کچھ نہیں ہوا، لیکن ابھی اگر تم نہ انھیں تو  
بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ چلو شاباش اٹھو۔ امی کا میز ٹھوم  
چکا ہے۔“ ریشم نے اسے پچکارنے کے ساتھ اس کا



ہاتھ تھام کر اسے کھڑا ہونے کے لیے سہارا دیا۔  
 ”ایک تو امی کو میری ہر بات پر اعتراض ہوتا ہے۔“  
 بالوں کو کچھ میں سمیٹتے ہوئے وہ بڑبڑاتی۔  
 ”غلط امی کو صرف تمہارے زیادہ سونے پر اعتراض ہوتا ہے۔“

دروازے سے نکلتے نکلتے بھی رمشا کتنا نہیں بھولی تھی۔ نمرو بھی برا سامنہ بنا کر اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو پہلا سامنا زابدہ کی گھورتی ہوئی نظروں کا کرنا بنا۔ وہ خاموشی سے سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

”تم نے دنیا میں کوئی کام کرنا ہے یا نہیں۔ حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔ ہر وقت نیند نہ نیند میں نے تم سے کہا تھا سعدیہ آنے والی ہے، بریانی بنانی تھی۔ کچن کے اور

کتنے کام ہیں، لیکن نہیں۔ تمہارے کلن پر تو جوں ہی نہیں رہی تھی۔“ اور سر جھکائے نیند کو کچھ گھاٹی نمرو نے سسرال کے خیال سے ہی جھرجھری ملی تھی۔

”نہ جو تمہارے طریقے ہیں، آگے سسرال جاکر جوتیاں کھاؤ گی۔ لوگوں نے یہی کہنا ہے ماں نے کچھ نہیں سکھایا۔“

”چلو، ابھی منگنی تک ہوئی نہیں۔ امی نے نہ صرف مجھے سسرال بھیج دیا، بلکہ جوتیاں بھی لگوا دیں۔“ وہ قصور میں خود کو سسرال کی جوتیاں کھاتے دیکھنے لگی۔

”اب یوں نکر نکر میرا منہ کیوں دیکھ رہی ہو۔ بنالو کچھ کھانے کو پتا بھی ہے اپنے بھتیجی کی عادت کا پھر بھی۔ اور ہاں۔“ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ بولیں۔ ”منہ پر پانی ڈال لو تاکہ تھوڑا ہوش آئے۔“ اب کے وہ تیزی سے لاؤنج سے باہر نکلی تھی۔

بریانی کو دو دم دے کر وہ فریق سے سلاہ کے لیے چیزیں نکال رہی تھی۔ جب رمشا اندر داخل ہوئی۔

”ہو گئی تیری؟“

نمرو نے فریق بند کر کے غصے اسے اسے دیکھا۔

”ہاں ہو گئی۔ تم یہ دیکھنے آئی ہو؟“ اس کے بلے ہوئے انداز پر رمشا کی ہنسی نکل گئی۔

”تمہیں۔ تمہاری پہلپ کرنے آئی ہوں۔“ نمرو نے پختے کے انداز میں رُے شافت پر رکھی تھی۔

”جب سب کام ہو جاتا ہے تب آجانی ہو۔ کسی کو احساس ہی نہیں میرا۔ کام والی سمجھا ہوا ہے مجھے۔ اب تو مجھے لگنے لگا ہے، میں امی کی سبکی بیٹی نہیں پتا نہیں ترس کھا کر کہاں سے اٹھایا تھا۔“

اس کے اتنے دیکھی بیان پر بھی پاس کھڑی رمشا کے تاثرات میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا تھا۔ اپنی بات کا خاطر خواہ اثر نہ دیکھ کر نمرو نے افسوس سے رمشا کو دیکھا۔

”میں نے کچھ بکواس کی ہے؟“

رمشا نے لہلی سے شامی کباب کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھ کر اسے دیکھا۔ ”سن لی تمہاری بکواس اور تمہیں کچھ سمجھانے کا فائدہ تو ہے نہیں، کیونکہ ہر دفعہ کھانا پکانے کے بعد تمہاری اس قسم کی جذباتی تقریر سننے کی میں عادی ہو چکی ہوں اور یہ ترس کھا کر اٹھائے جانے والی بات ذرا امی کے سامنے جا کر کو بتائیں گی تمہیں۔“

رمشا کی دھمکی کا ٹھیک ٹھاک اثر ہوا۔ وہ بڑا سامنہ بنا کر دوبارہ کام میں لگ گئی تھی۔

”کباب بڑے اچھے بنے ہیں۔“ پلیٹ سے دوسرا کباب اٹھاتے ہوئے رمشا پڑانے والے انداز میں بولی تو نمرو تپ کر مڑی۔

”اللہ کرے تم یہ کباب کھا کر موٹی بھینس بن جاؤ۔“ اس کے کونے پر رمشا قہقہہ لگا کر باہر نکل گئی جبکہ وہ سارا غصہ برتنوں پر نکلانے لگی۔

\*\*\*

”وہ! تو بڑے بڑے لوگوں کو وقت مل گیا کہ وہ ہم غریب لوگوں سے مل لیں۔“

جوں ہی اس نے ڈانٹنگ روم میں قدم رکھا، ظرافت بھائی کی طنزیہ آواز اس کی سماعتوں سے

نکل آئی۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ ایک جری مسکراہٹ ہونٹوں پر لے آئی۔

”ایسی بات نہیں ظرافت بھائی! کام کی وجہ سے جلیہ خراب ہو رہا تھا۔ بس پیچھے کرنے لگی تھی۔“

”تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے ہماری وجہ سے تم سارا دن کچن میں مصروف رہیں۔ کبھی اتنی مصیبت تھی تو بتا دیتیں۔ ہم آتے ہی نہیں۔“

نمرو نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا، جنہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے بولنے سے منع کر دیا تھا۔

”ظرافت بیٹا! اتنی تھوڑی بریانی ڈالی ہے تم نے اور لوٹا۔ اور یہ کباب لو۔“

زابدہ کے کہنے پر نمرو نے ان کی پلیٹ کا جائزہ لیا۔ جہاں پہلے سے چاول اور چکن کا ہٹاڑ بنا تھا۔ وہ گہرا سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گئی اور مسکرا کر اپنی بہن کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر حسب معمول ہوا بیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر اس نے نظریں رمشا کی طرف

گھمائیں، جس کے ماتھے کے بل وہ با آسانی دیکھ سکتی تھی وہ جانتی تھی وہ کتنے ضبط سے بیٹھی ہے۔

”اور آئی جی! ہمارے سالے صاحب اور ان کی زوجہ محترمہ نظر نہیں آ رہیں۔“ جب کافی دیر تک کوئی بات ان کی گرفت میں نہیں آئی تو انہوں نے نیا کتنہ اعتراض نکال لیا۔

”بیٹا، و سیم دلہن کے ساتھ اس کے میکے گیا ہوا ہے۔“

ظرافت بھائی کا ایک قہقہہ گونجا تھا۔ رمشا نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔

”جب بھی آؤ، و سیم صاحب وہیں پائے جاتے ہیں۔ کہیں گھر داماد بننے کی تیاری تو نہیں ہو رہی۔“

اپنے کھانا مذاق سے وہ خود ہی محفوظ ہو کر کھنک رہے تھے جبکہ باقی افراد بالکل خاموش تھے۔

”رمشا بیٹا! آؤں کریم لے آؤں۔“ زابدہ کب سے رمشا کو دیکھ رہی تھیں اور جاتی تھیں کسی بھی وقت اس کا ضبط جواب دے سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے

اسے اٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خود بھی اس کے پیچھے آئی تھیں۔ وہ کرشل باؤل پختے کے انداز میں رُے میں رکھ رہی تھی۔ رمشا نے ایک ناراض نظر ان پر ڈالی۔ اس سے پہلے وہ اسے کچھ کہتیں، گہرائی ہوئی سعدیہ اندر داخل ہوئی تھی۔

”امی! جب و سیم کو پتا تھا میں اور ظرافت آرہے ہیں تو کیا ضرورت تھی اسے رخسانہ کو لے کر جانے کی۔ ایک دن صبر نہیں ہو سکتا تھا اس سے۔ اب گھر جا کر ان کی طنزیہ گفتگو شروع ہو جائے گی اور ساتھ ان کی بہنیں بھی شروع ہو جائی ہیں۔“ آخر میں وہ ہانسی ہو گئی تھی۔

رمشا نے غصے سے سعدیہ کو دیکھا۔

”آپا! جب تمہیں پتا ہے تمہارے سرتاج کا مذاق اتنا شانہ نہ تو کیوں اسے لے کر یہاں آئی ہو۔“

”دیکھ رہی ہیں امی! اب شادی ہو جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس گھر پر میرا حق ختم ہو گیا۔ یہاں نہ

**خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ**

**حوالتیں کا گھر ریلو اسٹیشن کلب ویٹیا**

کانیا ایڈیشن قیمت - / 750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

**کھانا حوالہ**

قیمت - / 250 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - / 800 روپے کا منی آڈر ارسال فرمائیں۔

**منگوانے کا پتہ:**

**مکتبہ عمران ڈائجسٹ**

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361



اول تو لہاں جاؤں؟“ سعدیہ بڑپ کر رہی۔  
 ”رمشا! تم چپ رہو۔“ زاہدہ نے غصے سے رمشا کو دیکھا۔  
 ”بڑی بہن ہے تمہاری۔“  
 ”پتا ہے مجھے پر آپ انہیں کیوں نہیں سمجھاتیں کہ دنیا میں سارے سکتے صرف ان کے ساتھ نہیں۔ ہم بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی سو مسائل ہیں۔“ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔  
 جبکہ سعدیہ کے آنسوؤں میں رونا لپٹی تھی۔  
 ”اے میرا یہاں آنا برا لگتا ہے تو میں آئندہ نہیں آؤں گی۔“

”ارے!“ زاہدہ نے اسے گلے لگالیا۔ کیوں نہیں آؤ گی۔ تمہارے باپ کا گھر ہے۔ تمہاری ماں ابھی زندہ ہے اور رمشا کی باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ تمہیں پریشان دیکھتی ہے تو بس ایسے بول جاتی ہے۔ ورنہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ اسے ساتھ لگائے تسلیاں دینے لگیں۔

☆☆☆

برتن دھو کر جب وہ کمرے میں آئی تو اس کا خیال تھا، نمروہ سو گئی ہوگی، لیکن اسے جاتے دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔

”تم سوئیں نہیں؟“  
 ”نہیں، کچھ سوچ رہی تھی۔“ نمروہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”سعدیہ باجی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شادی سے پہلے وہ کتنی بولڈ اور باتونی ہوا کرتی تھیں۔ کتنی رونق ہوتی تھی ہمارے گھر میں ان کی وجہ سے۔ اب تو میں جب بھی انہیں دیکھتی ہوں، وہ والی سعدیہ باجی لگتی ہی نہیں۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ ہوتی ہے وہ بھی اجسی لگتی ہے اور وہ ظرافت بھائی۔“ اس نے منہ بنایا۔  
 ”ان کا صرف نام ہی ظرافت ہے۔ ورنہ جتنی ان میں لڑواہٹ ہے۔ کر لیا بھی ان سے بہتر ہوگا۔“  
 سنجیدگی سے اس کی باتیں سنتی رمشا اس کی مثال پر مسکرا دی تھی۔ نمروہ نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم نے بھی ان کا ایک ایسا جملہ سنا جس میں طنز نہ ہو۔ سعدیہ باجی بے چاری اسی لیے ایسی ہو گئی ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں امی ہمارے لیے بھی ظرافت بھائی جیسا نمونہ نہ پسند کر لیں۔“  
 اب کی بار رمشا کھکھلا کر ہنس پڑی۔  
 ”تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔ میرا ہی دماغ خراب ہے۔“ نمروہ نے غصے سے اس کی طرف کروٹ بدل لی۔

”بے وقوفوں کی طرح مت سوچا کرو۔“ کچھ دیر بعد اس نے رمشا کی سنجیدہ آواز سنی۔  
 ”امی ہماری دشمن نہیں جو ایسا سوچیں گی۔ سعدیہ باجی کے لیے انہوں نے اچھا ہی سوچا تھا۔ امی کو کیا پتا تھا کہ ظرافت بھائی کا مزاج ایسا ہے۔ ماں باپ اولاد کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ صرف قسمت نہیں بدل سکتے اور مجھے تو کبھی کبھی سعدیہ باجی پر بہت غصہ آتا ہے۔ اتنے بھی جاہل اور ہلا کو نائب نہیں ظرافت بھائی اور نہ ڈر کیولا کے خاندان سے تعلق ہے ان کی نندوں کا۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو کب کا ان کی نندوں کو ٹھیک کر چکی ہوتی۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنا مسئلہ خود حل کریں، یہاں آکر امی کو اپنے دکھڑے سنا کر اور پریشان کر جاتی ہیں اور تم صرف سعدیہ باجی اور ظرافت بھائی کے بارے میں سوچتی ہو، جبکہ میں بھابھی اور بھائی کے بارے میں بھی سوچتی ہوں۔ ایک ہی تو ہمارا بھائی ہے۔ اس کی شادی کے حوالے سے کتنے ارمان تھے اور سب ارمانوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہمارے بھائی نے۔ خود ہی شادی کر لی۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ زندگی انہوں نے گزارنی ہے، جیسی ان کی خوشی، لیکن جس کو وہ اس گھر میں لے کر آئے ہیں، کم از کم اس کو یہ تو بتا دیں، یہ میری ماں ہے، کتنی مشکل سے اس نے ہمیں پالا ہے۔ ان کی عزت تو کروا سکتے ہیں۔ جب سے شادی ہوئی ہے، کتنا عرصہ یہاں پر رہی ہیں۔ نہ خود رہتی ہیں اور نہ بھائی کو رہنے دیتی ہیں۔ اوپر سے ان کے رشتے دار۔۔۔ بے انتہا بڑے لگتے ہیں مجھے۔ لگتا ہی

نہیں ہے کسی شریف خاندان سے ان کا تعلق ہوگا۔“  
 رمشا کے کڑوے لہجے پر نمروہ نے بھی برا سامنہ بنایا۔ بھابھی کے گھر والے اسے بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ خاص طور پر ان کا بھائی۔ عجیب گھٹیا انداز تھا اس کا دیکھنے کا اور گفتگو بھی اتنی ہی فضول کرتا تھا۔  
 ”چلو اب سو جاؤ، تم نے تو صبح کاج جانا نہیں، پھر مجھے جانا ہے۔“ رمشا نے کہنے کے ساتھ لائٹ آف کر دی اور اس کے قریب آکر لیٹ گئی۔

☆☆☆

”نمروہ!“ وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی نوکری لیے چھت پر جارہی تھی، جب رخسانہ کی آواز پر رک گئی۔ ”ڈراؤ گلاس جوس تو میرے کمرے میں دے جانا۔“  
 رخسانہ کے آرڈر پر اس نے۔۔۔ اپنے ہاتھ میں تھامی نوکری کو دیکھا اور گھری سانس لے کر نوکری نشین پر رکھ دی اور کچن کی طرف آئی۔  
 ”دو قدم کے فاصلے پر کچن ہے، لیکن جبال ہے جو قدموں کو تھوڑی سی زحمت بھی دے دی جائے۔“  
 ٹرے میں گلاس رکھتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی اور جب دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے بیڈ پر نیم دراز بھابھی کے بھائی کو دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ کاش! اس کو چھو منتر آتا اور وہ پلک جھپکتے میں غائب ہو جاتی۔

اس پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور جس طرح اس کو دیکھ کر مسکرایا، نمروہ کا دل چاہا اسے جلا کر خاستر کر دے۔ وہ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر مڑنے لگی تھی۔ جب اس نے اسے کتے ہوئے سنا تھا۔  
 ”رخسانہ! تمہارے سرال میں گھر آئے مہمان کو سلام کرنے کا رواج نہیں ہے۔“  
 نمروہ کی مٹھیاں جھنجھکی تھیں۔ جانتی تھی کہ سنایا جارہا ہے۔ وہ نظر انداز کر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔  
 ”اتنی دور سے آیا ہوں۔ خالی جوس پر ہی ٹر خاؤ گی۔ کچھ کھانے کو بھی منگوالو۔“

”نمروہ! ذرا چائے کے ساتھ کباب اور رول بھی لے آنا۔“  
 نمروہ تھملائی ہوئی باہر آئی۔  
 رخسانہ پتا نہیں زوار کو کون سے قصے سن رہی تھی، لیکن اس کی پُرسوج نظریں دروازے پر جمی تھیں، جہاں سے وہ گئی تھی اور جہاں سے ابھی اسے آنا تھا۔  
 ”تمہاری ساس اور تمہاری وہ دوسری خوشخوار نند کہاں ہیں؟“

اپنی رام کہانی کے جواب میں یہ سوال سن کر وہ بد مزہ تو ضرور ہوئی تھی، لیکن کہا کچھ نہیں۔  
 ”رمشا تو کاج گئی ہے اور ساس صاحبہ گئی ہیں کسی کی مزاج پر سی کرنے۔“ اس نے کافی بے زاری سے ان کا ذکر کیا۔  
 ”ہوں۔“ اس نے ہنکارا بھرا، جوس کا آخری گھونٹ لے کر گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ رخسانہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔  
 ”اے بی، سوچ رہا ہوں۔ گھر کا چکر لگالوں۔“  
 رخسانہ کے ماتھے پر بل بڑھتے تھے۔  
 ”آرام سے بیٹھ جاؤ زوار!“  
 ”کیوں؟“

”کیوں کیا میں جانتی نہیں کیا کہ تم چکر لگانے جا رہے ہو یا چکر چلانے۔“  
 وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”جب جانتی ہو تو روک کیوں رہی ہو۔“  
 ”اس لیے کہ تم اس وقت و سیم کے گھر میں ہو اور وہ و سیم کی بہن ہے۔ اگر و سیم کو پتا چل گیا نا۔۔۔ اس نے آگے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
 ”وہ ایسی ڈر گیا۔“ اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو رخسانہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔  
 ”یہ تم و سیم کی دھمکی اسے دینا جو و سیم کو نہ جانتا ہو اور و سیم تمہارا کیا کر لے گا۔ کٹھ کا الو بنایا ہوا ہے تم نے، جو کتنی ہو، آٹھ بند کر کے یقین کر لیتا ہے۔“



”اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس کی بہن کو تنگ کرو۔“

”تنگ کہاں کر رہا ہوں۔“ وہ اپنے گلے میں پڑی چین کو گھماتے ہوئے بولا۔

”تو؟“ رخسانہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دل آگیا ہے اس پر۔“ رخسانہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ زوار نے غصے سے اسے دیکھا۔

”سننے والی کیا بات ہے؟“

”تمہارا دل تو ہر دوسرے دن کسی نہ کسی پر آ رہا ہوتا ہے۔“

”ہاں! لیکن اس سے میں نے شادی کرنے کا سوچا ہے۔“

”کیا؟“ اب کی بار رخسانہ کو صحیح معنوں میں جھککا لگا تھا۔

”ناغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔“ رخسانہ ایک دم بیٹھے سے کھڑے ہو گئی تھی۔

”بالکل ٹھیک ہے اور بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور تم میری مدد کو یہ شادی کروانے میں۔“

”میں!“ رخسانہ نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔

”کوئی نہیں مانے گا۔ اس گھر کے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے اور تمہاری ریپویشن بھی خیر سے کافی اچھی ہے۔“

”وہ طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اس لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں، تم تو اگر وسیم کو متالوگی تو آدھے سے زیادہ مسئلہ تو میں حل ہو جائے گا۔ اور اس کے گھر والے اس کی بات نہ مان کے جائیں گے کہاں۔“

رخسانہ نے گہری سانس لی جس کا مطلب تھا وہ قائل ہو گئی ہے۔

”پر تمہیں اس میں نظر کیا آیا ہے، جو ساری دنیا کی لڑکیاں چھوڑ کر تم اس سے شادی کرنے کو تیار ہو گئے ہو۔“

کے ساتھ راہ و رسم رکھوں، لیکن وہ بس میرے لیے ہو۔“

رخسانہ نے تلی، بجا کر اودی۔

”کیا سوچ ہے، تو سوچو، کھا کر ملیج کو چلی۔ کیا تمہیں لگتا ہے تم جیسے کرکٹر کیس انسان کو اپنی تنگ شریف لڑکی مل سکتی ہے؟“ زوار کے جڑے بھجج جڑے تھے۔ پھر جیسے غصے پر قابو پا کر وہ مسکرایا۔

”جب تمہارے جیسی پچاس بوائے فریڈ ز رکھنے والی کو وسیم جیسا شوہر مل سکتا ہے تو مجھے نمرو جیسی بیوی کیوں نہیں۔“

”زوار!“

رخسانہ غصے کے مارے چیخ پڑی تھی۔

”ریلیکس مائی ڈیر سسٹر! جیسا کوئی ویسا سنوگی۔ آخر کو میں تمہارا ہی بھائی ہوں۔“

اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتی نمرو ٹرائی گھٹتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ٹرائی رکھ کر وہ ایک سیکنڈ کا انتظار کیے بغیر واپس مڑی۔

مبادا کچھ اور نہ فرمائش کر دی جائے اور پھر تپ تک باہر نہیں نکلی، جب تک وہ چلا نہیں گیا اور زاہدہ گھر واپس نہیں آئیں۔

\*\*\*

”خدا کا واسطہ ہے نمرو اب آ بھی جاؤ اور کتنا تیار ہوگی۔ ہم اسپتال جا رہے ہیں، کسی فنکشن میں نہیں۔“ اسے مسلسل آدھے گھنٹے سے بیٹھنے کے آگے کھڑے دیکھ کر رمشا اکتا کر بولی۔

نمرو نکلی رکھ کر اس کی طرف مڑی۔

”بتا ہے مجھے کہ ہم اسپتال جا رہے ہیں، لیکن کتنی بڑی خوشی کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ تمہیں بتا ہے؟ ہم اپنے بھانجے کو دیکھنے جا رہے ہیں۔“ اس کی خوشی دیکھ کر رمشا مسکرا دی۔

”وسیم بھائی ابھی تک نہیں آئے۔“ رمشانے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ تب ہی باہر نیل بجی تھی۔

”آگئے بھائی!“ نمرو دوڑ کر باہر کی طرف بڑھی تھی۔ رمشانے سب دروازے لاک کیے اور جب وہ

لاؤنج کا دروازہ بند کر کے برآمدے میں آئی تو نمرو کے ساتھ کھڑے نیل کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کے مسلسل دیکھنے پر اسے سلام کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس کے روکے انداز کے باوجود کافی رجوش انداز میں اس کے سلام کا جواب دے کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ نمرو بھی اس کے پیچھے بڑھی تھی، جب اس نے نمرو کا دپٹا کھینچ کر اسے روکا تھا۔

”اسے کس نے بلایا ہے؟“

”اسی نے بھیجا ہے انہیں۔“

”اسی کو کوئی اور نہیں ملا تھا۔“ اب کے وہ غصے سے بولی۔

”وہ ہمارے نوکر نہیں ہیں۔ شکر کرو آگئے ہیں۔“

رمشا کے غصے انداز پر وہ تھکتے ہوئے بولی۔

”دوے تمہیں پر اب تم کیا ہے نیل بھائی سے۔ اتنے اچھے تو ہیں۔“ رمشانے کھا جانے والی نظروں سے نمرو کو دیکھا۔

”اس کے برے ہونے کے لیے یہ حوالہ کافی نہیں کہ وہ ظرافت بھائی کا بھائی ہے۔“

نمرو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا جب رمشانے اسے ٹوک دیا۔

”تم پلیز اپنی چوچ بند ہی رکھو۔ پہلے ہی میرا موڈ آف ہو گیا ہے۔“

نمرو برا سامنہ بنا کر گاڑی کی طرف بیٹھ گئی۔ جہاں نیل کار کا اگلا دروازہ کھولے ان کا منتظر تھا۔ نمرو جاتی تھی یہ دروازہ کس کے لیے کھولا گیا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی، رمشا کبھی نہیں بیٹھے گی۔

اس سے پہلے کہ رمشا کوئی سخت بات کہہ کر ماحول کو خراب کرے وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ نیل نے ایک خاموش نظر پیچھے رمشا پر ڈالی اور ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ سارا راستہ خاموشی سے نکلتا تھا۔

جب وہ اسپتال پہنچے تو وہاں زاہدہ کے علاوہ ظرافت بھائی، ان کی والدہ اور دونوں بہنیں بھی موجود تھیں۔

سب کو سلام کر کے وہ دونوں سعدیہ کے پاس لیٹے بیٹھے کی طرف آ گئیں۔

”کتنا پیارا ہے۔ بالکل مجھ پر گیا ہے۔“ رمشانے فوراً اسے گود میں اٹھالیا۔

”تم پر گیا ہوتا تو پیارا نہ ہوتا۔“ نمرو نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

تب ہی زاہدہ اس کے قریب آکر سرگوشی میں بولیں۔

”وسیم کو فون کیا تھا؟“

”میں نے فون کیا تھا۔ بھائی کہہ رہے تھے بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ شام کو آئیں گے۔“ نمرو کے جواب پر زاہدہ کے چہرے پر پریشانی چمکنے لگی۔

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ سعدیہ کی ساس کی تیز آواز پر تینوں مرکز پیچھے دیکھنے لگے، جہاں نیل کھڑا تھا۔

”نیل کو میں نے ہی بھیجا تھا۔ بچوں کو لانے کے لیے۔“ زاہدہ نے کچھ شرمندہ ہو کر وضاحت دی۔

”تمہیں بتا نہیں تھا، بہنوں نے گھر جانا تھا۔“

”میں آگیا ہوں نا، اس میں اتنا شور کرنے والی کیا بات ہے۔“ جواباً وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا تو گھرے میں محسوس کی جانے والی خاموشی چھا گئی۔

”نیل بھائی! آپ نے دیکھا اپنا بھتیجا، کتنا پیارا ہے۔“

ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے نمرو نے ہشاش لہجے میں نیل کو مخاطب کیا۔ تو وہ مسکراتا ہوا رمشا کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا، جو بچے کو اٹھائے کھڑی تھی۔

اس کے یوں قریب کھڑے ہونے پر اس نے جڑ بڑھ کر نمرو کو دیکھا، جس کے چہرے پر دلی دلی سی مسکراہٹ تھی۔ نیل کی بہنوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا تھا۔ رمشا کی غیر ارادی نظر ان پر پڑی تھی اس نے تیزی سے بچے کو نمرو کی گود میں دیا اور خود سعدیہ کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد جب نیل اپنی بہنوں کو لے کر چلا گیا تو اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

\*\*\*

وہ سڑک کے کنارے یوں کھڑی تھی جیسے بصارت



سے محروم ہو۔ اس وقت اس نے دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ اس کے قریب گاڑی کا ہارن بجا تو وہ چونک کر حواسوں میں آئی۔ ارد گرد نظر ڈالنے پر اسے احساس ہوا کہ کئی لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں۔ وہ جلدی سے سڑک پار کرنے لگی جب ایک گاڑی بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کے حواس اتنے منتشر تھے کہ وہ نہ آگے جاسکی اور نہ پیچھے مڑسکی۔ اگر کار ڈرائیور بروقت گاڑی نہ روکتا تو وہ اس وقت اوپر پھینچی ہوتی۔

”محترمہ! دماغ خراب ہے آپ کا۔ خود کشی کے لیے آپ کو میری ہی گاڑی ملی تھی۔“  
وہ جو کوئی بھی تھا، گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر اس پر برس رہا تھا اور وہ بند آنکھوں کے ساتھ خود کو یہ یقین دلانے میں مصروف تھی کہ وہ زندہ ہے۔  
”بیٹا! آپ ٹھیک ہو، چوٹ تو نہیں آئی آپ کو؟“  
ایک شفیق آواز اس کے کانوں سے گزرا تو اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جیسی شفیق آواز تھی ویسی ہی شفیق چہرہ اس کے سامنے تھا۔  
”چوٹ آئی ہے بیٹا؟“ اب کے انہوں نے پریشانی سے اس کی آنکھوں کے آنسو دیکھے۔  
نمرو کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا۔

”پھر ایسے کیوں رو رہی ہو؟“ نمرو ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بتائیے یا نہیں۔  
”بولو بیٹا! شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“ عام حالات میں شاید وہ کبھی یہ بات نہ کرتی، لیکن اس وقت وہ اتنی پریشان تھی کہ اپنا پرسنل میٹران سے ڈسکس کرنے لگی تھی۔

”وہ آئی! میری سرسبزیاں سامنے والے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ میں ان کی میڈیسن لینے آئی تھی۔ میرے سویٹری کی جیب میں پانچ ہزار کا نوٹ تھا۔ دکان پر جا کر نکالنے لگی تو نوٹ غائب تھا۔“ آخر میں پھر اس کی آواز بھر اگئی۔

”اوہ! انہوں نے سن کر افسوس کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہیں گاڑی کا ہارن بجاتا۔

تھا۔ ان دونوں نے مڑ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا جو کچھ دیر پہلے اس پر چلا رہا تھا، اب غصے سے ہارن دے رہا تھا۔ سامنے کھڑی عورت نے جلدی سے اپنے کندھے سے لٹکے بیگ کی زپ کھولی اور اس میں ہزار ہزار کے نوٹ نکالے اور گن کر اس کی طرف بڑھائے۔ اب حیران ہونے کی باری نمرو کی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑے بے ساختہ انداز میں پیچھے کی طرف گھومے تھے۔

”رکھ لو بیٹا! تمہارے پاس جب ہوں مجھے واپس کر دینا۔“  
”لیکن آئی! میں یہ کیسے لے سکتی ہوں۔ آپ مجھے جانتی نہیں اور نہ میں یہ۔“ وہ اتنی مریانی پر یو کھلا کر رہ گئی تھی۔  
”میں جانتی ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو۔ یہ میرا نمبر ہے، جب مل چاہو واپس کر دینا۔“  
زبردستی نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا کہ اس کا کمال تختہ پھٹ کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ وہ وہیں پھرتی کھڑی رہ گئی۔ ہوش تب آیا جب گاڑی زن سے اس کے قریب سے گزر گئی۔

رمشا غصے سے اسے گھور رہی تھی اور وہ نظریں جراتے ہوئے کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف دیکھ رہی تھی۔  
”تم اس وقت ہوش میں تو تھیں۔؟ کسی بھی راہ چلنے نے اگر تمہیں پیسے پکڑا دیے اور تم نے پکڑ لیے۔ فقیر بنی ہو تم؟“ رمشا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے منہ پر پھٹ کر گاڑے۔

”میں کیا کرتی رہی رمشا! مجھے اس وقت کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پانچ ہزار روپے مجھے ظرافت بھائی نے دیے تھے۔ اگر میں جا کر کہتی کہ مجھ سے کم ہو گئے ہیں تو تمہیں کیا لگتا ہے؟ وہ میرا یقین کرتے؟ انہا انہوں نے میرے ساتھ ساتھ سعدیہ باتی کی بھی بے عزتی کر دی تھی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے، مگر تم مجھے یہ بتاؤ۔ تم نے جو کیا، وہ ٹھیک ہے۔ آج کل کوئی زنانہ ہے کسی پر یقین کرنے کا۔“ اب مجھے تو یہ سوچ کر شرمندگی ہو رہی ہے کہ تم نے ایک غیر عورت کو اپنی دیکھی داستان سنا کر پیسے لے لیے۔ یہ بات میں امی کو بتاؤں تو ابھی تمہیں دس جوتیاں لگا کر ایک گتیں گی۔“ نمرونے برا سامنہ بنایا۔

”تمہیں یہ سب اس لیے نہیں بتایا کہ تم لیکچر دینا شروع کر دو۔“ وہ گود میں رکھا شن قالین پر بیٹھ کر باہر نکل گئی۔ جبکہ رمشانے بے اختیار اپنا ہاتھ پیٹ ڈالا۔

\*\*\*

چوتھی دفعہ جب اس نے ریسپور واپس کر ڈیل پر رکھا تو رمشا کا ضبط جواب دے گیا۔  
”تمہیں آخر تکلیف کیا ہے نمرو! یہ چوتھی دفعہ ہے جب تم نے آدھا نمبر ملا کر فون بند کر دیا ہے۔“ نمرونے بے بسی سے اس کی شکل دیکھی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا بات کروں۔ مجھے تو ان کا نام بھی نہیں پتا۔“ رمشانے کمری سانس لے کر اسے دیکھا۔  
”بھئی کبھی مجھے تم پر ترس آتا ہے نمرو! کیا بنے گا تمہارا۔ امی صبح کہتی ہیں۔ سسرال میں خوب نام روشن کرو گی ہمارا۔“

”تم پھر شروع ہو گئیں۔ لیکچر دینا باتیں کرنا آسان ہے، تم کرو باتیں۔“

”کیوں میں کیوں کروں میں نے لیے تھے پیسے؟“ رمشا ہنک کر بولی۔

”رمشا! ایسا کرتی ہوں۔ پیسے واپس ہی نہیں کرتی۔ انہیں کیا پتا میں کون ہوں میرے پانچ ہزار بھی بیچ جائیں گے۔“ اس نے بچوں کی طرح تلی جاکر کہا تو رمشانے افسوس سے سر ہلایا۔

”اللہ تعالیٰ کو جواب نہیں دینا تم نے؟ یہاں آکر نمرو ڈھل پڑ گئی۔ اس نے پہلے آنکھیں بند کر کے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پھر پورا نمبر ڈال کر کے ریسپور کلن سے لگالیا۔ تین بیٹلو ہو چکی تھیں اور ہر تیل کے

ساتھ اس کی دھڑکن ہوئی جارہی تھی۔ پانچویں تیل پر فون اٹھالیا گیا۔ بھاری مردانہ آواز سن کر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

”کون ہے بھئی بھول بھی دو۔“ مسلسل بیلو کرنے پر اب وہ شخص جھنجھلا کر بولا تھا۔ ہلکا سا کھٹکارنے کے بعد اس نے سلام کیا تھا اور جواب سے بغیر سوال کر ڈالا تھا۔

”میں آئی سے بات کر سکتی ہوں۔“ دوسری طرف ایک بل کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

”ٹھیک چوٹی! مجھے ان کا نام نہیں معلوم۔“

”دیکھیں! جب آپ کو پتا ہی نہیں کہ آپ کو کس سے بات کرنی ہے تو میں کس سے بات کرواؤں۔ آپ کو تو شاید یہ بھی نہیں پتا کہ سسٹر نے فون کس کو کیا ہے آپ نے؟“ اب کے نمرونے گھبرا کر رمشا کو دیکھا جو بتا نہیں اسے اشارے سے کیا سمجھا رہی تھی۔

”دیکھیں۔“

”عجیب باتیں کر رہی ہیں آپ۔ اب فون میں سے کیسے دیکھوں آپ کو؟“

”چہ۔“ اب کے نمرو جھنجھلا کر بولی۔ ”میرا مطلب ہے، آپ آئی سے کہیں کہ میرا فون ہے۔“

”میرا کون؟“

”آف! نمرو کی مٹھیاں بھیج گئی تھیں۔

”میں نے آئی سے پانچ ہزار لیے تھے۔ وہ انہیں واپس کرنے ہیں۔ آپ میری ان سے بات کرواؤں۔“ اس نے جلدی سے بات مکمل کی۔ مبادا وہ پھر کوئی بات پکڑ کر نہ بیٹھ جائے۔ دوسری طرف سے جواب! اتنا بلند تقہرہ سنائی دیا تھا کہ اسے ریسپور کلن سے ہٹانا پڑا۔

”چھاتو آپ وہ ہیں۔“ اس نے وہ پر اچھا خاصا زور دیا تھا، جبکہ نمرو بھی سمجھ گئی کہ وہ کون ہے۔

”اب ذرا آئی کو لادیں۔“ پلیز! اب کے وہ ذرا غصے سے بولی تو دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد جو آواز اسے سنائی دی وہ تین دن گزرنے کے بعد بھی اسے پہچان گئی تھی۔



”السلام علیکم آئی! میں بولی رہی ہوں، وہ اس دن  
ہسپتال کے باہر آپ سے ملی تھی۔ آپ نے مجھے پانچ  
ہزار دیے تھے۔“  
”وعلیکم السلام بیٹا! میں نے پہچان لیا آپ کو۔ کیسی  
ہیں آپ؟“  
”میں ٹھیک ہوں آئی! مجھے آپ کے پیسے واپس  
کرنے ہیں۔ پلیز آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتا  
دیں۔ میں آپ کو بجوادیں گی۔“ دوسری طرف سے  
اسے ان کی ہنسی سنائی دی تھی۔  
”آپ نے اس لیے فون کیا ہے؟“  
”جی!۔“ ”نمو کچھ نروس ہو کر بولی۔  
”میں آپ سے پیسے لوں گی، لیکن ایک شرط  
ہے۔“  
”جی؟“ ”شرط کائن کر اس نے گھر کر مشا کو دیکھا۔  
”پیسے دینے آپ کو خود آنا ہو گا۔“  
”لیکن آئی! وہ پریشانی سے بولی۔ اس کی پریشانی  
شاید وہ بھی بھانپ گئی تھیں۔  
”بیٹا! آپ ٹیشن نہ لیں۔ میں صرف آپ سے ملنا  
چاہتی تھی۔ اگر آپ نہیں آنا چاہتیں تو کوئی بات  
نہیں۔“  
”نہیں آئی! ایسی بات نہیں آپ مجھے ایڈریس  
بتائیں میں آجاتی ہوں۔“ اور غور سے سنی رہا  
اپنا سر پیٹ لیا۔  
اس کے ریسپورر رکھتے ہی وہ غصے سے اسے گھورنے  
لگی۔ ”اب تم ان کے گھر جاؤ گی۔“  
”تو کیا کروں۔ وہ کہہ رہی ہیں گھر آؤ۔“  
”او میرے خدا! کیا کروں میں تمہارا۔۔۔ نمو!  
انہوں نے کہا اور تم چل دو گی پتا نہیں وہ کون ہیں۔  
کیا مقصد ہے ان کا تمہیں بلانے میں۔ آج کل کوئی سو  
روپے کسی کو ادھار نہیں دیتا اور انہوں نے تمہیں  
جانے پہچانے بغیر پانچ ہزار دے دیے اور اب گھر بلا  
رہی ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا آج کل کتنا فراڈ  
ہو رہا ہے۔“  
”رہا وہ ایسی نہیں لگتیں۔“ نمو مری ہوئی آواز

میں بولی۔  
”کسی کی بھی شکل سے تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ  
وہ کیا ہے۔“ کہہ کر مشا کھڑی ہو گئی تھی۔  
”رہا پلیز! اب میں نے کہہ دیا ہے۔ تم میرے  
ساتھ چلو۔ ہم گیٹ پر پیسے پکڑا کر آجائیں گے۔“  
رہا غصے سے چلی۔  
”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا نمو! ایڈریس انہوں  
نے تمہیں بتایا۔ مٹی آرڈر کرو۔ میں نہیں جانے  
والی اور اگر تم نے مزید بکواس کی تو میں امی کو بتا دوں  
گی۔“ رہا غصے سے بولتی ہوئی کمرے سے باہر نکل  
گئی۔  
\*\*\*  
پانچویں گھر کا دروازہ بھی جب ان پر بند ہوا تو اس  
نے ڈرتے ڈرتے رہا پر نظر ڈالی۔ جس کا چہرہ غصے کے  
مارے لال ہو رہا تھا۔  
”رہا! اس نے بے چارگی سے اسے پکارا۔  
”شٹ اپ! اعلیٰ میری ہے جو تمہارے آنسوؤں  
کو دیکھ کر جذباتی ہو گئی اور اس پاگل پن میں تمہارا  
ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئی۔ اب پچھلے ایک گھنٹے  
سے خوار ہو رہے ہیں۔ اوپر سے نام تک نہیں پوچھا تم  
نے۔“  
وہ پہلے ہی پریشان ہو رہی تھی اوپر سے رہا کا غصہ  
اس نے ایک دم رونما شروع کر دیا۔  
”خدا کے لیے نمو ایند کرو یہ بچپنا۔ سڑک  
کھڑے ہو کر رونا شروع کر دیا ہے تم نے ایک تو غلطی  
کرتی ہو اوپر سے روٹی ہو۔ چلو! یہ آخری گیٹ ناک  
کر کے دیکھ لیتے ہیں نہ یہ ہوا تو بس پھر گھر چلتے ہیں۔“  
رہا نے تیل دی تو نمو نے آنکھیں بند کر لیں اور  
جتنی دعا میں اسے یاد تھیں وہ سب پڑھ ڈالیں۔ گیٹ  
کھلنے پر اس نے تیزی سے آنکھیں کھولیں۔ عام  
حالات میں یہ چہرہ دیکھ کر اسے کوئی خوش نہ ہوتی، لیکن  
اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خوشی کے مارے رہا  
کے گلے لگ جائے۔ آنے والے نے پہلے سوال

نظروں سے رہا کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ رہا  
سے کچھ پوچھتا۔ اس کی دوسری نظر نمو پر پڑی تھی۔  
شہنائی کے علاوہ کوئی اور تاثر بھی تھا جو اس کے  
چہرے پر آیا تھا۔  
”رہا! یہ وہی ہے۔“ نمو نے ایک دم جذباتی ہو کر  
اس کا بازو پکڑا۔ اس کی اس جذباتی حرکت پر رہا نے  
پوری آنکھیں کھول کر اسے گھورا تو نمو نے شرمندہ  
ہو کر اس کا بازو چھوڑ دیا۔  
”آئی! سے ملنا ہے۔“  
اسے وہی ہی گیٹ کے آگے دیوار کی طرح کھڑے  
دیکھ کر نمو کو کتنا برا۔ اس کے پیچھے بیٹے ہی وہ دونوں  
تیزی سے اندر داخل ہوئیں اور وہ آئی جیسے ان کے  
انتظار میں تھیں۔ اتنے تپاک سے ملیں۔ نمو تو نمو  
رہا بھی اپنے دیے ہوئے بیانات کو یاد کر کے شرمندہ  
ہو گئی۔  
ان کے بہت منع کرنے کے باوجود انہوں نے  
چائے پر اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ نمو نے ایک  
ناراض نظر رہا پر ڈالی جو پچھلے آدھے گھنٹے سے نہ  
صرف باتیں کر رہی تھی بلکہ نقشہ لگا رہی تھی۔  
”آئی! اتنی بے وقوف ہے، آپ سے اتنی بڑی  
مدد لی مگر آپ کا نام تک نہ پوچھا۔ بس پیسے تمام  
لیے اور اس دن فون کیا تو بھی آپ کا نام نہیں پوچھا۔  
اس کی اس طرح کی بے وقوفیوں کی وجہ سے امی بھی  
پریشان رہتی ہیں۔ وہ تو اس کی قیمت اچھی ہے کہ  
آپ اچھی ہیں ورنہ اگر کوئی بڑے لوگ مل جاتے تو۔“  
رہا کے سیاسی بیان پر نمو نے دانت پیس کر اسے  
گھورا۔  
”نہیں بیٹا! نمو بے وقوف نہیں معصوم ہے اس  
کی یہ بات تو مجھے اچھی لگی تھی۔ آج کل کے دور میں  
اتنی سادگی کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔“  
اپنی اتنی تعریف پر نمو بے اختیار خوش ہو گئی تھی۔  
یہ پہلی بار تھا جب کوئی اسے سمجھا تھا۔ اس کی  
معصومیت کو بے وقوفی کا نام نہیں دیا گیا تھا۔  
”اور بیٹا! آج کل جیسو در جا رہا ہے وہاں کسی کی

اچھی نیت کو بھی مشکوک نظروں سے ہی دیکھا جاتا  
ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اسے بیٹے سے یہ بات  
کر رہی تھی۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ میں آپ پر اور  
اس لڑکی پر حیران ہوں۔ اس نے کیسے بلا جھجک آپ کو  
اپنی پر اہم بتادی اور آپ نے کیسے بے دھڑل اس کی  
مدد کردی اور اگر وہ آپ کے پیسے لوٹانے واپس نہ آتی تو  
میں نے اس سے کہا۔ مجھے پورا یقین ہے میرا دل  
کسی کو پہچاننے میں دھوکا نہیں کھا سکا اور دیکھ لو! نمو  
میرے سامنے ہے۔“  
انہوں نے بڑے پیار سے نمو کو دیکھا تو وہ نروس  
ہو کر رہا کو دیکھنے لگی۔ رہا بھی اسے دیکھ کر مسکرا  
رہی تھی۔  
”آئی! آپ گھر میں اکیلی ہوتی ہیں؟“ رہا نے  
خاموشی محسوس کر کے سوال کیا۔  
”ہاں! انہوں نے گہری سانس لی۔ ”میں اور بس  
میرا بیٹا معجز۔“  
”اور آپ کے شوہر؟“ اب کے نمو نے پوچھا۔  
”معجز پندرہ سال کا تھا جب ان کی وفات ہوئی۔“  
ان کے لہجے میں افسردگی محسوس کر کے رہا نے بات  
بدل دی۔  
”اچھا آئی! اب ہمیں اجازت دیں۔“  
”بیٹا تھوڑی دیر اور بیٹھتیں۔ اچھا لگ رہا تھا تم  
لوگوں کی وجہ سے۔“  
”آئی! اچھا تو ہمیں بھی لگا آپ سے مل کر، لیکن  
امی کو ہم بازار کا کام کر آئے ہیں اور اب شام ہونے  
والی ہے۔“  
”کوئی بات نہیں میں تم لوگوں کو چھوڑ آتی ہوں۔  
اسی بہانے تمہارا گھر بھی دیکھ لوں گی۔“ انہوں نے  
مسکرا کر دونوں کے چہرے دیکھے۔  
”معجز! انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔  
سارا راستہ رہا اور آئی باتیں کرتے رہے جبکہ وہ  
یہ سوچ کر ہوتی رہی اگر امی کو پتا چل گیا کہ وہ کسی غیر  
کے ساتھ اس کی گاڑی میں آئے ہیں تو کیا شرم ہو گا اور  
اگر بھابھی نے دیکھ لیا تو۔ اس نے بے ساختہ



جھڑھری لے کر سامنے دیکھا تو نظریں مر رہی جا رہیں  
’جہاں دو آنکھیں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس نے  
سٹپٹا کر پورا چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔  
کار ان کے گھر کے دروازے کے آگے رکی۔ وہ  
دونوں اترنے لگی تھیں۔ جب انہوں نے آئی کی آواز  
سنی۔

”بیٹا! آپ نے ابھی بھی میرا نام نہیں پوچھا۔“ ان  
کی آواز میں شرارت تھی۔ نمروہ تو شرمندہ ہو گئی تھی  
جبکہ رمشا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔  
”آئی! آپ کا نام؟“ اب کے وہ شرارت سے  
بولی۔

”قدیمہ اشتیاق نام ہے میرا۔“ رمشا الوداعی  
کلمات کے ساتھ شکریہ ادا کرنے لگی تو اس نے دزیدہ  
نظروں سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں  
بڑے اطمینان سے اس کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔ وہ گھبرا کر  
کوئی بات کیے بغیر اندر کی طرف بھاگی۔ کچھ دیر بعد  
رمشا تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

”نمروہ! تم عقل کے ساتھ لگتا ہے متین بھی بیچ کر  
کھا گئی ہو۔ اخلاق نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ  
ہمیں چھوڑنے گھر تک آئیں اور تم نے شکریہ تک ادا  
نہیں کیا۔“

”تم تو رہنے دو۔“ نمروہ نے غصے سے اسے دیکھا۔  
”یہاں تم نے مجھے کتنے لیکچر دیے تھے اور وہاں خود  
کیسے ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔“  
”تو برا کیا کیا۔ کتنی اچھی آئی تھیں۔“  
”جب میں نے کہا تھا تب تو تم نے کچھ اور کہا  
تھا۔“

رمشا نظریں پڑاتے ہوئے بولی۔ ”تب میں ان  
سے ملی نہیں تھی۔“  
”چھا! تو سب عقل مند ہیں یہاں میں ہی بے  
وقوف ہوں۔ میں نے جب کہا وہ اچھی ہیں تب کیا  
تھا؟“

”چھابا! معاف کرو مجھے، میرا بحث کاموڈ نہیں۔“  
کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ نمروہ کتنی دیر تک

غصے میں وہیں کھڑی رہی۔

\*\*\*

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر روتی  
ہوئی رخسانہ پر پڑی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔  
”کیا ہوا رخسانہ؟“ اس کے پوچھنے کی دیر تھی۔ اس  
کے رونے کی رفتار میں مزید اضافہ ہو گیا۔  
”رخسانہ! آخر ہوا کیا ہے۔ کچھ پتا بھی تو چلے۔“ وہ  
کچھ جھنجھلا کر زور سے بولا۔

”وسیم! آپ مجھے بتائیں کیا حیثیت ہے میری اس  
گھر میں۔ ایک سال ہونے کو آیا ہے ہماری شادی کو  
لیکن ابھی تک اس گھر میں میری حیثیت نوکرانی سے  
زیادہ نہیں۔ اگر میں آپ کی امی کی پسند نہیں تو میرا  
قصور ہے۔ اگر آپ نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی  
کی ہے تو کیا یہ میری غلطی ہے۔ پسند کی شادی کرنا اتنا  
بڑا جرم ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو بھی آپ سے شادی نہ  
کرتی۔“

وسیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔  
”کسی نے نہیں کچھ کہا ہے؟“  
”چھوڑیں! رخسانہ نے منہ موڑ لیا تھا۔ وسیم نے  
زبردستی اس کا سرخ اپنی طرف کیا۔

”رخسانہ! بناؤ کس نے کہا ہے؟“  
”وسیم! میں سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی  
ہوں، لیکن آپ کی امی اور بہنیں ہر وقت مجھ سے  
ناراض رہتی ہیں۔ میں باہر جاؤں تو سب اٹھ کر  
دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ کمرے میں  
رہوں تو آپ کو اعتراض ہوتا ہے۔“

”امی نے کچھ کہا ہے؟“ وسیم کے پوچھنے پر وہ سر  
جھکا کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔  
”کیا کہا ہے انہوں نے؟ رخسانہ! میں کچھ پوچھ رہا  
ہوں۔“ اسے خاموش دیکھ کر وہ غصے سے بولا۔

”آپ کو پتا ہے نا؟“ وسیم سے میری طبیعت خراب  
ہے۔ امی کو بھی بتایا ہے میں نے، لیکن یہاں تو کسی کو  
میری پرواہی نہیں۔ پتا نہیں کس کی دعوت کرنی ہے

صبح سے اس کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسی لیے میں نے  
زوار کو فون کیا کہ اگر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔  
امی کو بتانے گئی کہ میں زوار کے ساتھ امی کی طرف  
جا رہی ہوں تو منع کر دیا انہوں نے۔“

آخر میں پھر وہ رونے لگی تو وسیم تیزی سے کھڑا ہوا  
اور اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی  
رخسانہ نے مسکراتے ہوئے آنسو صاف کیے اور پاس  
پڑا موبائل اٹھا کر زوار کا نمبر ڈائل کیا۔  
”ہیلو زوار! میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا تم  
مت آنا۔ میں خود وسیم کے ساتھ آ رہی ہوں۔“

”خیریت!“ دوسری طرف سے اس نے پوچھا۔  
”خیریت ہی ہے۔ مل کے بتاؤں گی۔“ اس نے  
مسکرا کر فون بند کر دیا۔

زوار در آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تو ٹی وی دیکھتی  
نمروہ اور زاہدہ کی ٹانگیں دباتی رمشا نے چونک کر  
دروازے کی طرف دیکھا جہاں غصے سے بھرا وسیم کھڑا  
تھا۔

”جب آپ جانتی تھیں کہ رخسانہ کی طبیعت  
ٹھیک نہیں تو پھر کیوں اسے آپ نے بچن میں جا کر کام  
کرنے کو کہا اور کیوں اسے اس کی امی کے گھر جانے  
سے منع کیا؟“

”میں نے کبھی اسے کوئی کام کرنے کو نہیں کہا۔  
آج مجبوری تھی تو صرف کباب فرانی کرنے کو کہا  
تھا۔“

”یہی کیا مجبوری تھی، گھر میں نمروہ اور رمشا موجود  
ہیں۔ کرنی کیا ہیں سارا دن۔ ان سے کہیں آپ وہی  
نوکرانی نظر آتی ہے آپ کو۔“

”سارے کام نمروہ اور رمشا ہی کرتی ہیں۔ ابھی بھی  
سارا کام نمروہ کر کے آتی ہے۔ رمشا نے ابھی سارے  
گھر کے کپڑے دھوئے ہیں۔ جس میں تمہارے اور  
تمہاری بیوی کے کپڑے بھی شامل ہیں اور رخسانہ کو  
اس لیے میکے جانے سے روکا تھا کہ کچھ لوگ رمشا کو  
دیکھنے آ رہے تھے۔ وہ جاتی تو تمہارا جانا لازمی تھا۔ تم  
اس گھر کے اکلوتے مرد ہو اور بد قسمتی سے ان بچیوں کا

پاپ بھی نہیں۔ اس لیے مجبوراً تمہیں کہنا پڑتا ہے۔  
تم دونوں موجود نہیں ہوتے تو لوگ طرح طرح کے  
سوال کرتے ہیں۔“

ان کی مکمل گفتگو پر کچھ لمحوں کے لیے وہ خاموش  
رہ گیا۔ گلا کھنکھار کر بولا۔

”بہر حال رخسانہ کو کام کا نہ کہا کریں۔ اس نے پہلے  
بھی مجھ سے کافی دفعہ شکوہ کیا ہے۔ میں ہی اگنور کر دیتا  
تھا۔ لیکن بار بار اگنور نہیں کر سکتا۔“

مرکز اس نے ایک نظر دونوں بہنوں پر ڈالی اور باہر  
نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی نمروہ تیزی سے ماں کی طرف  
بڑھی اور انہیں بازو کے گھیرے میں لے کر ان کے  
آنسو صاف کیے لیکن ان کے آنسوؤں میں مزید روانی  
آئی تھی۔ رمشا کے ماتھے کی شکنیں مزید گہری ہو گئی  
تھیں۔

”آپ کو صاف صاف بھائی کو سب بتانا چاہیے  
تھا۔ وہ بھائی کے کان بھر دیتی ہے اور وہ آپ پر چیختے  
چلاتے ہیں۔ کون سا بہن توڑنے کو کہہ دیا تھا اس  
مہارانی کو سارا دن وہ کرنی کیا ہے۔“  
اس کی آواز غصے کے مارے بلند ہوتی جا رہی تھی۔  
زاہدہ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

”خدا کے لیے رمشا! چپ کر جاؤ۔ کیوں مزید تماشہ  
بناؤ گی۔ تم جاؤ تیار ہو جاؤ۔ وہ لوگ آنے والے ہوں  
گے۔“

”مجھے نہیں ہونا تیار اور نہ ہی مجھے کسی سے ملنا  
ہے۔“ وہ غصے سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو  
زاہدہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے نمروہ کو دیکھا۔

”بیٹا! تم جاؤ۔ اسے سمجھاؤ۔ یہ تو روز کا مسئلہ  
ہے۔“

”امی! آپ پریشان نہ ہوں میں اسے سمجھاتی  
ہوں۔“

وہ انہیں دلاسارے کر باہر نکل آئی۔ کمرے میں  
داخل ہوئی تو رمشا بیڈ پر دونوں ہاتھوں میں سر ڈالے  
بیٹھی تھی۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ



گئی اس سے پہلے وہ کچھ کہتی، رشتے سرگھرا کر اسے دیکھا۔  
 ”دیکھو! اگر تم مجھے کوئی نصیحت کرنے یا سمجھانے آئی ہو تو بے کار ہے۔“  
 ”رشتا پلیر! تم کسی کا غصہ خود پر کیوں نکال رہی ہو۔“ رشتا جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔  
 ”حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔ جب سے وہ عورت ہمارے گھر آئی ہے۔ سلوک برادر کر کے رکھ دیا ہے۔ کبھی وسیم بھائی نے جواب دیا تھا اہی کو۔ اب دیکھو! اس نے کتابدگان کو دیا ہے وسیم بھائی کو ہم سب سے۔ مجھے تو اس کی پرائیم سمجھ میں نہیں آئی۔ کبھی ہم نے اس سے روایتی نندوں والا سلوک کیا؟“ وہ نمرو سے سوال کر رہی تھی۔

نمرو اسے کیا جواب دیتی، وہ خود اس کی سب باتوں سے اتفاق کرتی تھی۔ لیکن اب اس کی حمایت کرنا اس کے غصے کو مزید بڑھاوا دیتا تھا۔

”پلیز رشتا! تم اب اپنا موڈ خراب نہ کرو۔ تم جانتی ہو بھابی یہ سب ہمیں تنگ کرنے کے لیے کرتی ہیں۔ تم اس طرح کرو گی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گی اور اہی پریشان ہوں گی۔ اہی کی خاطر پلیز اپنا موڈ ٹھیک کرو۔“

رشتا کچھ دیر خاموشی سے کارپٹ کو گھورتی رہی جیسے ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”رشتا! نمرو نے اس کے ہاتھ تھام کر ہاتھی انداز میں اسے پکارا تو وہ گہرا سانس لے کر مسکرا دی۔

”تھنک یو۔ اب تیار ہو جاؤ۔ میں کچن میں جا رہی ہوں۔“ وہ مسکرا کر کھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

\*\*\*

سارا کا راتنامہ سننے کے بعد رخصانہ نے داوطلب نظروں سے دیکھا لیکن زوار کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

”کیا ہوا؟ تمہیں اچھا نہیں لگا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ زوار قطعیت سے بولا۔

”اس بلاوجہ کے معرکہ کی کوئی تنگ نہیں بنتی تھی۔ گھر

والوں کے ساتھ لگاؤ کرنے صرف تم اپنی ریوینشن مزید خراب کر رہی ہو بلکہ میری پوزیشن بھی کمزور کر رہی ہو۔“

رخصانہ نے برا سامنہ بنایا۔ ”اب تمہارا الو سیدھا کرنے کے لیے میں اپنا بنانا یا کام نہیں لگاؤ سکتی۔ مجھے ان لوگوں سے بنا کر رکھنے کی ضرورت نہیں میرا مطلب وسیم ہے اور وہ میرے قابو میں ہے۔ بس جو تھوڑی بہت اسے اپنے گھر والوں کے لیے ہمدردی ہے۔ وہ ختم ہو جائے تو میرا مقصد پورا۔ میرا ایک الگ گھر ہو گا۔ جہاں میں آزادی سے اپنی مرضی سے رہوں گی۔“

وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تو تمہیں وہاں کیا تکلیف ہے؟ اب بھی تمہیں مکمل آزادی ہے۔ وہ تین بے چاری عورتیں تمہیں کیا تکلیف دیتی ہیں۔“ رخصانہ نے کھاجانے والی نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔

”نہیں دیکھ رہی ہوں زوار! دن۔ دن اس چڑیل کا جالو زیادہ ہی تمہارے سر پر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ اپنی بہن کی خوشی تمہیں نظر نہیں آ رہی اور ان بے چاروں کی بے چارگی بڑی محسوس ہو رہی ہے۔“

رخصانہ کے جملے ہوئے انداز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”اب چڑیل تو نہ کو اسے اتنی معصوم اور خوب صورت ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

رخصانہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ”ایک بات کہوں تم سے؟“ رخصانہ نے بغور زوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں کہو۔“ وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”میرے نمرو کا قصہ ختم کیوں نہیں کر دیتے دنیا میں خوب صورت لڑکیوں کی کمی تھوڑا ہی ہے۔ اس سے زیادہ خوب صورت، حسین لڑکیاں ہمیں مل جائیں گی۔ بلکہ کئی ایک سو کو تو میں بھی جانتی ہوں۔“

اس کی مسکراہٹ بڑی تیزی سے غائب ہوئی تھی۔ ”آج تم نے یہ بات کہہ دی ہے۔ آئندہ مت

کہنا۔ نمرو نہیں تو کوئی نہیں۔ میرے لیے ساری خوب صورتی بس اس کی ذات میں ہے اور کوئی چوہا چاہے کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو۔ میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم کچھ نہیں کر سکتیں تو صاف بولو میں خود ہی کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔“ اس کی ناراضی دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔

”اب ناراض تو نہ ہو، میں نے بس ایسے ہی ایک بات کہی تھی۔ میں وسیم سے بات کروں گی۔“

”ہوں۔ میں کچھ دونوں کے لیے دینی جا رہا ہوں“ میرے آنے تک بات کر لیا۔

وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ رخصانہ نے غصے سے پاس پڑا شن اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

\*\*\*

کباب تلنے کے لیے اس نے فراننگ پین میں تیل ڈالا جب ڈور تیل بجی تھی اس نے ایک نظر گرم ہوتے تیل کو دیکھا اور چولہا لگا کر کے باہر کی طرف دوڑ لگا لی۔ وہ متوقع مہمانوں کی منتظر تھی لیکن دروازے کھلتے ہی سعدیہ اور نیل کی شکل دیکھ کر وہی رک گئی۔

”ارے بھئی، اندر تو آنے دو۔“ اسے یونہی دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ کر سعدیہ نے ٹوکا تو وہ کھسکا کر پیچھے ہٹی۔ ننھے حمزہ کو اس نے سعدیہ کی گود سے لے لیا تھا۔

”اُمی کہاں ہیں؟“ خالی لاؤنج دیکھ کر سعدیہ نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں ہیں۔“ وہ حمزہ کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

”یہ جلنے کی بو کہاں سے آ رہی ہے؟“ نیل کے پوچھنے پر اس نے حمزہ کو نیل کی گود میں تھمایا اور کچن کی طرف بھاگی۔ فراننگ پین میں پڑا تیل خشک ہو چکا تھا جبکہ فراننگ پین جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

”کیا ہوا کچھ جل گیا؟“ وہ سنک میں فراننگ پین رکھ رہی تھی جب اس نے نیل کی آواز سنی۔

”نہیں۔ بس تیل جلا ہے۔“ اس نے مسکرا کر

جواب دیا۔

”ہوں! نیل نے نظریں گھما کر کچن کا جائزہ لیا۔

”کافی اہتمام کیا ہے تم نے کوئی خاص مہمان آرہے ہیں؟“ نمرو نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جی بالکل صحیح پہچانا آپ نے مہمان آرہے ہیں اور وہ بھی خاص الخاص مہمان۔“

”اچھا! اب کے نیل بھی مسکرایا۔ ایسے کون سے خاص مہمان ہیں؟“

”رشتا کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔“

وہ حلوے کے لیے باوام کٹ رہی تھی اس نے نہیں دیکھا کہ نیل کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی ہے۔ مسلسل خاموشی پر نمرو نے مڑ کر نیل کو دیکھا جو فرش کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کس سوچ میں کم تھا۔ نمرو کے زور سے پکارنے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”نیل بھائی! کچن میں کافی دھواں ہے۔ آپ اسے باہر لاؤنج میں لے جائیں۔ میں آپ کے لیے چائے اور کباب مل کر لاتی ہوں۔ کھا کر تائیے گا میں نے بنائے ہیں۔“

نیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے کچن سے باہر نکل گیا۔ اس نے رشتا کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ کھلے بالوں کو کچھو میں جکڑتی ہوئی اپنے دھیان میں آ رہی تھی۔ اس کے بہت قریب پہنچ کر اس نے نظریں اٹھائیں۔ اسے اتنے قریب دیکھ کر وہ بے ساختہ انداز میں رکی اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک بیٹھی گئی۔ کچھ تھاس کے چہرے پر جو وہ سمجھ نہیں پاتی تھی اس نے حمزہ کو اس کی طرف بڑھایا۔

”بھابی کو بتا دینا میں جا رہا ہوں، طرافت بھائی کو فون کر دیں۔ میں انہیں لینے نہیں آسکتا۔“

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا جبکہ رشتا کتنی دیر تک اس طرف دیکھتی رہی جہاں سے وہ گیا تھا۔

\*\*\*

وہ حمزہ کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی جب آہٹ پر



اس نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں نیل کھڑا تھا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر نیل کو دیکھا۔  
 ”کچھ چاہیے تھا نیل؟“  
 ”نہیں بس ایسے ہی پانی پینے آیا تھا۔“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا تو وہ سر ہلا کر فیڈر میں دودھ ڈالنے لگی۔ وہ یکنے سے باہر نکلنے لگی جب نیل کی پکار پر رک گئی۔  
 ”بھابھی! میں آپ سے بات کرنے آیا تھا۔“ سعدیہ رک گئی اور پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔  
 ”بھابھی! میں گھما پھرا کر بات نہیں کروں گا۔ میں رمشا سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں آپ میرا پر بزل لے کر ہاں جائیں۔“  
 نیل کی بات اس کے لیے اتنی غیر متوقع تھی کہ الفاظ کہیں گم ہو کر رہ گئے تھے۔  
 ”میں نے کچھ غلط کہا؟“ اسے یوں خاموش دیکھ کر وہ بولا تو وہ گڑگڑا کر جلدی سے بولی۔  
 ”نہیں مجھے کیا اعتراض ہو گا لیکن وہ آج۔۔۔ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے وہ دوبارہ بولا۔  
 ”مجھے بتا ہے آپ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔“ سعدیہ کے چہرے پر اب پریشانی جھلکنے لگی تھی۔  
 ”کیوں بھابھی! کیا میں آپ کو اپنی بہن کے قابل نہیں لگتا؟“  
 ”نہیں نیل! ایسی بات نہیں لیکن کیا امی، آپا، باجی سب مان جائیں گی؟“ اس نے اپنی ساس اور منڈوں کا حوالہ دیا۔ ”وہ لوگ کبھی نہیں مانیں گے۔“ سعدیہ نے جیسے اسے جتایا تھا۔  
 ”وہ لوگ نہیں مانیں گے تو ان کی مرضی۔ میرے لیے جس کی مرضی اہم ہے وہ رمشا ہے، کیونکہ زندگی میں نے اس کے ساتھ گزارنی ہے۔“ اب کی بار سعدیہ کچھ نہیں بولی۔  
 ”آپ اپنے گھر بات کریں۔ میں امید کرتا ہوں۔ جواب ہاں میں ہی ہو گا۔“ وہ کہہ کر راکھیں تھا سعدیہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔



وہ چائے لے کر آئی تو رمشا حمزہ کو گود میں لیے کھڑی رہی جبکہ سعدیہ رمشا کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے ہاں آگے بڑھانے پر بھی اس کی نظروں کے ارتکاز میں کوئی فرق نہ آیا تو حمزہ کو اسے پکارنا پڑا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر کپکپاتہ لیا۔  
 ”کیا بات ہے باجی! آپ کچھ پریشان ہیں۔“  
 اس کے پوچھنے پر رمشا نے بھی حمزہ سے نظر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ان دونوں کو متوجہ دیکھ کر سعدیہ نے خود کو وہ سب کہنے کے لیے تیار کیا۔ جسے کہنے کے لیے وہ رات بھر جملے ترتیب دیتی رہی تھی اور اب پچھلے آدھے گھنٹے سے ہمت جمع کر رہی تھی۔  
 ”در اصل میں امی سے ایک بات کرنے آئی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے سوچا۔ میں تم سے بات کر لوں۔“  
 رمشا سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔  
 ”کل نیل میرے پاس آیا تھا۔ اس نے کہا وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“  
 غور سے سعدیہ کی بات سنتی حمزہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس نے مسکراتے ہوئے رمشا کی طرف دیکھا لیکن اس کے سپاٹ اور قدرے سخت تاثرات دیکھ کر اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔  
 ”میں آج امی سے یہی بات کرنے آئی ہوں۔ سوچا تمہیں بھی بتا دوں۔“  
 ”امی سے اس سلسلے میں کوئی بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ رمشا کے دو ٹوک انداز پر سعدیہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔  
 ”کیوں؟“  
 ”کیونکہ میں نیل سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“  
 ”وہی تو پوچھ رہی ہوں کیوں؟“  
 ”یہ آپ پوچھ رہی ہیں آپا! کیا میں نہیں جانتی کیا سلوک ہوتا ہے وہاں آپ کے ساتھ۔“ سیا ظرافت

بھائی کی عادت مجھے نہیں پتا اور پھر نیل۔۔۔ وہ بھی ان ہی کا بھائی ہے۔ اسی گھر کا حصہ جہاں میں بھی ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔“  
 ”میں مانتی ہوں میرے ساتھ ان لوگوں کا سلوک اتنا اچھا نہیں رہا لیکن حمزہ کی پیدائش کے بعد ظرافت بہت بدل گئے ہیں اور جہاں تک نیل کی بات ہے وہ شروع سے بہت مختلف ہے۔ اپنے والد کے بعد ظرافت ہی گھر کے بڑے تھے۔ شادی کے بعد ان کی امی کو لگتا تھا کہ کیس وہ بدل نہ جائیں مگر ان کی اور بہنوں کی حق تلفی نہ کرنے لگیں۔ ظرافت مجبور تھے لیکن نیل! ذرا اور طرح کا ہے۔ اس نے خود تمہارا نام لیا ہے صاف مطلب ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے اور مجھے یقین ہے وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا۔“  
 سعدیہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور دوبارہ بات شروع کی۔  
 ”رمشا! اچھے رشتوں کا ملنا بہت مشکل ہے۔ نیل گڈ لکنگ ہے۔ اچھی جاب پر ہے، دیکھا بھلا ہے اور سب سے بڑی بات تمہیں پسند کرتا ہے اور کیا چاہیے۔“  
 ”اپنا پلیر! میں نے آپ کو بتادیا۔ آپ بھی مجھے فورس نہ کریں۔“ وہ حمزہ کو سعدیہ کی گود میں دے کر مزید بات کا موقع دے بغیر گھر سے باہر نکل گئی۔  
 سعدیہ نے جن نظروں سے حمزہ کو دیکھا وہ سمجھ گئی تھی کہ ایک بار پھر رمشا کو سمجھانے کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر آگئی ہے۔ اس نے گہرا سانس لے کر سعدیہ کے کندھے پر دلا سا دینے کے انداز میں ہاتھ رکھا اور جب کمرے میں آئی تو رمشا سر سے پیر تک چادر تانے سو رہی تھی یا نہیں لیکن اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بات نہیں کرنا چاہتی۔ حمزہ گہرا سانس لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔



دور درخت کے نیچے کھڑی دین کا انتظار کر رہی تھی۔ جب چند قدم کے فاصلے پر ایک کار آ کر رکی تھی۔ اس

نے بالکل سرسری سی نظر سامنے ڈالی لیکن کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے شخص کو دیکھ کر اس کی نظریں پلٹنا بھول گئیں۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے بالکل سامنے تھا۔  
 رمشا کو رنی بھر امید نہ تھی کہ وہ یہاں پہنچ جائے گا۔  
 ”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ اس کے سنجیدہ انداز پر رمشا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔  
 ”بولیں۔“  
 ”مجھے تم سے جو بات کرنی ہے وہ یوں راستے میں کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتی۔“ اس نے کالج کی آئی جانی لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔ ”زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“  
 رمشا کو متذبذب دیکھ کر وہ بولا تو وہ سر جھکا کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بہت دیر تک سیدھی بیٹھی شیشے کے پار بھاگتی ٹریفک کو دیکھ رہی تھی۔ اسے نیل کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی تھی جو اسے بات کرنے کے لیے لایا تھا اور اب خاموش تھا۔ جب کافی وقت اسی خاموشی میں گزر گیا تو اس کی برواشت جواب دے گئی۔  
 ”آپ نے کوئی بات کرنی تھی۔“ رمشا نے چہرہ گھما کر جتاتے ہوئے انداز میں نیل کو دیکھا۔  
 ”تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیوں کیا؟“  
 نیل نے سیدھا سوال کیا تھا۔ وہ بالکل حیران نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ اس سے اسی سوال کی توقع کر رہی تھی۔  
 ”میرا خیال ہے اتنا تو مجھے حق ہے کہ میں اپنی شادی کے لیے ہاں یا ناں کہہ سکوں۔“ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ اس نے چونک کر نیل کی طرف دیکھا۔  
 جس کے چہرے کے تاثرات کافی سنجیدہ تھے اور وہ جو کافی مطمئن بیٹھی تھی ایک دم گھبرا گئی۔  
 ”ہے حق۔۔۔ لیکن میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ مجھے ریمیجیکٹ کیوں کیا؟“ اس کے تند لہجے پر اس نے بے چینی سے اپنے ہاتھ مٹکے۔  
 ”میں نے آپ کو ریمیجیکٹ نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا ہے کہ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔“  
 ”وہی پوچھ رہا ہوں کیوں؟“



”میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ آپ بلیز مجھے کھرچوڑیں۔“

”مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔ اس کے بغیر تم نہیں جاسکتیں۔“ اس کے دھمکی آمیز انداز پر اسے غصے کے ساتھ رونا بھی آنے لگا تھا۔

”آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔“

”میں کوئی زبردستی نہیں کر رہا، صرف جواب مانگ رہا ہوں۔“ رمشانے کوئی جواب نہیں دیا تھا، چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔

”کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟“ کچھ دیر بعد اس نے نیل کی آواز سنی۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح منہ موڑے بھولی۔

”تو کیا تمہیں میں پسند نہیں؟“ اب کی بار رمشانے مرکز اس کا چہرہ دیکھا۔

”جی، مجھے آپ پسند نہیں۔ آپ کے گھروالے گھر کا ماحول کچھ پسند نہیں۔ آپ کے گھر میں سعدیہ بانی کے ساتھ جو سلوک ہوتا رہا ہے اس کے بعد بھی آپ توقع رکھتے ہیں کہ میں اس گھر کا حصہ بنوں گی۔ جس طرح ظرافت بھائی اور آپ کی بہنیں مل کر باہمی کو تاجر کرتی ہیں۔ آپ چاہتے ہیں میرے ساتھ بھی ویسا ہی ہو اور میں بھی احساس کتری کا شکار ہو کر ذہنی مریض بن جاؤں۔“

”میں یہ نہیں کہوں گا جو تم نے کہا غلط ہے۔ بے شک ایسا ہی ہوتا ہو گا لیکن پہلے میں یہاں نہیں تھا۔ مجھے کینڈا سے آئے چند ماہ ہوئے ہیں۔ جو ہوا میں اسے بدل تو نہیں سکتا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“

”ہو نہ ہو!“ رمشانے سر کو جھٹکا دیا۔ ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔“ اس کے کہنے پر وہ مسکرایا تھا۔

”خیر تم جو بھی کہو میں صرف اتنا جانتا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں اور مجھے بس تم سے ہی شادی کرنی ہے۔“

اور رمشانے اتنی حیرت سے نیل کو دیکھا، جیسے اس کے سر پر سینک ٹکل آئے ہوں۔ ابھی کچھ ماہ

ہوئے تھے کہ وہ ملے تھے۔ ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں تھے اور اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے کبھی نیل سے آرام سے مسکرا کر بات کی ہو۔ اس کے اتنے بڑے رویے کے باوجود وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

وہ کتنی دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، پھر خود ہی نظریں ہٹائیں۔ صرف ایک جملے کے بعد اس کے پاس جیسے کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس کی خاموشی پر نیل نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا یوں سارا راستہ خاموشی میں گنا تھا۔

وہ گاڑی سے اترنے لگی تھی جب نیل نے اسے پکارا تھا۔

”میں نہیں جانتا رمشا! تمہیں میری باتوں پر یقین ہے یا نہیں لیکن میری تم سے ایک ریکونٹسٹ ہے تم ایک دفعہ نیوٹرل ہو کر میرے بارے میں سوچو۔“

رمشانے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس خاموشی سے کار سے اتر گئی تھی۔

\*\*\*

”کیا ہوا۔“ آج دیر ہو گئی۔ ”وہ منہ ہاتھ دھو کر واش روم سے باہر آئی تو نمواہی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

”ہاں!“ وہ مختصر سا جواب دے کر بیٹھ گئی اور ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی کپٹیوں کو دبائے لگی۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ نمونے تشویش سے اسے دیکھا۔

”ہوں بس سر میں درد ہے۔“

”کھانا کھاؤ پھر چائے کے ساتھ ٹیبلٹ دیتی ہوں۔“

”تم رہنے دو میں لے لوں گی۔“ نمونے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بات ہے رمشا! تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے۔“

رمشانے سر اٹھا کر سامنے بیٹھی اپنی ہرا ز بن کو دیکھا اور فیصلہ کن انداز میں گہرا سانس لیا۔

”آج نیل کلج آیا تھا۔“ نموجران تو ہوئی لیکن

کوئی بھی سوال کیے بغیر خاموشی سے رمشا کو دیکھتی رہی۔

”اس نے کہا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”ہوں پھر!“ اب کے رمشانے حیرت سے نمو کو دیکھا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟“

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔“ نمونے کندھے اچکا کر کہا۔

”نموجران محبت؟ وہ کیسے مجھ سے محبت کر سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی اس سے اچھی طرح بات کرنا تو دور اسے دیکھا تک نہیں۔“ اس کے استعجاب بھرے انداز پر نمو کھل کر مسکرائی۔

”یہی تو بات ہے رمشا! کہ تم نے کبھی انہیں دیکھا۔ نہیں اگر کبھی غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھیں تو تمہیں خود ہی اندازہ ہو جاتا۔“ رمشا نمو کو دیکھتے ہوئے سرنگی میں ہلانے لگی جیسے اسے جھٹلارہی ہو۔

”پتا ہے جب حمزہ پیدا ہوا تھا تو اسپتال میں تم اور نیل بھائی ساتھ کھڑے اتنے اچھے لگ رہے تھے۔ میں نے دل سے دعا کی تھی تم دونوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے پوری بھی کر دی۔ نیل بھائی نے پروپوزل بھی بھجوا دیا لیکن تم۔“

آخر میں نمونے برا سامنا بنایا لیکن رمشانے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ غائب دماغی سے سامنے لگی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

\*\*\*

دروازے میں کھڑی شخصیت کو انہوں نے کافی حیرانی سے دیکھا تھا۔

”السلام علیکم! اجنبی، خوش لباس اور خوش شکل عورت نے انہیں سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ زاہدہ کے معذرت خواہانہ انداز پر وہ مسکرا دیں۔

”یقیناً“ نہیں پہچانا ہو گا کیونکہ ہم لوگ پہلی بار مل رہے ہیں۔ کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ ان کے اجازت مانگنے پر زاہدہ نے کچھ شرمندہ ہو کر رست دیا۔

”میرا نام قدسیہ ہے۔“ اندر داخل ہو کر انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

”نموجران!“ رمشا اونچی آواز میں اسے پکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”ہاں بولو!“ وہ بالوں میں تیل کا مساج کرتی ہوئی بولی۔

”وہ قدسیہ آئی آئی ہیں۔“ تیل کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے پتی تھی۔

”وہ امی کے پاس بیٹھی ہیں اور تمہیں بلا رہی ہیں۔“

نموجران کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے نچلا ہوٹ دا نتوں تلے دبایا۔

”پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اپنا حلیہ ٹھیک کرو اور ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔ میں چائے لے کر آئی ہوں۔“

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اس کی پہلی نظر قدسیہ بیکم پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھیں پھر تیزی سے اس کی نظریں یوں کے چہرے تک گئی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی نرم سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے پریشان دل کو قدرے فرما رہا تھا۔

”لگتا ہے نمونے اپنی آنٹی کو پہچانا نہیں۔“ اس کو مسلسل دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ بولیں تو وہ کھسیا کر سلام کرتی ہوئی زاہدہ کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”آپ بہت خوش قسمت ہیں زاہدہ بہن! جو آپ کے پاس نموجر جیسی بیٹی ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ میری کوئی بیٹی نہیں لیکن نموجر کو دیکھ کر ایک گئی کا احساس ہوا کہ کاش! میری بھی نموجر جیسی بیٹی ہوتی۔ کتنے دن سوچتی رہی اور پھر دعاؤں نے کہا کہ یہ تو اب بھی ہو سکتا ہے نموجر اب بھی میری بیٹی بن



سکتی ہے۔

وہ جو مسکراتے ہوئے اپنی تعریف سن رہی تھی آخری جملے پر کچھ الجھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جو بہت پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”نمرو! تم نے بتایا نہیں کہ تمہاری ملاقات قدسیہ بن سے ہوئی تھی۔“

زاہدہ کے سوال پر وہ پریشان ہو کر ماں کا منہ دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتی۔ قدسیہ بیگم نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

”بس اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے عزیز ایڈمٹ تھے اسپتال میں۔ ان کی عیادت کے لیے گئے تھے ہم وہیں ہماری ملاقات نمرو سے ہوئی۔“

ان کے بیان پر اس کی سانس بحال ہوئی تھی۔ وہ رسمی ملاقات اپنے اختتام تک خاصی بے تکلفی میں بدل چکی تھی۔ قدسیہ بیگم نے زاہدہ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور رخصت ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد زاہدہ نے قدسیہ بیگم کی آمد کی وجہ بتائی تو حیرت کی شدت سے اس کا منہ کھل گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر زاہدہ اور مرثا دونوں ہنس پڑے تھے۔

”منہ تو بند کر پاگل!“ مرثا نے ہنستے ہوئے اسے چپت لگا لی تو وہ جھینپ کر ماں کو دیکھنے لگی جنہوں نے اسے ساتھ لپٹا لیا۔

”یہ پاگل نہیں میری بہت پیاری بیٹی ہے۔“ ان کی بات پر مرثا نے شرارتی انداز میں ان کے کندھے سے سر نکالے نمرو کو دیکھا۔

”پیاری تو ہے امی! پر اتنا درجے کی بے وقوف بھی ہے۔ میں تو آنٹی کی چوائس پر حیران ہوں۔ انہیں اچھا کیا لگا؟“ اس کے ہونٹوں پر مسلسل شرارتی مسکان تھی۔

”امی! بیکس اسے۔“ نمرو نے شکایتی انداز میں زاہدہ سے کہا۔

”مرثا! تنگ مت کرو اسے۔“ انہوں نے مرثا کو ٹوکا تھا۔ ”اور ویسے بھی میرے کی پہچان جو ہری کو ہی ہوتی ہے۔ اور میری بیٹی ہیرا ہے ہیرا۔“

نمرو نے زبان نکال کر مرثا کو چڑایا، جو قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔

”دیکھیں امی! ایسے خوش ہو رہی ہے۔“ مرثا نے مسکراتی ہوئی نمرو کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ چوما۔

”اللہ تعالیٰ تم دونوں کو اپنے گھروں میں آباد رکھے۔ کہاں میں مرثا کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اللہ نے بیٹھے بٹھائے تم دونوں کے اتنے اچھے رشتے بھیج دیے۔“ ان کا چہرہ ان کی جی خوشی کی غمازی کر رہا تھا۔

”قدسیہ بیگم انوائٹ کر کے گئی ہیں۔ وسیم آئے تو اس سے بات کر کے ان کے گھر کا پروگرام بنائیں گی۔“ وہ مرثا سے کہہ رہی تھیں جبکہ نمرو سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

”رات بہت ہو گئی ہے عمو جواب تم دونوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ان کے باہر نکلتے ہی مرثا بول پڑی۔

”مجھے تو ان پر اور ان کے بیٹے پر ترس آ رہا ہے۔ چہ۔“ مرثا نے باقاعدہ افسوس کا اظہار کیا تھا تو نمرو نے پاس بڑا تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا، جسے پیچ کرنے کے بعد وہ پھرنے لگی تھی۔

”میں سب اپنی مرضی کرتے ہیں۔ مجھ سے کسی نے پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ خود ہی سب طے کر لیا ہے۔“

”ہوں!“ مرثا کے ہنکارا بھرنے پر نمرو نے چونک کر اسے دیکھا جو پاؤں میں سلیپر ڈال رہی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر نمرو نے حیرت سے پوچھا۔

”امی کو بتانے کہ تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں۔“

”مرثا!“ وہ چیختی۔ ”میں نے یہ کب کہا۔“

”تو پھر پسند ہے؟“ مرثا نے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”نفع ہو جاؤ۔“ وہ جا کر بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔

”مرثا! مجھے تنگ مت کرو تیند آ رہی ہے مجھے۔“

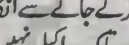
”تیند آ رہی ہے یا معینہ کے سنے دیکھنے لگی ہو۔“

”ہکو مت۔“ وہ تکیے میں منہ دبائے ہوئے بولی تو مرثا ہنستی ہوئی اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔

”تم بھی دیکھو رمبض کے سینے۔“

نمرو کے کہنے پر اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحوں میں اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔ بند آنکھوں کے پیچھے کوئی اور ہی مسکراہٹ تھا۔

”نیل!“ وہ حیرانی سے بڑبڑاتی تھی۔



وہ غصے سے سارے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ تقریباً ”ایک گھنٹہ پہلے زاہدہ بیگم اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ یہ کہنے کہ وہ رشتہ دیکھنے جا رہی ہیں۔ وہ ان کے ساتھ چلے۔ اس نے تفصیل سے بغیر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے جانے سے انکار کر دیا۔ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہو تاکہ وہ اکیلی نہیں وسیم کے ساتھ جا رہی ہیں تو وہ کبھی بھی انکار نہ کرتی۔ وہ دونوں ماں بیٹا ایک ساتھ گئے تھے۔“

پتا نہیں راستے میں کیا کیا بیٹیاں پر بھاری ہوں گی۔ یہ خیال اسے غصہ دلانے کو کافی تھا اور زیادہ غصہ اسے وسیم پر آ رہا تھا۔ اس نے اسے بتانے کی زحمت تک نہیں کی۔

وہ ہاتھ مسلتی کتنی دیر گھڑی کو دیکھتی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر آ گئی۔ نمرو اور مرثا دونوں لاؤنج میں بیٹھی لیوی دیکھ رہی تھیں۔ وہ دونوں کی ڈرائے پر بیٹھ کر تے ہوئے اتنی مگن تھیں کہ اس کی وہاں موجودگی کا نوٹس ہی نہ لیا۔

”چھا ہے اس کا رشتہ ہو جائے اور یہ جائے۔“ قہقہہ کی طرح تیز زبان ہے۔“ ہنستی ہوئی مرثا کو دیکھ کر رخسانہ نے منہ بنایا اور پھر اس کی نظر نمرو پر پھیر گئی

ساتھ ہی زوار کی خواہش بھی ذہن میں آ گئی۔

”آخر کیا ہے اس لڑکی میں۔“ اس نے بغور نمرو کو

دیکھا۔ ”بالکل ساہو سی تو ہے۔“ اس کے ذہن میں اور بہت سی لڑکیاں آئیں جو زوار میں دھچی رکھتی تھیں۔ نمرو سے کئی درجہ حسین، طرح دار اور دولت مند۔ اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔

اس کے نقوش خوبصورت ہیں لیکن وہ تو مرثا کے بھی ہیں ہاں! کچھ دیر بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچی۔ اس کی معصومیت۔ اس کے چہرے پر ایک خاص نرمی اور ملاحظت تھی جو اسے سب سے نمایاں کرتی تھی۔ وہ شاید یونہی کھڑی جاہزہ لیتی رہتی لیکن گاڑی کے مخصوص ہارن پر وہ چونگی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ وسیم چپ کمرے میں داخل ہوا وہ بازو آنکھوں پر رکھے لیٹی تھی۔

”اب طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ وسیم کے پوچھنے پر اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ کو اپنی مصروفیت میں یاد رہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وسیم ہاتھ روم کی طرف جاتے جاتے رگ گیا۔

”مطلب یہ کہ آپ چلے گئے۔ جانے سے پہلے آپ نے ایک دفعہ زحمت نہیں کی کہ مجھے بتا دیں۔ آپ نے ضروری نہیں سمجھا کہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔“

”امی نے تم سے پوچھا تو تھا۔“

”ہاں۔ جس دل سے پوچھا تھا۔ مجھے پتا ہے صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجھے لے جانا نہیں چاہتیں۔“ وسیم کوئی جواب دیے بغیر ہاتھ روم چلا گیا۔

رخسانہ نے غصے سے ہاتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ مگر وسیم کے باہر آنے تک اپنا غصہ کنٹرول کر چکی تھی۔

”کر آئے آپ لوگ مرثا کی بات پکی؟“

وسیم نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ہم نمرو کے رشتے کے لیے گئے تھے۔“

”کیا؟“ رخسانہ کو لگا، اسے سننے میں غلطی ہوئی



سب کے؟

”ارے بابا نمرو کے“

”یہ نمرو کا رشتہ کہاں سے آگیا۔ بت تو رمشا کی چل رہی تھی۔“

”ہاں رمشا کی بھی چل رہی ہے۔ امی نے کل بتایا تھا کہ ایک خاتون نمرو کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ اسپتال میں نمرو سے ملی تھیں وہ امی کو اچھی لگیں۔ آج ہم ان کے گھر گئے تھے۔ کافی ویل آف فیل ہے ایک ہی بیٹا ہے ان کا اپنا بڑا پس ہے۔ مجھے تو وہ لوگ پسند آئے اسی لیے تو امی نے تمہیں بھی ساتھ جانے کو کہا تھا۔“

رخسانہ کو تو جیسے مرچیں سی لگ گئیں تھیں۔ ”سب کچھ آپ دونوں پالا ہی پالائے کر آئے۔ نہ کچھ بتایا نہ کچھ پوچھا۔ اب بھی بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ شادی والے دن بتاتے تے“

اس کے پیش بھرے انداز کو وہ سم نے حیرت سے دیکھا۔

”اس میں اتنا غصہ کرنے والی کیا بات ہے۔ رمشا کی دفعہ میں تم نے کوئی انٹرسٹ شو نہیں کیا تھا۔ اسی لیے میں نے ہی امی سے کہا تھا کہ تمہیں بعد میں بتا دیں گے۔“

رخسانہ کا پس نہیں چل رہا تھا۔ وہ کیا کر ڈالے۔ اسے واقعی وہ سم کے علاوہ گھر کے لوگوں اور ان کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن بات یہاں نمرو کی تھی۔ اس کے بھائی کی پسند کی۔ وہ بھائی جو اکلوتا تھا۔ اس کا مہیکہ اس کا ماں اور اسے ناراض کرنے کا وہ رسک بھی نہیں لے سکتی تھی۔ وہ سم کی جتنی تنخواہ تھی اس میں تو بس گھر ہی چلتا تھا۔ اس کے خرچے اس کے خرچے بھی تو زوار ہی اٹھا تھا اور اس کی ضدی طبیعت سے بھی وہ واقف تھی۔ اگر زوار نے نمرو کا نام لیا تھا تو ضرور بات پسند ہے زیادہ تھی اس نے تو اس لیے گھر میں بات نہیں کی تھی کہ رمشا بڑی تھی۔ ابھی رمشا کی بات نہیں طے نہیں ہوئی تو نمرو کا کیا ذکر لیکن کیا پتا تھا کہ اندر ہی اندر کیا کچھڑی پک رہی ہے۔

اس نے نظر گھما کر وہ سم کو دیکھا جو بیڈ پر نیم دراز لیٹی دیکھ رہا تھا۔ وہ پریشانی سے زوار کے بارے میں سوچنے لگی۔

\*\*\*

رمشا کو دیکھ کر سعدیہ پہلے حیران ہوئی اور پھر ایک دم خوش ہو کر اس کے گلے لگ گئی۔

”یوں اچانک!“ اس سے الگ ہو کر سعدیہ نے پوچھا۔

”کیوں مجھے دیکھ کر آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولی تو سعدیہ نے پھر اسے گلے لگالیا۔

”ارے باگل! خوشی اتنا اچھا لگ رہا ہے تمہیں دیکھ کر تم سے کل بات ہوئی تھی لیکن تم نے آنے کا ذکر نہیں کیا۔“

”سوچا آپ کو سر پر اتار دوں گی۔“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے رمشا نے کہا۔

”بڑا اچھا کیا۔“ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئیں جہاں سعدیہ کی ساس بیوی دیکھ رہی تھیں۔ اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے اسے خود سے لپٹا کر بڑے والہانہ انداز میں پیار کیا۔ رمشا کتنی دیر تک تو حیرت کے مارے مل ہی نہیں سکی۔ یہی سعدیہ کی ساس تھیں جن کے ماتھے کے بل ان کی آمد پر صاف دیکھے جاسکتے تھے اور آج اتنا پیار۔

”کیسی آتی ہو بیٹا!“

”جی وہ سم بھائی چھوڑ کے گئے ہیں۔“

”اچھا اور گھر میں سب ٹھیک ہیں۔“

”جی!“ اس نے جواب دے کر سعدیہ کو دیکھا جو پھل اس کے آگے رکھ رہی تھی۔

”سعدیہ! بہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور وہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرو۔“

یہ دوسرا انقلاب تھا اور نہ پہلے تو سعدیہ کو اکیلے بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اسی حیرانی کے ساتھ سعدیہ کے کمرے میں چلی آئی۔

”بابی! سب ٹھیک ہے نا آپ کی ساس اور اتنی مہربان۔“ اس کی حیرانی پر سعدیہ ہنس پڑی۔

”ہاں بس سب ٹھیک کی وجہ سے ہے۔“

”اچھا۔“ بہت سی ساس کے منہ سے نکلا تھا۔

”اچھا یاد آیا۔ تم نے اس رشتے سے انکار کیوں کیا؟ اتنے اچھے لوگ تھے پتا ہے امی کو کتنا افسوس ہے۔“

”ایسے ہی۔“

”ایسے ہی؟“ سعدیہ نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے اچھے رشتے کتنی مشکل سے ملتے ہیں اور تم نے ایسے ہی کہہ کر اتنے اچھے رشتے کو ٹھکرا دیا۔“

”بابی! بلین۔“ اب کہ وہ آتا کر بولی۔ ”اسی بحث سے تنگ آکر میں آپ کے پاس آئی تھی اور آپ بھی وہی قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔“

اس کے جواب پر سعدیہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”اتنے اچھے رشتے سے انکار کے پیچھے کوئی تو وجہ ہوگی۔“ سعدیہ کے جتانے ہوئے انداز پر بیڈ شیڈ کے ڈرائیور چلتی اس کی انگلی لمحہ بھر کے لیے رک سی گئی۔

”میں تمہاری بہن ہوں اگر تم مناسب سمجھو تو مجھ سے شیر کر سکتی ہو۔“

رمشانے نظریں اٹھا کر سعدیہ کا چہرہ دیکھا۔

”پتا نہیں بابی! میں خود نہیں جانتی کیوں کیا۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”لیکن میں سمجھ گئی ہوں۔“ اب کے سعدیہ مسکرا کر بولی تھی۔

رمشانے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا؟“

”کچھ نہیں۔ تم یہ بتاؤ جو نمرو کے لیے رشتہ آیا ہے وہ کیا ہے؟“

”اچھے لوگ ہیں۔ قدسیہ آئی سے پہلے بھی مل چکی ہوں۔“

”اچھا کہاں؟“ سعدیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ جواباً رمشا نے نمرو کے مدد لینے سے لے کر ان کے گھر جانے تک کا سارا احوال سنا ڈالا۔ ساری بات سن کر سعدیہ

ہنس پڑی۔

”اپنی نمرو شروع سے ہی لگی ہے۔ لیکن جو ہوا اسے قسمت کتنے ہیں۔ نمرو خوش ہے؟“ سعدیہ کے پوچھنے پر رمشا گل کر مسکرائی۔

”اور رخسانہ وہ کیسی ہی؟“ رمشا نے گہرا سانس لیا۔

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آج کل کچھ امن ہے۔ شاید انہیں کوئی ایڈوٹ نہیں مل رہا جس کو بڑھا چڑھا کر بھائی کے کان بھرس۔“

”اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اس کے لیے ہدایت کی دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ اچھے اچھوں کو سیدھا گرو دیتے ہیں۔ میرے سسرال والوں کی مثال تمہارے سامنے ہے۔“

سعدیہ کے کہنے پر رمشا مسکرا دی۔ تب ہی دروازے پر ہونے والی دھمک پر دونوں مڑ کر دیکھا۔

”بھابھی! اجنر۔“ نیل بولتا ہوا اندر آیا اور رمشا پر نظر پڑتے ہی پلٹنے لگا۔

”ارے نیل آؤ۔“ اسے مڑا دیکھ کر سعدیہ جلدی سے بولی۔

”وہ میں حمزہ کو لینے آیا تھا۔“

”ہاں لے جاؤ۔“ سعدیہ نے حمزہ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور اس دوران وہ مسلسل سر جھکائے اپنے پیروں کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ نہ اس نے نیل کو سلام کیا تھا اور نہ نیل نے اسے مخاطب کیا۔ زبردستی جگائے جانے پر حمزہ گلا پھاڑ کر روئے لگا تھا۔ نیل نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا تھا۔ بیٹھو نیل! میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

”نہیں بھابھی!“

”مجھے رمشا کے لیے بھی چائے بنانی ہے تمہارے لیے بھی بنا دوں گی۔ تم ابھی آئے ہو نا۔“

کہہ کر سعدیہ باہر نکل گئی اور کمرے میں وہ دونوں رہ گئے۔ مسلسل خاموشی پر اس نے نظریں اٹھا کر نیل کو دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ رمشا نے اپنی نظریں اس پر سے ہٹا کر دوبارہ اپنے پاؤں پر ٹکا دیں۔ کتنے ہی



پل خاموشی سے گزر گئے اسے اب الجھن ہونے لگی تھی۔

”یہ کچھ کہتا کیوں نہیں۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔ اسی وقت سعدیہ ٹرائی دھیلے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

”ارے تم دونوں اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہو؟“ سعدیہ کے مسکرا کے پوچھنے پر بھی ان دونوں کے زایوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”نیل! تمہیں ایک زحمت دینی تھی۔“

”جی! وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”مجھے اور رمشا کو شاپنگ پر جانا ہے اگر تم ہمیں ڈراپ کرو۔“

”شاپنگ!“

”وہ منگنی کی شاپنگ کرنی ہے ناں۔“

”منگنی؟“ اس نے دوہرانے کے ساتھ ایک غصیلی نظر رمشا پر ڈالی۔ ”بہت مبارک ہو۔“ اس کے طنزیہ انداز پر رمشا نے بڑی خاموش نظر اس پر ڈالی تھی۔

”ارے رمشا کی نہیں منمو کی منگنی کی۔“

”اور وہ جو ان کے لیے پڑپوزل آیا ہوا تھا۔“ وہ پتا نہیں کیا جانا چاہتا تھا۔

”ہاں وہ۔ رمشا نے منع کر دیا۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے اس سے یہی پوچھ رہی تھی۔ یہاں تم شادی سے منع کر دیتے ہو وہاں رمشا منع کر دیتی ہے عجیب ہو تم دونوں۔“

سعدیہ کے معنی خیز بات پر ان دونوں کی نظریں بیک وقت ایک دوسرے کی طرف اٹھیں ان دونوں کو کچھ کہنا نہیں پڑا تھا۔ آنکھوں نے جیسے سب واضح کر دیا تھا۔ سعدیہ نے بغور دونوں کی شکلیں دیکھی تھیں۔

”نیل! تم فریش ہو جاؤ پھر چلتے ہیں۔ میں حمزہ کو امی کو دے آئی ہوں۔“

وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تو رمشا بھی کھڑی ہو گئی۔

”تم نے اس پر پوزل کو منع کیوں کیا؟“ وہ رمشا کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر پوچھ رہا تھا جبکہ ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔

”میری مرضی۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی کیونکہ اس کی جتنی ہوئی مسکراہٹ سے وہ اچھی خاصی کنفیوز ہو گئی تھی۔

”رمشا!“ وہ اس کی سائڈ سے ہوتی ہوئی باہر جانے لگی تھی جب اس کی آواز برک گئی۔

”میں امی اور بھابھی کو بھیجوں گا۔ مجھے یقین ہے اب تم انکار نہیں کرو گی۔“

”آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں انکار نہیں کروں گی۔“

اب کے وہ کھل کر مسکرایا۔ ”اس کا جواب تم اپنے آپ سے پوچھنا۔“

اس نے دھیرے سے کہا اور باہر نکل گیا۔ رمشا کھل کر مسکرا دی۔ نیل کے ایک اظہار محبت نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف اس سے محبت کرتا ہے بلکہ عزت بھی کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس کی عزت کروا بھی سکتا ہے۔ نیل پر کسی اور کو فوقیت دینا بڑی بے وقوفی ہوتی۔ آج سعدیہ کے گھر جا کر اس کی تھوڑی بہت کشمکش بھی ختم ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

”رخسانہ۔“

”کیا ہو گیا ہے۔“ وسیم کے تیسری دفعہ پکارنے پر وہ جھنجھلائی ہوئی اندر آئی تھی۔

”کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔ زوار کا فون ہے۔“ اور فون کی طرف بڑھتے اس کے قدم رک سے گئے تھے۔

”ارے بھئی پکڑو! اتنی دور سے کال کر رہا ہے۔“ رخسانہ نے بڑے مرے مرے انداز میں فون تھاٹا۔

”ہیلو سربراہیسی ہو۔“

”ٹھیک ہوں تم سناؤ۔“

”میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کچھ دنوں تک آ رہا ہوں سوچا۔ تم سے پوچھ لوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

اس کے انکار پر۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”پہلی دفعہ تم نے شکی سے خیریتناؤ وہ کیسی ہے۔“

”کون۔“ رخسانہ نے دزدیدہ نظروں سے وسیم کو دیکھا جو ڈائری پر جھکا پتا نہیں کون سے حساب کتاب میں مصروف تھا۔

”ارے تمہاری منڈ اور اپنی ہونے والی بیوی کا پوچھ رہا ہوں۔“ جو اب وہ جھکتے ہوئے انداز میں بولا۔ مگر اس کے ساٹھ سے جواب پر وہ قدرے غصے سے بولا۔

”تم نے ابھی گھر میں بات نہیں کی؟“

”نہیں۔“

”کیوں۔“ اب کے اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا غصہ تھا۔

”کر لوں گی۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”ٹھیک ہے جلدی کرنا کیونکہ میں اس کے لیے ڈائننگ رینگ لی ہے اور اس کو پہنانے کے لیے بے چین ہوں۔“

رخسانہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اس کی خاموشی کو پتا نہیں وہ کیا سمجھا نہیں کر بولا۔

”جیلس مت ہو تمہارے لیے بھی سیٹ لیا ہے۔“ آخر میری بہن کی وجہ سے مجھے اتنی بڑی خوشی ملنے والی ہے۔ اگر تم وسیم سے شادی نہ کر لیں تو مجھے میری محبت مجھے کیسے ملتی۔“ آخر میں وہ قہقہہ لگا کر بولا تو رخسانہ کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

”اوکے رکھتا ہوں۔ اللہ حافظ۔“

شکر تھا اس نے خود ہی فون بند کر دیا ورنہ اس کی اتنی خوشی محسوس کر کے رخسانہ کو آنے والے وقت سے خوف آ رہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک موبائل ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھی رہی۔

”کیا ہوا ایسے کیوں بیٹھی ہو۔“ وسیم کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا کہا زوار نے۔“ وسیم کے پوچھنے پر اس نے اسی گم صم انداز میں سرنفی میں ہلا کر اناس سے سوال کر دیا۔

”آپ کیا کر رہے ہیں۔“ رخسانہ نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ڈائری کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”حساب لگا رہا ہوں منمو کی منگنی میں ہونے والے خرچے کا۔ اتنا ہی رمشا کا بھی ہو گا۔ صرف منگنی پر لاکھوں کا خرچ آ رہا ہے۔ سوچ رہا ہوں شادی پہ کیا بنے گا۔“

وہ پریشانی سے بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا بولا۔ تب ہی رخسانہ کے دماغ میں خیال آیا۔ ”غیروں میں شادیاں کریں گے تو تاک اور پی رکھنے کے لیے لاکھوں تو خرچ کرنے ہی پڑیں گے۔ اسی لیے تو اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ دو جوڑے پکڑوں میں بھی خوشی خوشی اپنانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ اس کے چہرے پر واقعی نا سمجھنے والی کیفیت تھی۔

”اس میں نہ سمجھنے والی کیا بات ہے۔ اگر ہم منمو کی شادی زوار سے کر دیتے ہیں تو خرچہ ہی نہیں ہو گا۔ آپ کو تو پتا ہے زوار کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دل کا بھی کتنا سخی ہے اور پھر آپ کا دیکھا بھلا بھی ہے۔“

وسیم کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت دیکھ کر مزید بولی۔

”اور یہ میری بھی خواہش ہے اور زوار کی بھی۔ ہمیں منمو بہت پسند ہے میں تو آپ سے آئی سے بات کرنے والی تھی، لیکن آپ لوگ چھپ چھپا کر سب طے کر آئے مجھے بتایا بھی نہیں۔“

وہ نروٹھے انداز میں بولی تو وسیم پر سوچ انداز میں ڈائری کے صفحے پلٹنے لگا۔

”اب ایسے خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ جواب دیں مجھے۔“

”رخسانہ! تم نے مجھے عجیب مصیبت میں ڈال دیا ہے۔“

”کیوں اس میں مصیبت کیا ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے میرے بھائی پر۔“ اب کے رخسانہ ماتھے پر ہل ڈال کر غصے سے بولی وسیم گڑبڑا گیا۔

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مجھے تو زوار پسند ہے۔ بلکہ اچھا ہی ہو گا اگر ایسا ہو جائے، لیکن بات امی



کی ہے اسی کو وہ لوگ پسند ہیں اور تقریباً بات بھی طے ہو چکی ہے۔

”صرف بات ہوئی ہے، منگنی نہیں ہوئی اور اگر منگنی بھی ہوئی ہو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ لوگوں کی منگنیاں ٹوٹی نہیں کیا اور جہاں تک آئی کی بات ہے اگر آپ آئی سے کہیں گے تو وہ ضرور مان جائیں گی۔“ اب کے و سیم کچھ نہیں بولا تھا۔

\*\*\*

ریسور رکھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ لیکن جوں ہی اس نے آنکھیں کھولیں اسے جھٹکا لگا تھا۔ بالکل سانسے رخسانہ بھابی کھڑی مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کس کا فون تھا۔“  
”وہ رائگ نمبر تھا۔“ ہاتھ مسلتے نمرو بمشکل بولی تو رخسانہ کے چہرے پر بڑی طنز مہک اٹھی تھی۔  
”یہ کیا رائگ نمبر تھا جس سے تم پچھلے پندرہ منٹ سے بات کر رہی تھیں۔“ نمرونے ٹھوک نکل کر سر جھکا دیا۔ کوئی ہمانہ نہیں سو جاتا تھا۔ وہ ان کی چھٹی ہوئی نظروں سے بچنے کے لیے تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر پہلے معین سے بات کرتے ہوئے وہ جس سرشاری میں مبتلا تھی وہ یکدم غائب ہو گئی تھی۔ اب بس حواسوں پر رخسانہ بھابی کی آہار ہوتی نظریں سوار تھیں۔

\*\*\*

وسیم پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ الماری سے کپڑے نکالتی رخسانہ کو دیکھ رہا تھا۔  
”یہ تم کیا کر رہی ہو۔“ رخسانہ نے ایک غصیلی نظر وسیم پر ڈالی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔  
وسیم نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کپڑے چھین لیے تھے۔

”میں پوچھ رہا ہوں کیا کر رہی ہو تم۔“  
”پینک کر رہی ہوں۔“  
”رخسانہ پلیز! مجھے اس کو شش کر دو۔ اتنی سی بات پر

کوئی ناراض ہو کر جاتا ہے۔“ رخسانہ نے غصے سے وسیم کو دیکھا۔

”اتنی سی بات۔ اتنی سی بات نہیں ہے۔ میرے بھائی کے پروپونل کو رنجھٹ کر دیا ہے آپ نے۔ یہ میرے بھائی کی نہیں میری بھی بے عزتی ہے۔“  
”اسی نے انکار نہیں کیا۔ نمرو کی مرضی نہیں تھی دراصل۔“ اور کپڑے بیگ میں رکھتا رخسانہ کا ہاتھ رک گیا۔

”اوسے مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ آپ کی بہن کی مرضی نہیں ہوگی۔ یہ رشتہ جس طرح آیا تھا مجھے تو تب ہی شک ہوا تھا۔ یوں ہی کوئی سڑک پر ملنے کے بعد منہ اٹھا کر رشتہ نہیں لے آتا میں نے خود اپنے گناہ گار کانوں سے آپ کی بہن کو فون پر روئیں کرتے سنا ہے۔ یہاں آپ کی والدہ نے کوئی ٹیکسچر نہیں دیا ہوگا۔ جب آپ نے مجھ سے شادی کی تھی رخسانہ اور آئی نے کتنی باتیں سنائی تھیں۔ اب انہیں نظر نہیں آ رہا کہ ان کی بیٹی کیا لگ کر رہی ہے۔“  
”رخسانہ! وسیم غصے سے بولا۔

”چلائیں مت“ آپ سے زیادہ اونچی آواز میں بات کر سکتی ہوں۔“ اس نے بیگ کی زپ بند کی اور بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ باہر نکلی تو زائدہ دروازے کے قریب ہی کھڑی تھیں۔  
”بیٹا! یوں ناراض ہو کر کوئی اپنا گھر چھوڑ کر جاتا ہے۔“

”یہ میرا گھر نہیں ہے اور کبھی اس گھر کے لوگوں نے مجھے اپنا سمجھا بھی نہیں۔“  
”ایسا نہیں رخسانہ! میں نے کبھی تمہیں رخسانہ اور آئی کے نمرو سے الگ نہیں سمجھا۔“  
”اگر ایسا ہوتا آئی تو آپ کبھی زوار کے رشتے سے انکار نہ کرتیں۔ کیا برائی ہے اس میں؟ یہی کہ وہ میرا بھائی ہے؟“

”نہیں بیٹا! زائدہ نے پیار سے اس کا بازو تھاما۔  
”تو پھر انکار کی وجہ۔“ اب کے زائدہ نے بے بسی سے وسیم کو دیکھا جو نظریں چرا گیا تھا تو کب سے

خاموشی سے سختی رخسانہ زائدہ کے پہلو میں آکر کھڑی ہو گئی۔

”بھابی! یہ رشتے دل کی آمادگی سے طے ہوتے ہیں زوار زوار سے نہیں۔ اگر ہم نمرو کا رشتہ معین سے طے کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم زوار کو برا کہہ رہے ہیں۔“  
”تم لوگ کیا سمجھتے ہو مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں اور جس کی دلی آمادگی سے یہ رشتہ ہو رہا ہے وہ بھی مجھے پتا ہے۔“

رخسانہ نے ایک طنز نظر پوچھنے کے دروازے کے قریب کھڑی نمرو پر ڈالی اور بیگ کھینچتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

\*\*\*

وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو رخسانہ ریٹو ہاتھ میں لپیٹی وی کی طرف متوجہ تھی۔  
”تم کب آئیں۔“

”مجھے تھوڑی دیر پہلے تم سو رہے تھے۔“  
”سب ٹھیک ہے؟“

”ہوں۔“ رخسانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔  
”ہاں! سب ٹھیک ہے۔“  
”چھ! مگر یہ بیگ؟“ اس نے بیگ کی طرف اشارہ کر کے رخسانہ کو دیکھا۔

”میرا ہے۔ رہنے آئی ہوں۔“ اب کے زوار پوری طرح اس کی طرف مہموم گیا۔  
”تمہاری وسیم سے کوئی لڑائی ہوئی ہے؟“  
”میں نے تمہارا پروپونل دیا تھا۔ انہوں نے منع کر دیا۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔  
”وسیم نے منع کیا ہے؟“ زوار کے پوچھنے پر اس نے سر نفی میں ہلایا۔

”نہیں۔ نمرونے مجھے کسی نے بتایا کہ اس کا پروپونل آیا ہے۔ وسیم اور آئی جا کر پسند بھی کر آئے ہیں۔ جب وسیم نے مجھے بتایا تو میں نے تمہارا ذکر کیا۔ انہوں نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن نمرونے۔“

اتنا کہہ کر وہ رک گئی۔ وہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ یہ جو رشتہ ہو رہا ہے نمرو پہلے سے اس لڑکے کو جانتی ہے اور اس لڑکے کی پسند پر یہ رشتہ آیا ہے۔ فون پر باتیں ہوتی ہیں اور تم اس کی معصومیت پر فدا تھے۔“  
رخسانہ نے طنزیہ نظر زوار کے سیاہ پڑتے چہرے پر ڈالی اور پھر اس کے چہرے کے تاثرات پر اسے خود ہی اپنے طنزیہ لہجے کا احساس ہوا تو اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

”زوار پلیز! تم اپنا دل برانہ کرو، میں تو پہلے بھی اس حق میں نہیں تھی۔ تم ہی قربان ہوئے جا رہے تھے اس کی معصومیت پر۔ دیکھو اس کی معصومیت خود ہی اپنے لیے لڑکا بھی پسند کر لیا۔ خیر دفع کر دو۔ میں اس سے زیادہ اچھی اور خوب صورت لڑکی سے تمہاری شادی کرواؤں گی۔“  
لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پچھلی دفعہ کی طرح غصہ کیا۔ بس خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔

\*\*\*

”رخسانہ! یہ دیکھو کیا ہے۔“ نمرونے ریک سے کاپی رنگ کا کام والا فراک نکال کر اسے دکھایا۔  
”زبردست۔“ رخسانہ کو وہ پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔  
”نیل بھائی کو بھی دکھا دو۔ اگر انہیں پسند آتا ہے تو فائل کر دو اور خدا کا واسطہ ہے اب کچھ لے لو۔ چھ گھنٹے سے خوار ہو رہے ہیں اور تمہیں ایک سوڈا بھی پسند نہیں آیا۔“

”میرا نکاح ہے کوئی مذاق نہیں۔“ رخسانہ مسکرا کر اس کا پھولا ہوا چہرہ دیکھا۔  
”سنو! میں نے بھی ابھی شاپنگ بھی کرنی ہے اور دو سرائے مجھے بھوک بھی لگی ہے۔“  
”اچھا بابا تم کر لو ابھی شاپنگ اور کر کے یہاں آ جانا“ پھر کچھ کھاتے ہیں اوسے۔“ وہ سہلا کر دوسرے سیکشن میں آگئی۔ وہ ریک میں لٹکے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔



رائل بلو شیٹون کے فراق پر اس کا ہاتھ ٹھہر گیا تھا۔

”یہ رنگ تم پر سوٹ کرے گا۔“ وہ بہت غور سے فراق دیکھ رہی تھی۔ جب اپنے پیچھے آتی آواز پر اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور زوار کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی حیرت پر وہ چل کر مسکرایا۔

”یہی ہو۔“ نمونے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور مڑ کر سوٹ دوبارہ پینگ کر دیا۔

”کیوں سوٹ پسند نہیں آیا۔ چلو کوئی بات نہیں تم پر تو سب ہی رنگ اچھے لیتے ہیں۔“

”یہ دیکھو۔“ اس نے ربیک سے ایک گلابی سوٹ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ نمونے ایک نظر سوٹ پر ڈال کر قدم آگے کی طرف بڑھا دیے۔ لیکن اگلے قدم پر اسے روکنا پڑا۔ اس کا بازو زوار کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی جرات پر وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی جو غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“

”ہاتھ چھوڑیں میرا۔“ اس نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا مگر وہ مزید اس کے قریب آ گیا تو اس نے ہراساں ہو کر ارد گرد کی کوند کے لیے تلاش کیا، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

”ڈر کیوں رہی ہو تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا۔“ اور جب تک تم میری بات سن نہیں لیتیں تم یہاں سے نہیں جا سکتیں۔

نمونہ جو اس سے بازو چھڑوانے کے لیے زور لگا رہی تھی، رک گئی۔ کیونکہ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ واقعی اسے جانے نہیں دے گا۔

اپنی بے بسی پر اس کی آنکھ میں آنسو آگے تھے۔ ”گلد! تمہاری یہی بات مجھے اچھی لگتی ہے۔“ اس کے ساکت ہو جانے پر وہ مسکرا کر بولا۔

”سنا ہے مجھ سے شادی کرنے سے تم نے انکار کیا ہے۔“ وہ کم پر زور دے کر بولا تو نمونہ جو سر جھکائے اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ زندہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ نہ جانے سب لوگ کہاں چلے گئے

تھے۔

اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا لمس اسے بری طرح چھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بے چین ہو کر اپنا بازو کھینچا۔

”ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔“ وہ اس کے بازو پر اپنے ہاتھ کا بایا بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مگر تم نے اس وجہ سے انکار کیا ہے کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتے۔ پھر ٹھیک ہے تمہاری ناپسندیدگی بھی سر آنکھوں پر۔ میرے لیے میری پسندیدگی کافی ہے۔ چونکہ تم ایک مشقی لڑی ہو تو شادی کے بعد خود بخود مجھے پسند کرنے لگو گی ہے نا۔“ وہ تھوڑا سا جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”مجھے جانا ہے۔“ وہ رو ہانسی ہو کر بولی۔ ”بات سنو نمونہ! وہ ایک دم اتنی خنجریدگی سے بولا کہ وہ سب بھولی کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”میں تمہیں اب سے نہیں تب سے پسند کرتا ہوں جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ کہا اس لیے نہیں کہ میں تمہیں پرار طریقے سے اپنا جانتا تھا۔ وہ سب کچھ جو تمہارے لیے سوچتا ہوں وہ شادی کے بعد بتانا چاہتا تھا۔ مجھے جو بھی اچھا لگتا ہے میں اسے حاصل کر لیتا ہوں۔ میں چاہتا تو تمہیں بھی حاصل کر سکتا تھا لیکن تمہیں پانا چاہتا تھا تمہاری مرضی سے۔ اتنا انتظار میں نے صرف تمہاری محبت پانے کے لیے کیا اور تم نے کیا کیا۔“

اب کے اس نے اس کا بازو چھوڑ کر اسے کندھوں سے تھام لیا۔

”تم اگر اس وجہ سے انکار کرتیں کہ تمہیں میں اچھا نہیں لگتا تو مجھے بالکل برا نہیں لگتا لیکن تم نے کسی اور کو مجھ پر ترجیح دی۔ تمہیں کوئی اور اچھا لگتا ہے، یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ یہ جو تمہارا چہرہ ہے نا۔“ اس نے ایک ہاتھ سے اس کی تھوڑی پکڑی۔

”اس سے میں بہت محبت کرتا ہوں۔ اگر اس چہرے کو دیکھنے کا حق کسی اور کو دوں گی تو یہ میری برداشت

سے باہر ہوگا۔

زوار نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تھا لیکن وہ تو جیسے مجبور ہو کر رہ گئی تھی۔ زوار نے ایک گہری نظر اس کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالی۔

”میں کبھی بھی تم سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے مجبور کر دیا۔“

وہ ایک دم اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی سانسیں اسے اپنے ماتھے پر محسوس ہونے لگیں لیکن ڈرنے اس کے حواس اس طرح سلب کر لیے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی۔ اس نے اس کے بازو کو حرکت میں آتے دیکھ اور پھر پیچھے ربیک میں لگاؤ گلابی سوٹ اس کے سامنے تھا۔

”پھلو۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر بولا اور وہ کسی رپورٹ کی طرح اس کے پیچھے چل پڑی۔

”تھینکس فار یور کو آپریشن۔“ باہر نکلتے ہی اس نے سیلز میں سے کہا اور ہزار کا نوٹ اسے تھمایا۔ نمونہ نے چونک کر پہلے زوار کو اور پھر اس سیلز میں کود دیکھا۔ اسے اب سمجھ میں آئی تھی کہ اتنی بڑی شاپ ہونے کے باوجود کوئی کیوں وہاں نہیں آیا تھا۔ اس نے آنکھ میں آنے والے آنسو کو روکنے کے لیے نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے دبایا۔

”میرا میرے لائق کوئی اور خدمت۔“ وہ ہزار کا نوٹ تھامے زوار سے پوچھ رہا تھا۔

”بس یہ سوٹ پیک کروا دیں۔“ اس نے گلابی سوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

”نمونہ۔“ پیچھے سے رمشا کی آواز پر وہ دونوں تیزی سے مڑے تھے۔

”کہاں تھیں تم؟ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہو گئے ہم لوگ۔“ وہ واقعی اتنی پریشان تھی کہ اسے نمونہ کے ساتھ کھڑا زوار نظر نہیں آیا تھا اور کب سے ضبط کرتی نمونہ کا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔ وہ رمشا کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ پریشان رمشا حیران بھی ہو گئی تھی۔

”نمونہ کیا ہوا ہے۔“ وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے

بولی۔ تب ہی اس کی نظر زوار پر پڑی۔

”اسلام علیکم۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں، میرا خیال ہے نمونہ کا بی بی لو ہو گیا ہے۔ میں شاپنگ کرنے آیا تھا۔ یہاں سے گزرا تو نمونہ پر نظر پڑی۔ میں ابھی حال احوال پوچھ رہا تھا کہ تم آگئیں۔“ اتنے بڑے جھوٹ پر نمونے روتے روتے ناراض نظر اس پر ڈالی تو وہ نیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اور بھی نیل! بہت مبارک ہو، عنقریب شادی شدہ ہونے والے ہو اور خوش قسمت ہو کہ جسے چاہا اسے پایا۔“ اس کی بات پر نیل بے ساختہ مسکرا دیا اور رمشا بھی مسکرا دی تھی۔ جبکہ رمشا کے ساتھ گلی نمونے ہونٹ بھیج لیے۔

”مجھے لگتا ہے واقعی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ نیل نے اس کا سر خنجر پڑا چہرہ دیکھ کر کہا۔

”گہری بھی تو بہت ہے۔ رمشانے بھی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اتفاق کیا۔

”چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں۔“ ”نہیں زوار! تھنک یو۔“ نیل ہمیں ڈراپ کروں گے۔“ رمشا کے کہنے پر وہ کندھے اچکا کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔

”مہیلہ۔“ وہ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب قریب سے آواز سن کر رک گئے۔ معین کو دیکھ کر کہیں وہ سب حیران ہوئے تھے، وہیں نمونہ کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

”کیسی ہیں آپ۔“ اس نے رمشا سے پوچھنے کے بعد نمونہ کو دیکھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں آئی کیسی ہیں۔“ ”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آپسے۔“ وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا۔ زوار کو دیکھ کر چونک کر خاموش ہو گیا۔ ان تینوں نے اس کا چونٹا نوٹ کیا تھا۔ رمشانے مڑ کر زوار کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

”آپ دونوں جانتے ہیں ایک دوسرے کو؟“ ”بہت اچھی طرح۔“ رمشا کے پوچھنے پر زوار زور



دے کر بولا۔

”او کے امیں چلنا ہوں۔“ معینہ ایک دم بوکھلا کر مزید بات کے بغیر مڑ گیا۔  
”یہ کون تھا؟“ نبیل نے کچھ حیرت سے اس کی بوکھا ہند دیکھی۔

”یہ معینہ تھا۔ بتایا تھا نا آپ کو نمروہ کے لیے اس کا پروپوزل آیا ہوا ہے۔“ اب گئے زوار نے چونک کر رمشا کو دیکھا اور اس کے بعد نمروہ کو جو اسی طرف دیکھ رہی تھی، جہاں سے معینہ گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔

\*\*\*

وہ بیڈ رچٹ لیٹی کب سے چھت پر چلتے پٹھے کو گھور رہی تھی۔ دوسرے مناظر پوری جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

اسے وہ نہ کرانی بیڈی پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیوں اس کے سامنے کمزور پڑی تھی۔ کیا ضرورت تھی اسے اس کی بکواس سننے کی اور پھر اس کی دھمکی۔ اس نے بے اختیار اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ تب ہی اس کے تکیے کے نیچے رکھا موبائل بج اٹھا تھا۔ اس نے بڑی بے زاری سے موبائل نکال کر نمبر دیکھا مگر نمبر دیکھ کر اس کی بے زاری ہوا ہو گئی۔

”سیلو کیسی ہو۔“ دوسری طرف سے اس نے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

”ٹھیک ہوں۔“

”اچھا تمہاری آواز سے تو نہیں لگ رہا اور دوسرے ہر کو چپ مال میں ملا تھا تو تب بھی تم مجھے ٹھیک نہیں لگی تھیں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

”آپ وہاں سے اتنی جلدی چلے کیوں گے تھے۔“ یاد آنے پر اس نے شکوہ کیا۔

”تو کیا کرتا؟ تم پوری فوج کے ساتھ باہر نکلی تھیں۔ میں تو سمجھا تھا اکیلی آؤ گی۔ تھوڑی دیر ساتھ بیٹھیں گے۔ کچھ دل کی باتیں تمہیں سناؤں گا۔ لیکن۔۔۔“

اس کے افسوس۔۔۔ بے انداز پر نمروہ کو بھی افسوس ہوا۔  
”اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ وہ تمہارے ساتھ آدی کون تھا۔“ اس کا ذکر کرتے ہوئے نمروہ کا حلق تنک کڑوا ہو گیا۔

”وہ بھابھی کے بھائی ہیں۔“

”ہوں صرف بھابھی کے بھائی یا کچھ اور بھی۔“ نمروہ کو اس کا لہجہ عجیب لگا۔

”آپ دونوں کو دیکھ کر تو لگا تھا آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“

”ہاں جانتے تو ہیں بہت اچھی طرح۔“

”اچھا، وہ کیسے؟“

”یہ چھوڑو، بس یہ فیض مجھے بہت برا لگتا ہے۔“ اور نمروہ نے پوری طرح اس سے اتفاق کیا۔

”وہ ہے ہی اس قاتل کہ اس کو برا سمجھا جائے۔“  
”کیوں۔۔۔“ اب کہ معینہ کی آواز میں جھنجھٹ تھا۔

نمروہ نے گہری سانس لی۔

”دراصل ان کا پروپوزل آیا تھا میرے لیے اور بھائی چاہتے ہیں کہ میں ان سے شادی کر لوں۔“

”تو کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“  
”بالکل نہیں۔۔۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔ ”وہ۔۔۔ وہ شخص سخت ناپسند ہے مجھے۔“

”اور میں۔۔۔؟“ اب کہ دوسری طرف سے مسکرا کر پوچھا گیا تھا۔ نمروہ کوئی جواب دیے بغیر مسکرا دی۔

”مجھ سے شادی کرو گی نا؟“

”جی۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے اب اس بات پر قائم رہنا اور کیسے بھی حالات ہوں تم نے پیچھے نہیں ہٹنا، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”کیسے بھی حالات؟“ اس نے پریشانی سے دوہرایا۔  
”ہاں امیں نے ابھی تمہیں بتایا نا میں زوار کو جانتا ہوں۔ وہ میرا بہت بڑا دشمن ہے اور مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔“

”تو اس کی ضرورت نہیں۔“ میں پچھان گیا ہوں اور

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

خلاف کرنے کے لیے غلط باتیں کرے۔ لیکن تم اس کا یقین مت کرنا۔ تمہیں مجھ پر یقین ہے نا نمروہ۔“  
”جی۔۔۔“ اس کے پوچھنے پر وہ اٹھتے ہوئے انداز میں بولی۔

”میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو تمہیں مجھ سے کورٹ میرج کرنی ہوگی۔“ نمروہ کے سر پر دھماکا ہوا تھا۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“

”نہ ہی آئے تو اچھا ہے، لیکن اگر ایسا ہوا تو تم میرا ساتھ دو گی نا؟“ اس نے بمشکل اثبات میں جواب دیا۔

”آئی کیو۔“

اس کی بھاری آواز پر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ الجھ گئی تھی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے تیزی سے سیل فون تکیے کے نیچے رکھا اور گروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ وہ اس وقت کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

\*\*\*

رخسانہ جب اندر داخل ہوئی تو وہ بے چینی سے سارے کمرے میں چکر لگاتا پھرتا تھا۔

”زوار۔۔۔“ اس نے چونک کر رخسانہ کو دیکھا۔ ”تم سوئے نہیں ابھی۔“

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر پھر چکر لگانے لگا۔  
رخسانہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جو کافی پریشان لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ مزید کچھ پوچھتی اس کا موبائل بج اٹھا۔

”یہ نمبر کتنے ہے؟“ وہ دوسری طرف سے پوچھ رہا تھا۔ ”اوکے تھیں نکس۔۔۔“

اس نے فون بند کر کے جلدی سے دوسرا نمبر ملایا۔  
اب وہ فون کلن سے لگائے شاید دوسری طرف سے فون اٹھائے جانے کا انتظار کر رہا تھا جبکہ رخسانہ مسلسل ابھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”زوار بات کر رہا ہوں۔“ اس کے تعارف کروانے پر دوسری طرف سے قہقہہ سنائی دیا تھا۔

”بتانے کی ضرورت نہیں۔“ میں پچھان گیا ہوں اور

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

تمہارے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا۔“ اس کے جتنا تے ہوئے انداز پر زوار کے ہونٹ جھنجھک گئے تھے۔  
”بو لویوں فون کیا ہے۔“  
”نمروہ سے دور رہو۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا تو معینہ ہنس پڑا۔

”کیوں؟“  
”اس سے تمہیں مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ طنز پر انداز میں بولا۔

”تمہیں جتنی تکلیف ہو رہی ہے معلوم ہوتا ہے بات کچھ اور ہی ہے۔ بڑی حیرت ہو رہی ہے زوار شاہ کو محبت ہو گئی اور وہ بھی ایسی لڑکی سے جو زوار سے محبت نہیں کرتی، بلکہ زوار شاہ کے سب سے بڑے دشمن سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”نکو اس بند کر دینی۔“ وہ ایک دم چیخ اٹھا۔  
”اور چیخو زوار شاہ بڑا سکون مل رہا ہے تمہاری چیخ سن کر۔“

”میں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں، نمروہ سے دور رہو۔ ورنہ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تمہیں اپنی زندگی سے نفرت ہو جائے گی۔“

”پہلے تم ہی میرے ساتھ بہت برا کر چکے ہو، لیکن اب میری باری ہے، مجھے ہیٹ اس لئے کا انتظار رہا ہے کہ تمہیں تڑپے دیکھوں۔“ وہ لہجہ اب آگیا۔ میں تمہاری محبوبہ کا وہ حشر کروں گا کہ وہ اپنی زندگی سے نفرت کرنے لگے گی۔“ اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔

”اسے اس طرح اپنے جال میں پھنسا دیا ہے کہ اس کا نکلا مشکل ہے۔ بچا سکتے ہو تو بچا لو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”تم باز نہیں آؤ گے۔“ زوار نے کافی سنجیدگی سے پوچھا۔

”مجھے کیوں کہہ رہے ہو، نمروہ کو وہ مجھ سے شادی سے انکار کر دے۔“ معینہ نے جیسے اس کی بے بسی کا مذاق اڑایا۔

”چہ چہ زوار شاہ! ایک لڑکی نے تمہیں میرے

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔



سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔“

اس سے زیادہ اس میں ضبط نہیں تھا۔ اس نے فون آف کر کے بیڈ پر پھینک دیا۔ رخسانہ جو خاموشی سے ٹیلی فون پر ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ کافی حد تک سمجھ گئی تھی۔ ”یہ وہی معین ہے؟“ رخسانہ کے پوچھنے پر اس کے سر اثبات میں ہلایا۔

”یہ جیل سے باہر کب آیا؟“

”پتا نہیں۔“ وہ پریشانی سے بالوں میں ہاتھ چلا تا ہوا بولا۔

”نمرہ کو روکنا ہوگا۔“ وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بولا۔ رخسانہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

”جب وہ خود کنوئیں میں چھلانگ لگانا چاہتی ہے تو تم کیوں اسے بچانا چاہتے ہو۔ ٹھوکر کھائے گی تو اسے اندازہ ہوگا میرے بھائی کو ٹھکرا کر اس نے کیا کھویا ہے۔“ زوار نے غصے سے اسے دیکھا۔

”رخسانہ! بے حس کی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ صرف وسیم کی بہن نہیں میری محبت بھی ہے۔ میری محبت یعنی میری عزت۔“

رخسانہ قدرے شرمندہ ہو کر بولی۔ ”تو تم کیا کرنے والے ہو۔“

”معین کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کافی حد تک نمرہ کا برین واش کر چکا ہے۔ سو اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وسیم کو یا آئی کو معین کی حقیقت بتانی ہوگی۔ اس نے رخسانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔“ اور تم کل تیار رہنا، میں تمہیں چھوڑنے تمہارے گھر جاؤں گا۔“

رخسانہ نے گہرا سانس لے کر سر ہلایا۔ وہ خود بھی اب اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان سب کے چروں پر ناقابل یقین تاثرات تھے۔ وسیم نے پریشانی سے اپنی پیشانی کو مسلا تھا۔ جبکہ رمشا کے ذہن میں کل کا منظر ایک دم واضح ہوا تھا۔ جب زوار کو دیکھ کر معین بوکھلا کر بھاگا تھا۔ سب سے زیادہ

بری حالت زاہدہ کی تھی۔

”یا میرے مولا! اتنا بڑا دھوکا۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ ”کوئی اس طرح بھی دھوکا دیتا ہے۔ یوں بیٹیوں کی عزتوں سے ہلکتے ہیں اور اگر میں اپنی بیٹی ان لوگوں کو دے دیتی تو۔“ وہ اس تصور سے ہی کانٹا اٹھیں بلکہ وہاں موجود سب لوگ۔

لیکن زوار نے وہ قدسیہ آئی وہاں ہو کر اس گھٹاؤ نے کام میں اس کا ساتھ دیتی ہیں۔“ رمشا کے سوال پر زوار طنز پر انداز میں مسکرایا تھا۔

”وہ اس کی ماں نہیں ہے، بلکہ جرم کے اس کھیل میں اس کی پارنر ہے۔ وہ پہلے بھی اس طرح کی لڑکیوں کی زندگیاں برباد کر چکے ہیں۔“ کمرے میں محسوس کی جانے والی خاموشی چھائی تھی۔

”میں نے آپ کو یہ سب اس لیے بتایا ہے کہ آپ نمرہ کو سمجھائیں کیونکہ مجھے نہیں لگتا وہ میری بات پر یقین کرے گی۔ اور اس کے فیوچر کو سیکور کرنے کے لیے ضروری ہے آپ جلد از جلد اس کی شادی کر دیں۔“

اس کی تجویز پر وہ تینوں جیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ ”بیٹا! اتنی جلدی کیسے کوئی اچھا رشتہ ملے گا۔“

زاہدہ پریشانی سے زوار سے پوچھ رہی تھیں۔ ”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو اور اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے تو میں آج ہی نمرہ سے نکاح کرنے پر تیار ہوں۔“ ان تینوں نے چونک کر زوار کا چہرہ دیکھا۔

☆ ☆ ☆

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھنک کر رہ گئی۔ سارا کمرہ ابراہیم تھا۔

”نمرہ۔“ وہ چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی جو ڈرنے لگ کر نیل پر رکھی چیزیں پھینکنے لگی تھی۔ ”کیا کر رہی ہو ناگل ہو گئی ہو۔“

”ہاں ناگل ہو گئی ہوں۔“ رمشانے حیرت سے اس کے بکھرے بالوں اور سوچی ہوئی لال آنکھوں کو دیکھا۔ ”کس سے پوچھ کر زوار کے ساتھ میرا نکاح ملے کیا

ہے۔“

”مجھے سخت نفرت ہے اس آدمی سے۔ کیا مجھے اتنا بھی اختیار نہیں کہ میں اپنی پسند کے شخص کے ساتھ شادی کر سکوں۔ وسیم بھائی نے اپنی پسند کی شادی کی۔ اے نے کچھ نہیں کہا۔ تم نے بھی اسی کی پسند کے لڑکے کو رہجھٹ کر کے نیل بھائی کو پسند کیا۔ وہاں بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔ پھر میری دفعہ کیوں؟“ وہ اب روتے ہوئے گھٹنوں کے بل قالیقین پر بیٹھ گئی تھی۔

”ہم نے تمہاری پسند کو ترجیح دی تھی لیکن شاید تم نے سنا نہیں زوار نے کیا بتایا ہے معین کے بارے میں۔ وہ ایک کریمبل ہے۔ جیل کاٹ کر آچکا ہے۔ اسمگلر ہے۔ لڑکیوں کو اسمگل کرتا ہے اور تم سے محبت کے لیے شادی نہیں کر رہا۔ تمہیں بیچنے کے لیے یہ شادی کا ڈھونگ کر رہا ہے۔“

رمشانے ساری موت بھلا کر اسے تلخ حقیقت سنا دی۔ لیکن اس وقت اس کی عقل پر پردہ پڑ چکا تھا۔

”جھوٹ بولتا ہے۔ وہ صرف مجھے حاصل کرنے کے لیے اور تم لوگوں کو معین کے خلاف کرنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ جو اس نے کہا تم لوگوں نے مان لیا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ معین کے بارے میں اسے اتنی انفارمیشن کیسے ہے؟“

وہ اب سوالیہ نظروں سے رمشا کو دیکھ رہی تھی۔

”اسے کچھ پتا ہے تو وہ یہ سب کہہ رہا ہے نا۔ ورنہ اسے کیا فائدہ ہے۔“ نمرہ روتے ہوئے طنز پر انداز میں مسکرا دی تھی۔

”فائدہ اسی کا ہے۔ معین کا دشمن ہے وہ اور اگر تم لوگ میری شادی معین سے نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے مگر زوار سے بھی نہیں کرو۔“ رمشا ہونٹ جھپٹے اس کا ضدی انداز دیکھنے لگی۔

”تم ایسی تو نہیں تھیں۔“ اس نے اب قدرے افسوس سے کہا۔ ”زوار صرف تمہیں بچانے کے لیے اتنی جلدی نکال کر رہا ہے۔“

”ہو نہ ہو۔“ وہ زہر خندہ انداز میں بولی۔ ”اس کی

شرافت بھی دیکھ چکی ہوں۔ کان کھول کر سن لو! میں معین سے ہی شادی کروں گی۔“ وہ ایک بار پھر قطعی انداز میں بولی تو رمشا غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”اگر تمہاری عقل پر پردہ پڑ چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ باقی سب بھی اندھے ہو چکے ہیں۔ کل شام کو تمہارا نکاح زوار کے ساتھ ہے۔ اب چاہے تم رو کر رو یا نہیں کہ یہ تمہاری مرضی ہے۔“ رمشا کہہ کر باہر نکل گئی۔ جبکہ وہ پیچھے چیختی رہی اور آخر میں تھک کر رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

اس نے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے۔ اس نے بند دیا تے ہوئے فون ریسیو کیا تو سسکی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

”نمرہ بات کر رہی ہوں۔“

”پتا ہے بولو۔“ اس کے روکے لمحے پر دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

”آپ نے اتنا بڑا جھوٹ بول کر جو کیم کھیلایا ہے۔ میں اس میں آپ کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ معین مجھے پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آپ ان سے بدلہ لینے کے لیے ان پر ایسے ہی کدے الزامات لگائیں گے اور آپ نے ویسا ہی کیا۔“

”اور معین صاحب نے یہ نہیں بتایا تمہیں کہ میں کس بات کا بدلہ لے رہا ہوں اس سے۔ کیا دہشتی ہے میری اس سے۔“ ایک پل کے لیے وہ کوئی جواب ہی نہ دے سکی پھر تیزی سے بولی۔

”کیونکہ آپ ایک برے انسان ہیں اور میں آپ کو جتنا برا سمجھتی تھی، آپ اس سے بھی زیادہ برے لگتے ہیں اور یہ یاد رکھیں اب میں بھی آپ سے شادی نہیں کروں گی، بے شک آپ مجھ پر تیزاب پھینک دیں۔“

”اور کچھ؟“ اس کی ساری تقریر کے جواب میں



جب وہ یہ بولا تو نمبر ہی طرح چڑ کر رہ گئی۔  
 ”میں سچ کہہ رہی ہوں، میں آپ سے شادی نہیں  
 کروں گی۔“ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔“ ساتھ ہی  
 فون بند ہو گیا۔  
 زوار بھی فون آف کر کے دوبارہ لیٹ گیا لیکن اب  
 نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

\*\*\*

”کیا بات ہے بڑے خوش لگ رہے ہو۔“ قدسیہ  
 بیگم نے چائے پیتے ہوئے بغور مسکراتے ہوئے معین  
 کو دیکھا۔  
 ”بات ہی خوشی کی ہے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا چچہ  
 گھماتے ہوئے بولا۔

”زوار شاہیاد ہے آپ کو۔“

”اس کو کیسے بھول سکتی ہوں۔“ وہ زہر خندہ انداز  
 میں بولیں۔ ”کیوں اب کیا ہوا ہے۔“  
 ”میں بھی تو کچھ نہیں ہوا، بہت کچھ ہونے والا ہے۔  
 میں ہمیشہ اس وقت کے انتظار میں رہا جب اس سے  
 بدلہ لے سکوں۔ لیکن اب تک اس کی کوئی کمزوری  
 میری ہاتھ نہیں آسکی۔ لیکن اب میں اس سے ایسا  
 بدلہ لوں گا کہ ساری عمر یاد کرے گا۔“

وہ بڑی دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ ”زوار  
 شاہ کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔“

”تو؟“ قدسیہ بیگم نے بھونپ اچکا کر پوچھا۔  
 ”تو یہ کہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ نمبر ہے۔“

قدسیہ کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔ ”اور تم خوش  
 ہو رہے ہو، جانتے ہو نا زوار کو پہلے بھی وہ ہمیں کافی  
 نقصان پہنچا چکا ہے اور اب اگر اس نے تمہاری  
 حقیقت نمبر کو بتا دی تو جاں میں پھنسی چڑا اڑ جائے  
 گی۔“ وہ تہقیر لگا کر ہنس پڑا۔

”زوار یہ کوشش کر چکا ہے، بلکہ شام کو نکاح بھی  
 کر رہا ہے نمبر سے۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے جسے میں  
 اپنی محبت کا جھانسا دوں اور وہ آسانی سے اس سے نکل  
 سکے آج تک تو ایسا ہوا نہیں۔“

”مطلب؟“ قدسیہ بیگم نا سنجی سے اس کے  
 چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھنے لگیں۔  
 ”میں نمبر کا فون آیا تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور  
 سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“  
 ”پھر؟“ قدسیہ بیگم دلچسپی سے بولیں۔

”پھر یہ کہ اب میں اسے لینے جا رہا ہوں۔ میں  
 سوچ رہا تھا کیسے اسے یہاں ملاؤں اور اب وہ خود ہی  
 آ رہی ہے یہاں ہونے کے لیے تو میں یہ موقع کھو کر زوار  
 کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔ آپ شیخ صاحب کو فون  
 کر دیں کہ ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں۔“  
 وہ ٹیبل سے چائیاں اٹھا کر سینی بجاتا ہوا باہر کی  
 طرف بڑھ گیا۔

\*\*\*

اس نے شیشے سے جھانک کر دیکھا، سیم جاچکا تھا۔  
 اس نے کچھ لمحے بر سوچ نظروں سے پار کر کے  
 دروازے کو دیکھا اور گھر اس لے کر موبائل سے  
 معین کا نمبر ڈائل کر دیا۔ چند منٹ بعد وہ اس کے  
 سامنے تھا گھر سے جب وہ نکلی تھی تو اسے کوئی ڈیریا  
 خوف نہیں تھا لیکن جوں جوں گاڑی آگے بڑھ رہی  
 تھی اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا ایک احساس  
 ندامت تھا جو مسلسل بچو کے لگا رہا تھا۔  
 ”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

معین کے پوچھنے پر اس نے پریشانی کو انگلی سے دلیا  
 تھا۔

”میں پوچھ رہا تھا زوار نے کیا کیا تمہارے بارے  
 میں۔“

”یہی کہ آپ مجرم ہیں۔ لڑکیاں اسمگل کرتے ہیں اور  
 سب جیسے اس کی بات پر ایمان لے آئے لیکن میں نے  
 یقین نہیں کیا۔“ کہنے کے ساتھ اس نے داؤد طلب  
 نظروں سے معین کو دیکھا، جس کے ہونٹوں پر  
 مسکراہٹ اٹھ گئی تھی۔ نمبر نے نا سنجی سے اس کی  
 مسکراہٹ کو دیکھا۔ کار رکتے ہی اس نے حیرت سے  
 اطراف پر نظر ڈالی۔

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

## عمران ڈائجسٹ

جولائی 2012ء کے شمارے کی جھلک

تین سلسلے دار تحریروں

اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا  
 احوال ملے گا وہیں محبت کی لازوال داستان  
 بھی نظر آئے گی۔ معروف مصنف اسلم راہی کے قلم سے

وہ دیوتاؤں اور دیویوں جیسے حسن کی مالک  
 تھی..... اس کو ناجائز کون کون سی شکستیاں  
 حاصل تھیں..... غزالہ علیل راؤ کی تہلکہ خیز سلسلہ دار تحریروں

سرزمین پنجاب کی حسین وادی جہلم کا ایک  
 سادہ لوح جوان جو دشمن کے لیے ناقابل  
 تسخیر ”فولاد بن گیا۔ ایم اے راحت کے قلم سے

اس کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ”برائے انصاف“ ایم  
 الیاس کی ”زخمی شیرینی“ صفدر شاہین کی ”ہولناک ایڈوچر“  
 محمد مقصود خان کی ”حب الحکم“ حسن علی خان کی ”ہم  
 ذوق“ وقار بن سعید کی ”آمد و شد“ دانش کمال کی ”تشنہ  
 جان“ محمد صدیق طاہر کی ”مریض کا قتل“ صابر علی ہاشمی کی  
 ”بیکار مباح“ اردو ادب سے انتخاب میں شوکت صدیقی  
 کی ”خان بہادر“ ابراہیم جلیس کی ”کالے چور کے نام“  
 رام لعل کی ”پہلا آدمی“ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی  
 ”پاگل نہ ہو جاؤں“ نواز شاہین کی ”داغ دار“ محمد سلیم  
 اختر کی ”شاہو“ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کے قلم  
 سے معاشرتی ناول ”زرگزشت“

آج ہی قریبی بکسٹال سے تازہ شمارہ حاصل کر لیں



کہ اس کا سارا وجود ہرف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ صرف آنکھیں دیکھ اور کلن سن رہے تھے۔ باقی سارا جسم مفلوج ہو گیا تھا۔

”آج سے پانچ سال پہلے میں ایک لڑکی کو اسی سلسلے میں دینی لے کر جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیسے اس لڑکی کو میری حقیقت پتا چل گئی تھی۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا، وہیں زوار بھی ٹھہرا تھا۔ پتا نہیں کیسے اس لڑکی کی زوار سے ملاقات ہوئی اور اس نے نہ صرف اس لڑکی کو بچا لیا بلکہ مجھے جیل بھی بھجوا دیا۔ اس کی وجہ سے مجھے جو لاکھوں کا نقصان ہوا سو ہوا۔ لیکن جو وقت میں نے جیل میں گزارا وہ میں نہیں بھول سکتا اور جب مجھے پتا چلا زوار تم سے محبت کرتا ہے تو میں پتا نہیں سکتا، مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ آج جب وہ نکاح کے لیے جائے گا اور تم نہیں ہوگی تو کیسے اس کی عزت کی وہ جیاں اڑیں گی۔ کاش! میں اس وقت اس کا چہرہ دیکھ سکتا۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”تمہیں بچانے کی اس نے بہت کوشش کی۔ مجھے دھمکیوں بھرے فون کیے۔ لیکن افسوس وہ ہار گیا۔“ وہ افسوس کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”پہلے میرا ارادہ صرف تمہارا سودا کرنے کا تھا لیکن اب میں زوار کی عزت کو اپنے ہاتھوں سے پامال کرنا چاہتا ہوں۔“

نمرو نے اس وقت پوری شدت سے اپنے مرنے کی دعا کی تھی۔ اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔

”یا اللہ! اگر میں نے زندگی میں ایک نیکی کی ہے تو اس کے صدقے میری عزت کی حفاظت فرما۔“

”آنکھیں بند کر لینے سے بد قسمتی راستہ نہیں پڑتی۔“ اس نے اپنے بہت قریب اس کی آواز سنی تھی۔ تب ہی باہر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ معین بد مزاج ہو کر پیچھے ہٹا تھا۔

”یہ شیخ اپنی جلدی کیسے ٹپک پڑا۔“ وہ جھنجھٹا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے پوری شدت سے اللہ سے مدد مانگ رہی تھی۔ باہر ایک دم بے تحاشا شور اٹھا تھا۔ بھانگے قدموں کی آواز

قریب سے آنے لگی تھی۔

”نمرو! قریب سے آتی جاتی پہچانی آواز اسے اب وہم لگی تھی۔

”نمرو! اب کسی نے اس کا چہرہ تھپتھپایا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے کھولیں لیکن چہرہ نہیں بدلا تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں پانی اٹھنا ہوتا شروع ہو گیا تھی کہ وہ چہرہ دھندلا سا گیا۔

”نمرو! اس نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ ایک دم اس کے سینے سے لگ کر چپ چاپ رہی تھی۔ وہ کافی دیر بونہی چینی رہی، پھر اس کی چیخیں آنسوؤں میں اور آنسو سسکیوں میں بدل گئے۔ اتنی دیر زوار بونہی ساکت اس کو ساتھ لگائے کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ نمرو نے خود ہی سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”سب ٹھیک ہے اب آؤ۔“ وہ آگے بڑھا تو نمرو نے اس کی شرٹ مضبوطی سے تھام لی۔

زوار نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ بری طرح ڈری ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ باہر پولیس کی گاڑیاں تھیں۔

”ماجد! زوار کی آواز پر پولیس وردی میں ملبوس آوی ہو ایس ایس پی تھا۔ ان کے قریب آیا۔

”زوار! اہم فکر مت کرو، بھابھی کو لے کر جاؤ ہمیں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا۔“ بھابھی۔ کہنے پر نمرو نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ماجد! اب کی بار یہ چھوٹا نہیں چلا ہے۔ لوگوں کی عزتوں سے کھلنے والے یہ لوگ معاشرے کا نامور ہوتے ہیں۔ انہیں جتنی جلدی ختم کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“

زوار نے غصے سے اس طرف دیکھا، جہاں معین پولیس کے نرغے میں بیٹھا تھا۔

”ختم بھی پکڑا گیا اور معین کی وہ آنٹی بھی۔“ مجھے لگتا ہے اس گروہ میں اور لوگ بھی ہیں۔ لیکن خیر میں دیکھ لوں گا تم بے فکر رہو اور بھابھی! آپ کو بھی گھبرانے کی

ضرورت نہیں۔“ زوار نے اسے پتا نہیں کیا بتایا تھا جو وہ اسے بھابھی کہہ رہا تھا۔ وہ اسے لیے گاڑی میں بیٹھ گیا اور پچ چا پ ڈرائیو کرنے لگا۔ نمرو نے بے چینی سے دو تین بار اس کی طرف دیکھا۔ وہ چاہتی تھی وہ اس سے کچھ پوچھے، اسے ڈانٹے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔

”گھر میں کافی مہمان ہیں اور کسی کو کچھ پتا نہیں۔“ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کہا تو نمرو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میرا مطلب ہے کہ کسی کو کچھ کہنے اور پتانے کی ضرورت نہیں۔“

نمرو کتنی دیر اسے دھندلی نظروں سے دیکھتی رہی۔

”تم تو پار گئی تھیں؟“ زمشائے حیرت سے اس کے ساتھ چلے کو دیکھا تو وہ گڑبڑا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”راستے میں ہنگامہ ہو گیا تھا پار لڑکے کچھ شے بھی توڑ دیے ان لوگوں نے اسی لیے تو دیر ہو گئی۔“ شکر کرو جان بچ گئی۔“ پیچھے سے زوار نے آکر اس کی مشکل آسان کی۔

”اور اپنی بہن کو صرف اچھے کپڑے پہنا دو۔ یہ سادگی میں ہی مجھے اچھی لگتی ہے۔“

زمشائے بڑی تھی جبکہ نمرو ایک بار پھر زوار کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نکاح نامے پر سائن کرتے ہی وہ اس بری طرح روئی تھی کہ سب پریشان ہو گئے تھے لیکن اس قدر ٹوٹ کر رونے کے پیچھے کیا وجہ تھی، صرف دو لوگ جانتے تھے۔ ایک وہ خود اور

دوسرا زوار۔

زادہ کب سے اسے دیکھ رہی تھیں جو پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل ایک ہی زادے میں بیٹھی تھی جبکہ سامنے کھلے رسالے کا صفحہ تک نہیں پلٹا تھا۔

”نمرو! ان کی آواز پر بھی اس میں جنبش نہیں ہوئی تو وہ گھبرا کر اس کے قریب آ گئیں۔

”جی امی! اس نے چونک کر انہیں دیکھا تو انہیں

جھٹکا لگا سوہ روری تھی اور شاید اسے احساس بھی نہیں تھا۔

”کیا بات ہے میرے بچے! کیا ہوا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پریشانی سے بولیں تو نمرو ایک دم ان کے گلے لگ گئی۔

”امی پلیز! مجھے معاف کر دیں مجھ سے غلطی ہو گئی بہت بڑی غلطی ہو گئی۔“ اس کا یوں رونا اور کسی غلطی کا اعتراف۔ زادہ کامل انجانے خدشے پر تیز دھڑکنے لگا۔

”کیسی غلطی نمرو!“

”امی! آپ وعدہ کریں آپ مجھے معاف کر دیں گی۔“ وہ بونہی ان کے ساتھ لگے ہوئے بولی۔

”نمرو! میرا دل بند ہو جائے گا۔ جلدی بول۔“ پھر اس نے اگلے اگلے انہیں سب بتا دیا۔ اس کی پشت سلانا ان کا ہاتھ بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے خود سے الگ کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔

”یہ غلطی نہیں گناہ ہے نمرو! جو تم کرنے جا رہی تھیں۔ میں تمہیں جس دلدل میں گرنے سے بچانا چاہتی تھی تم اسی میں چھلانگ لگا رہی تھیں۔ اگر زوار وہاں نہ پہنچتا تو تم نے سوچا ہے کیا ہوتا تمہارے ساتھ۔“ انہوں نے کہنے کے ساتھ اسے جھنجھوڑا لیا تھا۔

”نہ تم کسی قابل رہتیں اور نہ ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل چھوڑیں۔“ انہوں نے جھٹکے سے اسے چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

وہ اب دونوں ہاتھوں میں سر دیے پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔

”زوار نے منع کیا تھا مجھے۔“ وہ روتے ہوئے بولی تو زادہ نے افسوس سے اس کا مچھایا ہوا چہرہ دیکھا۔

”تم نے کوئی نیکی کی ہے جو تمہیں زوار جیسا شوہر ملا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہاری اتنی غلط حرکت کے بعد تمہیں اپنا ناتواور زمانے بھر میں رسوا کر دیتا مگر

اس نے نہ صرف تمہاری عزت بچائی بلکہ تمہیں اپنا



ہام دیا بلکہ تمہیں تمہارے بھائی بہنوں اور دنیا کی نظروں میں بھی گرنے سے بچالیا۔“  
نمو کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ کیونکہ زوار کی محبت اور اس کی اعلا غلی کی تو وہ کب کی قائل ہو چکی تھی۔  
”پی پلینز! مجھے معاف کر دیں ورنہ میں اس بوجھ تلے مر جاؤں گی۔“ وہ ایک بار پھر گڑ گڑائی۔  
”میں مل ہوں تمہاری نمود! تمہاری سوغلیاں معاف کر سکتی ہوں لیکن اب تمہیں معافی زوار سے مانگنی ہوگی۔ اس نے تمہیں معاف کر دیا تو سمجھو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں تھیں جبکہ وہ برستی نظروں سے کتنی دیر بند دروازے کو دیکھتی رہی۔

\*\*\*

”بھابھی! زوار نہیں آئے گا؟“ ریشا نے بچن میں داخل ہوئی رخسانہ سے پوچھا تو نمو کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کب سے اس کا نمبر لڑائی کر رہی ہوں غون ریشو نہیں کہا۔ مہیج کیا ہے دیکھو! آتا ہے یا نہیں۔“  
سلاد نے تاتے نمو کے ہاتھ ست پڑ گئے تھے ان کے نکاح کو ایک مہینہ ہو گیا تھا اور چند دن اس کی اور ریشا کی شادی تھی۔ شادی کی ساری تیاریاں رخسانہ کر رہی تھی اور جو یہ شادی کرنے کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا وہ منظر سے ہی غائب ہو گیا تھا۔

”تمہیں کیا ہوا، روکیوں رہی ہو۔“ ریشا کے حیرت سے پوچھنے پر رخسانہ چونک کر اسے دیکھا۔

”میں وہ باز کاٹ رہی تھی نا۔“ اس نے جلدی سے باز آگے کھینچی پھر ایک دم سب چھوڑ کر جلدی سے بچن سے نکل گئی۔ کافی دیر بعد دوبارہ بچن میں آکر اپنا چھوڑا ہوا کام کرنے لگی تو رخسانہ نے کہا۔

”نمو پلینز! یہ کام بعد میں کرنا پہلے یہ جوس زوار کو دے آؤ۔ میرے کمرے میں بیٹھا ہے۔“ اور نمو کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا۔“ اس سے یوں ساکت کھڑے دیکھ کر رخسانہ نے زرب لب مسکراتے ہوئے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے گلاس تمام لیا۔ باہر آئی تو زوار لاؤنج میں موجود تھیں۔  
وہ نظریں چرائی کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ کمرے کی طرف بڑھتے اس کے قدم ست جبکہ دل کی دھڑکن بے حد تیز تھی۔

ایک وقت تھا، جب اسے اس کے سامنے جانے سے انجمن ہوتی تھی اور اب تو آنکھوں کو کب سے اس کا انتظار تھا۔

وہ دستک دے کر اندر آگئی وہ آرام کرسی پر آگے پیچھے جھولتے لی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر چونک نمو نے سلام کرنے کے بعد گلاس اس کی طرف بڑھالیا۔

”تھینکس۔“ وہ گلاس تمام کر لیا۔ وہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی جو اسے نظر انداز کر کے پوری توجہ سے لی وی اسکرین کو گھور رہا تھا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ پوری ہمت جمع کر کے اس نے یہ فقرہ ادا کیا تھا۔

”ہاں۔“ آگے سے جواب اس کی توقع کے برعکس تھا۔ وہ ایک دم آنکھوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھ دیے۔

”مجھے معاف کر دیں پلینز! مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ ساتھ ہی اس نے رونا بھی شروع کر دیا۔ اس رد عمل کے لیے زوار تیار نہیں تھا وہ بوکھلا گیا۔

”نمو پلینز۔“

”پلینز! آپ مجھے معاف کر دیں۔“

”چھاپا بایا! اٹھو تو میں نے معاف کیا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میں ایسے نہیں، صحیح طریقے سے معاف کریں۔“ زوار کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”یہ صحیح طریقہ کون سا ہوتا ہے۔“ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بس سر جھکائے روتی رہی تو زوار نے جھک کر اس پیشانی چوم لی۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”اٹھو۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”بٹھو۔“ اس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی ٹانگوں پر بٹھالیا۔  
”اب بولو۔“ وہ مسکرا کر اس کا بھیگ ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔

”میں نے آپ سے اتنی بد تمیزی کی، برا بھلا کہا۔ آپ نے ایک دفعہ بھی مجھے کچھ نہیں کہا۔ اتنا بوجھ ہے میرے دل پر۔“ اس کی آواز پھر بھر گئی۔

”میں اتنی غلط حرکت کرنے جا رہی تھی، مجھے ڈانٹتے، پھٹ مارتے، کچھ تو کہتے۔ اگر اس دن آپ نہ آتے تو۔“

کہتے ہوئے اس کے آنسوؤں میں رونا ہی آگئی۔ زوار نے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔

”کیسے نہ آتا میری جان! بوجھ تو قوی تم نے کی تھی اس کی توقع تھی مجھے تم سے۔ جب رات کو تم نے مجھے فون کر کے کہا تم بھاگ جاؤ گی تب ہی مجھے شک ہو گیا تھا۔ ساری رات نہیں سویا۔ تم اگر دھیان دیتیں تو تمہیں اندازہ ہوتا، کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہے۔ جب وسیم تمہیں پار لے چھوڑ کر گیا تھا، میں وہیں تھا اور جب تم معین کی گاڑی میں بیٹھیں تب بھی میں وہیں تھا۔“

نمو بے ساختہ بول اٹھی تھی۔  
”جب آپ سب جانتے تھے تو مجھے روکا کیوں نہیں مجھے جانے کیوں دیا اس گھٹیا آدمی کے ساتھ۔“  
”میں چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا لیکن میں نے خود نہیں کیا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا تم خود اپنی آنکھوں سے اس کا اصلی چہرہ دیکھو۔ کیونکہ جب تک تم خود نہ دیکھ لیتیں تم نے میرا تو یقین کرنا نہیں تھا۔ اور نہ تمہیں میری محبت کا اندازہ ہوتا۔“

نمو شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔  
”خیر چھوڑو، جو بھی ہوتا ہے مجھے کے لیے ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو کیا تم مجھ سے نکاح کے لیے مانس؟“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کی ناک دبا لی تو وہ شرمناک مسکرا دی۔

”اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تھے تو پھر آپ اتنے دنوں سے آئے کیوں نہیں اور فون بھی نہیں کیا۔“

”کیوں تم انتظار کر رہی تھیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھا کہ سر ہلایا۔ وہ بے تحاشا خوش ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی خوشی کا عملی مظاہرہ کرتا وہ پھرتی سے اٹھ کر کھانگی۔

”کھانا جا رہی ہو؟“  
”معافی مانگنے آئی تھی۔“ انک لی، اب جا رہی ہوں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسنے ہوئے بولی۔  
”کتنی دیر بھاگتی، تھوڑے دنوں کی بات ہے۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تو وہ ہنسی دبا لی ہوئی باہر نکل آئی۔

اس کے انتظار میں بیٹھی زائدہ نے چونک کر اسے دیکھا، چہاں سے وہ مسکراتی ہوئی اپنے دھیان میں آ رہی تھی۔ اس کو یوں طمانیت سے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی کھل کر مسکرا دیں۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میرے ندیم

ریشہ جمیل

نکاح کا پتہ

نکتہ - 275 / روپے

کتاب نمبر 32735021





”یہ کیا کپڑوں کا جعبہ بازار لگا کر بیٹھی ہو؟“ اپانے سنیعہ کو الماری سے دھڑا دھڑا کپڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرتے ہوئے دیکھا تو ٹوکے بغیر نہ رہ سکیں۔

”کپڑوں کی چھائی کر رہی ہوں، جو کپڑے پہننے کے نہیں ہیں، انہیں نکال کے رکھ دوں گی۔ عارف فلا جی اوارے میں دے آئیں گے۔ میں تو اکثر اپنے عارف کے اور بچوں کے کپڑے، جو تھے وغیرہ وہیں بھجواتی ہوں۔“

سنیعہ نے اپنے ریشمی کام دار جوڑے ایک ایک کر کے تہہ کرنے شروع کر دیے اور سوئی لمبوسات ایک طرف رکھنے لگی۔ مختلف تقاریب میں بنائے گئے کئی ریشمی جوڑے اب آؤٹ آف فیشن ہو چکے تھے اور گھر میں وہ پہنے نہیں جاسکتے تھے۔ سوئی لمبوسات وہ نکالے تھے جو بی بارہن کر اور دھل دھل کر اپنی آب و تاب کھو چکے تھے۔ یہی حال عارف اور بچوں کے کپڑوں کا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سب سمیٹ کر بڑے بڑے شاپر ز تیار کر کے ایک طرف رکھ دیے۔

”سارے ہی نکال دیے تم نے؟“ اپانے شاپر ز کو بغور دیکھا۔

”نہیں! ابھی بھی باقی ہیں کچھ کپڑے۔ اب اگلے سال دیکھوں گی۔ ابھی تو دو تین بار پہننے کے قابل ہیں یہ سب تو اس لیے نکال دیے کہ عون کی شادی پر سب کے سنے سنے جوڑے پیش گئے۔ وہ بھی کم از کم تین تین تو نہیں گئے ہی، اتنے کپڑے رکھنے کی جگہ نہیں ہے الماری میں، اسی لیے پہلے کا کچرا نکال دیا۔ اب نئے کپڑوں کی جگہ بن گئی۔“ سنیعہ آرام سے بیڈ

پر بیٹھ گئی۔

”بڑا خرچہ کر رہے ہیں بھائی صاحب، عون کی شادی پر۔“ اپانے بھرو کیا۔

”ظاہر ہے! پہلی شادی ہے، پھر بیٹے کی ہے، خرچہ تو ٹھیک ٹھاک کریں گے ہی۔“ سنیعہ کے لہجے میں خود بخود تفاخر ابھر آیا۔

”ہاں بھی وہ کر سکتے ہیں یوں کھلا خرچ، آخر کو سرکاری افسر گھر ہے، ہم جیسے تھوڑی ہیں کہ دانٹوں

سے پکڑ پکڑ کر ایک ایک بانی خرچ کرتے ہیں، پھر بھی مہینے کے آخر میں ادھار کا منہ دیکھنا پڑ جاتا ہے۔“ اپانے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”چھوڑیں نا اپنا! یہ بتائیں شادی پہ کیسے کپڑے بنائیں گی؟ میں نے تو ابھی سے اپنے کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائنز سوچ لیے ہیں۔ جیسا سوچا ہے، ویسے ہی لاؤں گی، چاہے کتنے ہی تمکے پڑیں۔“ سنیعہ کے لہجے میں بڑا جوش و خروش تھا۔

”دیکھو! جیسی گنجائش ہوگی، ویسے ہی تیاری کر لیں گے۔ اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے پڑتے ہیں۔“ اپانے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی بہت ہی غریب خاندان کے گھر سے تعلق رکھتی تھیں یا شوہر کی آمدنی بہت کم تھی۔ اچھی خاصی ٹھیک ٹھاک آمدنی تھی۔ بس یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنا موازنہ اپنے شادی شدہ بہن بھائیوں سے کرتی تھیں، جو ان کی نسبت زیادہ خوش حال تھے۔ لہذا یہ موازنہ انہیں ہر وقت پیسے کی تنگی کے گلے شکوے میں ہی مصروف رکھتا تھا۔

عون کی شادی کی تاریخ کیا ٹھہری، سنیعہ کے پاؤں میں تو گویا پیسے لگ گئے، بازاروں کے چکر اور شاپنگ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہر شے اعلیٰ سے اعلیٰ بہتر سے بہتر بن۔ ہزاروں روپے اس نے ان تیاریوں میں پھونک ڈالے تھے اور یہی وجہ تھی کہ شادی کی ہر تقریب میں وہ اس کا شوہر اور بچے سب سے نمایاں اور الگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔

”بہت خوب صورت جوڑے بنوائے ہیں تم نے۔“ چولری کا بھی کوئی جواب نہیں۔ ”اس کی گزلن مہر تپا نے بے حد فراخ دلی سے دیکھ والے دن اس کی تعریف کی۔“

”تھینک یو تپا! سنیعہ فخر سے مسکرا دی۔

”اتنے منگے کپڑے بنا تو لو، پھر وہی ہو کہ آؤٹ آف فیشن ہو جائیں تو پہننے میں نہیں آتے، بس وارڈ روب بے کار میں بھرتی رہتی ہے۔“ ان کی ٹیبل پر بیٹھی ایک دوسری گزلن شازیہ نے بھرو کیا۔

”اب اگر یہ سوچ لیں تو کوئی بھی اپنی مرضی اور پسند کے کپڑے ہی نہ بنائے۔ کیا فائدہ دل کو مارنے کا۔ میں

تو جی جی بھر کے اپنے ارمان پورے کرتی ہوں۔ جب کپڑے آؤٹ آف فیشن ہو جائیں یا ہمارے پہننے کے قابل نہ رہیں تو اللہ نام پر نکال دیتی ہوں۔ غریبوں کے لیے تو وہ پھر بھی اچھی کنڈیشن میں ہی ہوتے ہیں۔ کوئی پنتا ہے تو ہمیں ثواب ہی ملتا ہے۔“ سنیعہ نے بغیر منہ ہٹائے شازیہ کے بھروسے کے جواب میں کہا۔

”ہاں! یہ تو ہے۔ میں بھی سال کے سال اپنے اور گھروالوں کے پرانے جوڑے نکال کر کسی نہ کسی کو دے دیتی ہوں۔ جب پہننے نہیں تو کیا فائدہ سنبھال سنبھال کر رکھنے کا۔ اللہ نام پہ کسی کو دے کر نیکی ہی کماؤ،“ مہر تپا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر کچھ دیر بعد ان کی گفتگو کا رخ دوبارہ اور دلن کے لمبوسات زیورات اور دوسری تیاریوں کی طرف مڑ گیا۔ بڑے جوش و خروش سے سب کے بھروسے جاری تھے۔

ولیمہ سے فارغ ہو کر رات کو سنیعہ بھائی کے گھر میں رگ گئی تھی۔ اگلے دو دن بچوں کے اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اتوار کی رات شوہر لینے آجاتے۔ ولیمہ کے اگلے دن دلن اپنے رواج کے مطابق





میکے چلی گئی۔ تھکے ہوئے میزبانوں اور مہمانوں سب کی منج دھیر میں ہوئی تھی۔ پیٹ پوچا سے فارغ ہو کر سب کے سب لاؤنج میں بیٹھے شادی پر تبصرے کر رہے تھے۔

”ارے ہاں سنیہہ! تمہارا اور اپنا کپڑاؤں کا جوڑا آیا رکھا ہے۔ یاد سے لے جانا۔ میں ابھی نکال دیتی ہوں۔“ بھابی کو اچانک کچھ یاد آیا تو وہ سنیہہ اور اپنا دونوں سے مخاطب ہوئیں۔

”اپنے بھی دکھائیے! ایسے جوڑے آئے ہیں؟“ سنیہہ پر جوش ہو گئی۔

”ہاں ہاں! سارے جوڑے منگوا رہی ہوں۔ آرام سے دیکھ لو۔“ بھابی مسکرائیں۔

جوڑوں کی پیکنگ کھلتا شروع ہوئی اور سب کے تبصرے بھی۔ بھیا اور بھابی کے سوٹ تو قیمتی تھے مگر سنیہہ کو ان کے رنگ پسند نہیں آئے۔

”کیسے عجیب عجیب کلر کے سوٹ دیے ہیں۔ کم سے کم گلر تو اچھے لینے چاہیے تھے۔ آخر خاص الخاص رشتہ ہے، سدر من اور سدر منی کا۔“ سنیہہ نے منہ بیتایا۔

باقی گھر والوں کے سوٹ بھی اسے بس عام سے ہی لگے۔ اپنا کا سوٹ تو بالکل گزرا لے لائق تھا۔ اس نے منہ پھاڑ کر اپنے خیالات با آواز بلند بیان بھی کر دیے۔ سب سے آخر میں اس کے جوڑے کی پیکنگ کھلی دیکھتے ہی وہ چیکی۔

”ہائے بھابی! یہ سوٹ تو میں نے دو سال پہلے عربیہ کی منگنی میں بنایا تھا۔ بالکل یہی کلر۔ یہی ڈیزائن۔ یاد ہے آپ کو؟“

”ہاں! کچھ دیکھا دیکھا تو لگ رہا ہے۔“ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بھابی نے غور سے جوڑا دیکھا۔

”ابھی ایک دو مہینے پہلے تو اس سوٹ کو میں نے اللہ

نام پر دیا ہے۔ اب کون پہن رہا ہے یہ کلر اور یہ ڈیزائن۔ لوگ بھی پتا نہیں کیسے دل کے ہوتے ہیں۔ بھئی! آپ اپنے سدر منیہ نے میں کوئی تحفہ دے رہے ہیں وہ بھی پستانوں۔ ذرا دل بڑا کر کے اچھا جوڑا دے دیں۔ آخر ہم بھی لڑکے کی پچھو ہیں۔ کوئی ایرے

غیرے تو نہیں ہیں۔ پستانوں میں کوئی ایسے جوڑے دیے جاتے ہیں کہ بس سر پر سے بوجھ اتار کر دوسرے کے منہ پر مار دیا۔“ سنیہہ کو اپنا جوڑا دیکھ کر شدید غصہ آ رہا تھا۔

”چھوڑو! ہر ایک کا دل اتنا بڑا نہیں ہو گا کہ جو اپنے لیے پسند کریں، دوسرے کے لیے بھی کریں دوسروں کو تو لوگ ایسے ہی ٹر خادیتے ہیں۔“ اپنا نے بھی جملے دل کے پچھو لے پھوڑے۔

”خود تو ہر تقریب میں پانچ پانچ ہزار کے جوڑے پہنے ہوئے تھیں۔ دینے کی باری آتی تو پتا نہیں کہاں سے ستے ستے، آؤٹ آف فیشن جوڑے خرید کر دے دیے۔ توبہ ہے! بہت ہی تجوس ہیں عون کے سرال والے۔“ سنیہہ کا پارہ کسی طور نیچے آنے پر راضی نہیں تھا۔

”چلو! اب غصہ تھوک دو۔ جو بھی آیا ہے اسے ہی لے جاؤ۔“ بھابی نے نرم اور مصالحت آمیز انداز میں اس کا پارہ نیچے کرنے کی کوشش کی۔

”میں کیا کروں گی اس کا؟ جب پہننا ہی نہیں ہے۔ اللہ نام یہ اپنی ماسی کو دے دوں گی۔ بے چاری خوش ہو جائے گی۔ ہمیں ثواب مل جائے گا۔“ سنیہہ کے تیوری کے بل کچھ کم ہونے لگے۔

”چلو بھئی! یعنی! پچھو کے لیے کچھ ٹھنڈا لے آؤ تاکہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو۔“ بھابی عادت، مزاج کی بہت اچھی تھیں، مسکراتے ہوئے بیٹی سے کہنے لگیں۔

”بھی لاتی ہوں۔“ یعنی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے جوڑے کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے، بہت کپڑے ہیں میرے پاس۔ بس یہ ہے کہ بندہ اتنے قریبی رشتے اور تعلق میں کسی کو کچھ دے تو ڈھنگ کا دے، ورنہ نہ دے۔“ سنیہہ نسبتاً نرم لہجے میں بولی۔

”چلو اچھوڑو ان باتوں کو۔ کوئی اور بات کرو۔“ بھابی نے موضوع بدلا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔



خواتین اور دھیر اؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

## خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2012 کے شمارے کی ایک جھلک



جولائی 2012

کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“

فرحت اشتیاق کا مکمل ناول،

ایک حساس اور چوڑا کاہنے والے موڑ پر،

”ایک رات کی بابت“ نایاب جیلانی

کا مکمل ناول،

”احساس زیاں جب ہوا“ مقدس مشعل

کا مکمل ناول،

مہوش کنول اور راحت جنیں کے ناولٹ،

سعدیہ حمید چودھری، نازیہ کنول نازی، نعیمہ ناز سلطان

اور کنیر نوبی کے افسانے،

FM-105 کی آر بے ”ہما کاشف“ سے باتیں،

معروف ٹی وی فنکار ”نعمان اعجاز“ سے ملاقات،

کران کران روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

اور دیگر دلچسپیاں،

خواتین ڈائجسٹ جولائی 2012 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔





سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں، حیا اور روئیل۔ روئیل بڑھائی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کو پورپی یونین نے اسکا لرشپ کے لیے منتخب کیا۔ اب وہ پانچ ماہ کے لیے ترکی جاری ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں بین پھپھو کے آٹھ سالہ بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ بین پھوپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں، مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تایا فرقان کے بیٹے داوڑ کی مندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں جبراحمد سے میٹنگ ہوتی ہے۔ حیا کے شکایت کرنے پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔

تایا فرقان، سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ولید والے دن حیا سے بے ہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈوٹی اس کی عزت بچاتا ہے۔ یہ خواجہ سرا حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتا رہتا ہے۔

حیا کے ساتھ اس کی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی بے ترکی جاری ہے۔ وہ دونوں بہت جدوجہد کر کے پاسپورٹ اور ویزا بنوائی ہیں۔ دونوں کی دوستی ہو جاتی ہے۔

اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شہر ملتے ہیں۔ ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ چغتائی اور امت انہیں ترکی میں ریسو کر لیتے ہیں۔ پھر ترک لڑکی ہالے ہاسٹل تک ان کی رہنمائی کرتی ہے۔





ترک روایت کے مطابق خدیجہ اور حیا کی سرزید اللہ اپنے کھردھرت کرتی ہیں جو حیا کو پاشا کے متعلق بتاتی ہیں۔ ہاں نے حیا کو جہان کے گھر لے جاتی ہے۔ جہان سکندر سردمرازی سے حیا سے ملتا ہے جبکہ سیمین چچھو محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو پھر سفید پھول ملے ہیں، جس پہ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان نے حیا سے بات کرتے ہوئے ماضی کی یادوں کو دہرایا تب حیا کو بتا چلا کہ جہان کو اس کا اور اپنا نکاح یاد ہے۔ جہان نے اسے بتایا کہ اس کا باپ ملک کا غدار ہے اور اسے اس پر شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حیا کو حسب معمول سفید پھول ملے تو اس کے دوست معصوم نے محسوس کیا کہ کاغذ کے کنارے پر لیوں کا رس لگا ہوا ہے۔ اس نے ماضی کی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچائی تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوا نظر آیا۔ حیا جہان سے ملنے گئی تو وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ اس نے حیا کو نظر انداز کر دیا۔ حیا ناراض ہو کر آگئی۔ جہان نے اسے منانے کے لیے ڈنر پر مدعو کیا۔

حیا نے جہان کے ساتھ مل کر جزیرہ بیوک ادا کی سیر کا پروگرام بنایا۔

وہ تین وہاں گئے تو حیا کو ایک بنگلہ پر "اے آر پاشا" لکھا نظر آیا۔

جزیرے سے واپس لانے والی آخری فیری جاری تھی۔ جہان اور ڈی جے اس میں سوار ہو گئے تو اسی وقت ایک بچہ حیا کا پرس چھپ کر بھاگا۔ حیا اس کے پیچھے گئی تو وہ اے آر پاشا کے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ حیا اندر گئی تو دروازہ مقفل ہو گیا اور کسی شخص نے اسے عقب سے خوش آمدید کہا۔

بنگلے میں حیا کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں عبدالرحمن پاشا نے حیا کو پہلا پار دی کھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ وہ سفید پھول بھیجے تھے۔ سحر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ سحر احمد کر تل لیلیا کا بیٹا ہے، جسے جہان کے ابا نے پھنسا دیا تھا۔ عبدالرحمن پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور عبدالرحمن سے قطعی شادی نہیں کر سکتی۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ پاشا آئندہ حیا کے راستے میں نہیں آئے گا۔ پاشا کی ماں حیا کا دلچسپ دے کر اسے جانے دیتی ہے۔ نایا فرقان کو ارم کے معاملے کی بھنگ بڑجاتی ہے۔

حیا عبدالرحمن پاشا سے فون پر بات کرتی ہے کہ جہان کی اس طرح مدد کر دے کہ اس کی ریسٹورنٹ کی مالکن اسے کچھ مہلت دے دے۔ پاشا مان جا تا ہے مگر کچھ ہی دیر بعد جہان کے ریسٹورنٹ پر توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت شرمندہ ہو جاتی ہے اور پچھتاتی ہے۔ ڈی جے کے سر میں درد اٹھتا ہے حیا اسے اسپتال لے کر جاتی ہے مگر اسپتال میں ڈی جے انتقال کر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ جہان اور حیا بھی پاکستان آجاتے ہیں۔

## 5 پانچویں قسط

مسکوحہ صورت کے اونچے درختوں کے درمیان ہوا سرسراہٹ ہوئی گزر رہی تھی۔ وہاں ہر سو گھٹا جنگل تھا۔ اونچے درختوں کے سچے سنہری دھوپ کو مٹی تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ دھوپ کے وقت بھی اوھر ٹھنڈی میٹھی سی چھایا تھی۔

ہمارے اسی چھایا میں اوھر اوھر بھاگتی بول کے سفید پھول تو توڑ کر ٹوکری میں، بھر رہی تھی۔ عانشی

کپڑے پہ ایک طرف اٹھلتے ہوئے اس نے پکارا۔ "ہوں" اس نے ایک ہاتھ سے دھاگے میں سرخ پھول پروتے، دوسرے ہاتھ سے سفید پھولوں کا ڈھیر بنے پھولوں سے ایک طرف سمیٹ دیا۔ "سفیرا! تم نے لڑکیوں رہا تھا؟" وہ خلی ٹوکری رکھ کر اس کے سامنے آتی پاتی مار کے یوں بیٹھ گئی کہ اب دونوں کے درمیان پھولوں والا کڑا بچھا تھا۔ "لو نہیں رہا تھا، اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"مگر وہ اونچا اونچا کیوں بول رہا تھا؟" ہمارے دونوں ہتھیلیوں پہ چہرہ کرائے ابھی ابھی سی پوچھ رہی تھی۔ گردن جھکا کر سوئی پھول میں ڈالتی عانشی نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"جب انسان دوسرے کی بات نہیں سمجھتا چاہتا تو وہ پوہنی اونچا اونچا بولتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا، وہ اس کے پیرس نے اس کی شادی اس کی پاکستانی کزن سے طے کر دی ہے اور وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" "کیوں نہیں کرنا چاہتا؟"

"اس کی مرضی نہیں ہوگی!" اس نے سوئی کو پھول کی دوسری طرف سے نکال کر کھینچا۔ دھاگا کھینچا چلا آیا۔ پھولوں کی لڑی لمبی ہوئی جاری تھی۔ "شادی مرضی سے ہوتی ہے نا؟"

"ہاں!" وہ اب ہمارے گے سفید پھولوں کو ہاتھ سے اوھر اوھر ٹھٹھل رہی تھی۔ "پھر جب میں بڑی ہوں گی تو میں عبدالرحمن سے شادی کروں گی۔"

پھولوں کو سمیٹتا اس کا ہاتھ رکا۔ اس نے ایک خلی بھری نگاہ ہمارے ڈالی۔ "ہری بات ہمارے گل! اچھی لڑکیاں یوں ہر بات نہیں کر لیتیں۔" "مگر میں نے عبدالرحمن کو کہہ دیا تھا۔"

وہ ایک دم ٹھٹھک کر رک گئی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"کیا کیا تم نے اے؟" "یہی کہ جب میں بڑی ہوں گی تو کیا وہ مجھ سے شادی کرے گا؟" "تو اس نے کیا کہا؟" "اس نے کہا، تمہیں ایسی بات کس نے سکھائی؟" "پھر؟" وہ سانس روکے سن رہی تھی۔ "میں نے کہا۔ عا۔ عانشی گل نے!" "روانی سے بولتی ہمارے ایک لخت انگلی۔" "کیا؟" وہ ششدر رہ گئی۔ "تم نے اس سے جھوٹ بولا؟" تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب تم جھوٹ نہیں بولو گی۔ خدایا! وہ کیا سوچتا ہو گا میرے بارے میں۔" اس نے تاف سے ماتھے کو چھوا۔ ہمارے نے لا پوائی سے شانے اڑکا۔ "مکراے پتا چل گیا تھا۔ اس نے کہا، عانشی گل اچھی لڑکی ہے اور مجھے پتا ہے، اس نے ایسا کچھ نہیں کہا ہو گا۔"

اس کی بات پہ عانشی کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک بے اختیار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ بکھر گئی۔ وہ ہولے سے سر جھٹک کر پھول اٹھانے لگی۔ "مگر تم نے جھوٹ نہیں چھوڑا نا۔"

"وعدہ اب نہیں بولوں گی۔"

"ہر دفعہ اللہ سے وعدہ کرتی ہو۔ وہ ہر دفعہ تمہیں ایک اور موقع دے دیتا ہے مگر تم پھر وعدہ توڑ دیتی ہو۔ اتنی دفعہ وعدہ توڑو گی تو وہ تمہارے وعدوں کا اعتبار کرنا چھوڑ دے گا۔"

"آئندہ میں سچ بولوں گی، اب کی بار مضبوط والا وعدہ۔" "چلو ٹھیک ہے۔" وہ مسکرا دی۔ "اب تم نے ہمیشہ سچ بولنا ہے، کیونکہ جب انسان بہت زیادہ جھوٹ بولتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے اس کے سچ کا بھی اعتبار نہیں رہتا۔"

پرنڈوں کا غول پھر پھڑپھڑاتا ہوا ان کے اوپر ت گزرا۔ عانشی نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ برندے یقیناً



پورے بیوک ادا کا چکر کاٹ گراب سمندر کی طرف محو پرواز تھے۔

”عانشے گل!“ چند لمحے ان پرندوں کے پتھ کی مانند اڑ کر بادلوں میں گم ہو گئے تو ہمارے نے پکارا۔

”بولو۔“ وہ گردن جھکائے اپنی لڑی میں اب سرخ پھولوں کے آگے سفید پھول پرو رہی تھی۔

”تم تو ہمیشہ سچ بولتی ہو نا۔ ایک بات بتاؤ گی۔“ ہمارے ذرا ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔

”پوچھو۔“

”عبداللہ کی بہن کسی کو کہہ رہی تھی کہ بیوک ادا کی پولیس بہت بری ہے۔ وہ عبدالرحمن پاشا کو کچھ نہیں کہتی اور یہ کہ وہ جزیرے کا سب سے برا آدمی ہے۔“

عانشے اکیا عبدالرحمن واقعی برا آدمی ہے؟“ وہ رک رک کر تذبذب سے پوچھ رہی تھی۔

عانشے سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہمارے خاموش ہوئی تو اس نے ذرا اٹھکی سے سر جھٹکا۔

”نہیں، وہ بہت اچھا آدمی ہے عبداللہ کی بہن کو کیا پتا؟ اور تم نے کسی سے جاکر عبدالرحمن کے بارے میں کوئی بات نہیں کہنی۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“

ہمارے نے گردن اثبات میں ہلادی۔

”مجھے یاد ہے۔“

عانشے دھاگا دانت سے توڑ کر لڑی کے دونوں پہلوں کی آپس میں گرہ لگانے لگی۔ اس کے چہرے پہ واضح اسی بکھری تھی۔

وہ سہ پہر میں خدیجہ کے گھر سے واپس آئی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں لٹی رہی۔ سرد رو سے پھٹا جا رہا تھا،

بخار بھی ہو رہا تھا اور نیند بھی کہ 7 بج رہی نہیں رہی تھی۔ بند کمرے میں گھٹن ہونے لگی تو وہ گہرا کراہی

اور کھڑکیوں کے پردے دونوں ہاتھوں سے ہٹائے۔

سامنے لان میں کرسیوں پہ اب اور لہاں کے ساتھ تیار فرقان اور صائمہ تائی چائے پیتے نظر آ رہے تھے۔

مینہ پھونکنے اور دیگر لوازمات رکھے تھے اور وہ لوگ باتوں میں مگن تھے۔ صائمہ تائی بہت سلیقے سے سر پہ

دوپٹا جمائے فاطمہ کی طرف چہرے کی کچھ کہہ رہی تھیں۔ فاطمہ، تیار فرقان کے سامنے سر پہ دوپٹا لے لیتی

تھیں جو پیچھے کیچھو تک دھلک جاتا تھا۔ ان کی آنکھیں حیا جیسی تھیں اور لوگ کہتے تھے کہ بیس سال بعد حیا ایسی ہی ہوگی اور اب وہ سوچتی تھی کہ پتا

نہیں بیس سال بعد وہ ہوگی بھی یا نہیں۔

وہ اشارے کر سناہ سفید رٹاؤ زریہ ٹخنوں کو چھوتی سفید لمبی قمیص پہنے ہم رنگ دوپٹا سر پہ لپیٹے باہر آئی۔

پہلے عصر کی نماز پڑھی کہ نمازیں ان تین دنوں میں وہ قربا ساری پڑھ رہی تھی۔ خدیجہ کے لیے بہت ڈھیر

ساری دعائیں کر کے وہ اٹھی اور پھر دوپٹا شانوں پہ پھیلائے کھلے بالوں کو کھلا چھوڑے پن کی طرف آگئی۔

فاطمہ فرخ سے کچھ نکال رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھا تو فرخ کا روزانہ بند کر کے مسکرائی ہوئی اس کی

طرف آئیں۔ شانوں تک آتے بالوں کو کچھ چہرے میں پاندھے، وہ عام حلیے میں بھی بہت جاذب نظر لگتی

تھیں۔

”میرا بیٹا اٹھ گیا؟“ انہوں نے اسے گلے سے لگایا۔

پھر ہاتھ چویا۔

”جی!“ وہ مسکراتا چاہتی تھی مگر آنکھیں بھیگ گئیں۔

”بس صبر کرو۔ اللہ کی چیز تھی اللہ نے لے لی۔“

”صبر اتنا آسان ہوتا تو کوئی دوسرے کو کرنے کو نہ کہتا ہاں! ہر شخص خودی کر لیتا۔ مگر میں کوشش کروں گی۔“

”گڈ! اچھا باہر آ جاؤ، تیا تائی ملنے آئے ہیں۔“

”جھگڑا؟“

”ہاں اور جہاں سے بھی۔“

”اوہ ہاں، کدھر ہے وہ؟“ اسے یاد آیا کہ وہ بھی ساتھ آیا تھا۔

”بس کھانا کھا کر سو گیا تھا، ظاہر ہے تھکا ہوا تھا، ابھی میں نے دیکھا تو اٹھ چکا تھا، کہہ رہا تھا بس آ رہا ہوں۔“

”یہ سین کا بیٹا ذرا۔۔۔“ وہ کہتے ہوئے جھجکیں۔

”ذرا اور ڈسا ہے، نہیں؟“

”ذہنیں وہ شروع میں یونی ریورسار تھیں۔“

”اور بعد میں؟“

”حیائے گہری سانس لی۔“

”بعد میں بھی ایسا ہی رہتا ہے۔ اس شروع اور بعد کے درمیان بھی، جی نارمل ہو جاتا ہے۔“

وہ باہر آئی تو اسے دیکھ کر تیار فرقان مسکرائے۔ وہ جھک کر ان دونوں سے ملی۔

”اتنے عرصے بعد ملا ہوں اپنی بیٹی سے اور وہ بھی ایسے موقع پر۔ تمہاری دوست گان کر بہت افسوس ہوا اللہ اس کی مغفرت کرے۔“

”آمین!“ وہ سر کے اثبات کے ساتھ تعزیت وصول کرنی کر سی پھینچ کر بیٹھی۔

”ہوایا تھا اسے؟“ صائمہ تائی نے اسف سے پوچھا۔

”برین ہیمرج۔“

چند لمحے کے لیے ملال زدہ خاموشی چھا گئی، جسے برآمدے کا دروازہ کھلنے کی آواز نے چیرا۔ وہاں سے فاطمہ باہر آئی تھیں اور ان کے عقب میں جہان بھی تھا۔

اس نے سیاہ رٹاؤ زریہ کے دونوں پہلوؤں پہ لمبی سفید دھاری تھی، کے اوپر آوے بازوؤں والی سرمئی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھیں شمار آلود تھیں،

جیسے ابھی سو کر اٹھا ہو۔ چہرہ اور سامنے کے بال گیلے تھے وہ شاید پانی کے چھینٹے مار کر تو لیے سے منہ خشک کیے بغیر ہی باہر آ گیا تھا۔

اسے آتے دیکھ کر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ لان کے دہانے پہ پہنچا تو لمحے بھر کے لیے ذرا تذبذب سے گھاس کو دیکھا، پھر ایک نگاہ سامنے بیٹھے

افراد کے قدموں پہ ڈالی جو جوتوں میں مقید تھے، پھر ذرا جھج کر گھاس پہ چلتا ہوا ان تک آیا۔

حیا جانتی تھی کہ وہ کیوں جھجکا ہے۔ ترکی میں

گھاس پہ چلنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا اور موقع ملنے پہ وہ اور ڈیڑی بے اپنی ہلکی سیکن کے لیے گھاس پہ ضرور جوتوں سے چل کر دیکھتی تھیں۔

”شکر ہے تمہاری شکل تو دیکھی ہم نے۔“ اس سے مل کر رسمی انداز میں سب کا حال احوال پوچھ کر

تیار فرقان نے ہنسی مونیچوں تلے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”تھینکس!“ وہ رسا۔ کبھی نہیں مسکرایا، اور اسی سرد انداز میں کتا حیا کے مقابل کر سی پھینچ کر بیٹھا۔ وہ

یہاں آنے پہ قطعاً راضی نہ تھا، وہ جانتی تھی۔

”سین نے تو کیا قسم کھا رکھی تھی کہ ہمیں اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھنے دے گی۔ اسے کیسے خیال آیا

تمہیں بھیجے گا؟“ اس کے لیے دیے سے انداز کا اثر تھا کہ تیار فرقان کے مسکراتے بچے کے پیچھے ذرا سی

چھین در آئی۔

”ممی کو اپنی بیٹی کو اکیلے بھیجنا آکر ڈر لگ رہا تھا، سو مجھے آنا پڑا۔“ بغیر کسی گلی لپٹی کے اس نے کہہ ڈالا۔

منگتیر، منگوجہ کے الفاظ تو دور کی بات، اس نے تو میری کزن تک نہیں کہا تھا، گویا رشتوں کی حدود واضح

کیں۔

سلیمان صاحب کے ماتھے پہ ذرا سی شکن ابھر آئی، اور صائمہ تائی کے لبوں کو ایک معنی خیز مسکراہٹ نے

چھو لیا۔ حیا بالکل لا تعلقی سی لان کی کیار یوں میں آگے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ وہ اور ڈیڑی بے ہمیشہ کا قسم پارک

سے پھول چرانے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ کیئر ٹیکر ان پہ بڑی سخت نگاہ رکھتا تھا۔

”اور تمہاری ممی کب آئیں گی؟“ سلیمان صاحب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”ممی کی بیٹی اور تمہاری ممی۔“ اس کے گھر کے مرد آج بہت تول تول کر الفاظ ادا کر رہے تھے۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس نے شانے اچکا دیے۔

”جہان! جوس لوگے یا چائے، یا پھر کافی؟“ فاطمہ نے چائے کے خالی کیئرے میں رکھتے ہوئے اس کو



مخاطب کیا۔ وہ مردوں کی بہ نسبت اس کو دانا والا پروکھول دے رہی تھیں۔

”بس اہل لی بہت ہے۔“ اس نے روانی میں کہہ دیا، مگر فاطمہ کی آنکھوں میں ابھرتی نا سنجی دیکھ کر لمحے بھر کو متذبذب ہوا، پھر فوراً صبح کی۔

”بس چائے!“

فاطمہ نے مسکرا کر سر ہلایا اور رُے اٹھائے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

”تو بیٹا! آپ کی اسٹریز کھلٹ ہو گئیں؟“ صائمہ تائی اب بہت قہقہے لمحے میں پوچھ رہی تھیں۔ وہ ہر کسی کے لیے اتنی میٹھی نہیں ہوتی تھیں، کچھ تھا جو اسے چونکا گیا۔

”جی اب تو کافی عرصہ ہو گیا۔“

”پھر کیا کر رہے ہو آپ؟“

”میرا استقلال اسٹریٹ پہ ایک ریٹورنٹ ہے وہی دیکھتا ہوں۔“

جواباً صائمہ تائی ذرا حیران ہوئیں، البتہ تایا فرقان نے ممانت سے سر ہلاتے اپنے تاثرات چھپا لیے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ استقلال اسٹریٹ کی قیمتی زمین کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اس لیے متاثر نہیں ہوئے اور گو کہ وہ اپنی لا تعلقی توڑنا نہیں چاہتی تھی، پھر بھی دھیرے سے بولی تھی۔

”استقلال اسٹریٹ پہ ایک ریٹورنٹ کا مطلب ہے لاہور کی ایم ایم عالم روڈ پہ دور ریٹورنٹس۔“ وہ کہہ کر کھاروں کو دیکھنے لگی۔

”اوہ اچھا۔۔۔ گڈ!“ ان کے تاثرات فوراً ہی بدلے تھے۔

”والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

”جی ٹھیک ہیں۔“ وہ مختصر جواب دے رہا تھا۔ تب ہی فاطمہ اس کی چائے کا مک رُے میں لیے چلی آئیں۔

”کچھ لو بیٹا! تم نے کچھ نہیں لیا۔“

”جی، میں لیتا ہوں۔“ اس نے مک اٹھا لیا مگر دوسری

کسی شے کو چھوا تک نہیں۔

تایا فرقان اور صائمہ تائی اوھر اوھر کی چھوٹی موٹی باتیں کر کے جلد ہی اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ جاتے وقت وہ جہان کے لیے دے جانے والے آج رات کے ڈنر پہ سب کو مدعو کر کے گئے تھے۔

”تمہاری چھٹی کب تک ہے پھر؟“ ان کے جانے کے بعد سلیمان صاحب جہان سے پوچھنے لگے۔

”بس یہی چار دن۔“

”پھر تم اپنی فلائٹ بک کروانا تو حیا کی مت کروانا۔ وہ واپس نہیں جائے گی۔“ حیانے چونک کر بابا کو دیکھا۔

”اوکے!“ جہان نے ایک سرسری نظر اس پہ ڈالتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

”مگر بابا۔۔۔ ہمارا کانٹریکٹ۔“ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گئی تھی۔

”میں تمہارا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوا دوں گا۔ کانٹریکٹ کی فکر چھوڑو۔ اب میرا مزید حوصلہ نہیں ہے تمہیں باہر بھیجے گا۔ اس جی کا جائزہ بھگتا ہے میں نے۔ اتنی دور ایلی پیچاں بھیجتا کہاں کی عقل مندی ہے کل کو کچھ ہوا تو۔“

”ابا! اس کے برن میں اندر بہت پہلے سے۔“

”حیا! جو میں نے کہا وہ تم نے سن لیا؟“ ان کا انداز اتنا دو ٹوک اور سخت تھا کہ اس نے سر جھکا دیا۔

”جی ابا!“

جہان لا تعلقی سا بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

تایا فرقان کے پورج کی بتیاں رات کی تاریکی میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ اور جہان، فاطمہ کے ہمراہ چلتے ہوئے برآمدے کے دروازے تک آئے تھے۔

سلیمان صاحب کا کوئی آئینشل ڈنر تھا، سو انہوں نے معذرت کر لی تھی۔

دروازے کے قریب جہان رکا اور جھک کر بوٹ کا تمہ کھولنے لگا۔ فاطمہ نے رک رک کر ایتھنے سے اسے

دیکھا۔

”پاکستان میں جوتے پہن کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔“ وہ اتنی کبیدہ خاطر اور بے زار تھی کہ جہان سے مخاطب ہونے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر بھی کہہ اٹھی۔

”اوہ سوری!“ وہ ذرا چونکا، پھر جلدی سے تے کی کمرہ لگا کر سیدھا ہوا۔ یہ پہلی باضابطہ گفتگو تھی جو پاکستان آکر ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔

”ترکی میں جوتے گھر کے باہر اتارتے ہیں اس لیے وہ رکا تھا۔“ اس نے انھی سی کھڑی فاطمہ کے قریب سرگوشی کر کے وجہ بتائی اور آگے بڑھ گئی۔

ڈانٹنگ ہال میں بہت پر تکلف کھانا بجا تھا۔ صائمہ تائی نے خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ جہان بہت مختصر گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو جواب دیتا اور پھر خاموشی سے کھانے لگ جاتا۔

ارم، سونیا بھابی اور داور بھائی کے اس طرف بیٹھی تھیں۔ وہ حیانے ذرا رکھائی سے ملی۔ اس کا ہنچا ہنچا اور خاموش سا انداز حیا کو ساری وجہ سمجھا گیا مگر اس نے اثر نہیں لیا۔ وہ ڈی جے کا صدمہ اٹا کر لے رہی تھی کہ اسے اب ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

داور بھائی اور تایا فرقان، جہان سے ترکی کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں یونی برسیل تذکرہ پوچھ رہے تھے اور وہ نے تلے جواب دے رہا تھا۔

”آگے کا کیا ارادہ ہے تمہارا؟“ کھانا درمیان میں تھا، جب تایا فرقان نے بہت سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے گویا تاش کا پہلا پتا پھینکا۔

حیانے ذرا چونک کر انہیں دیکھا اور پھر فاطمہ کو، جو حیا کی طرح ہی چونکی تھیں۔ جو بات ان دو ماہ میں وہ خود اور اتنے عرصے سے اس کے ماں باپ، سینین پھپھویا جہان سے نہیں پوچھ سکے تھے، وہ تایا فرقان نے بڑے آرام سے پوچھ لی تھی۔

”کچھ سرمایہ جمع ہو تو جو ہر مال میں ایک ریٹورنٹ کھول لوں گا۔“ پیچھے اور کانٹے سے چاول پیٹ سے اٹھاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

”پاکستان میں جوتے پہن کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔“ وہ اتنی کبیدہ خاطر اور بے زار تھی کہ جہان سے مخاطب ہونے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر بھی کہہ اٹھی۔

”اوہ سوری!“ وہ ذرا چونکا، پھر جلدی سے تے کی کمرہ لگا کر سیدھا ہوا۔ یہ پہلی باضابطہ گفتگو تھی جو پاکستان آکر ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔

”ترکی میں جوتے گھر کے باہر اتارتے ہیں اس لیے وہ رکا تھا۔“ اس نے انھی سی کھڑی فاطمہ کے قریب سرگوشی کر کے وجہ بتائی اور آگے بڑھ گئی۔

ڈانٹنگ ہال میں بہت پر تکلف کھانا بجا تھا۔ صائمہ تائی نے خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ جہان بہت مختصر گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو جواب دیتا اور پھر خاموشی سے کھانے لگ جاتا۔

ارم، سونیا بھابی اور داور بھائی کے اس طرف بیٹھی تھیں۔ وہ حیانے ذرا رکھائی سے ملی۔ اس کا ہنچا ہنچا اور خاموش سا انداز حیا کو ساری وجہ سمجھا گیا مگر اس نے اثر نہیں لیا۔ وہ ڈی جے کا صدمہ اٹا کر لے رہی تھی کہ اسے اب ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

داور بھائی اور تایا فرقان، جہان سے ترکی کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں یونی برسیل تذکرہ پوچھ رہے تھے اور وہ نے تلے جواب دے رہا تھا۔

”آگے کا کیا ارادہ ہے تمہارا؟“ کھانا درمیان میں تھا، جب تایا فرقان نے بہت سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے گویا تاش کا پہلا پتا پھینکا۔

حیانے ذرا چونک کر انہیں دیکھا اور پھر فاطمہ کو، جو حیا کی طرح ہی چونکی تھیں۔ جو بات ان دو ماہ میں وہ خود اور اتنے عرصے سے اس کے ماں باپ، سینین پھپھویا جہان سے نہیں پوچھ سکے تھے، وہ تایا فرقان نے بڑے آرام سے پوچھ لی تھی۔

”تم داور سے سال بھر ہی پچھوٹے ہو نا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”بھئی داور میاں تو اب مزید اسٹیبلشمنٹ ہونے کے حق میں بالکل نہیں تھے اور صاحبزادے کا خیال یہ تھا کہ اس عمر میں فیملی شروع کر دینی چاہیے، سو ہم نے ان کی شادی کر دی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

تایا فرقان چاول کی پلیٹ میں راستہ ڈالتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ حیا کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا اس نے جھکا کر سر مزید جھکا دیا۔

”داور کے پاس اس کے والد کا اسٹیبلشمنٹ بزنس تھا، سو وہ اس پوائنٹ پہ شادی انور ڈکر سکتا تھا۔“ جہان نے سلاوا کی پلیٹ سے کھیرے کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”کام تو خیر تمہارا بھی اسٹیبلشمنٹ ہو گیا ہے۔“

جواباً اس نے ذرا سے شانے اچکا دیے۔

”میرے اور ابھی کافی قرض ہے، وہ ذرا ہلکا ہو جائے تو ہی کچھ سوچوں گا۔“

حیانے گردن مزید جھکا لی۔ کیا تھا اگر وہ اپنی لینڈ لیڈی کے قرضے کا ذکر کرتا، کچھ بھرم تو رہنے دیتا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے، انسان اس وقت ہی شادی کرے جب وہ اس ذمہ داری کو نبھاسکے۔ ذمہ داری نبھانا بھی مشکل کام ہوتا ہے، ہاں اگر والدین ساتھ دیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے، مگر یہاں پاکستان میں تو اب اکثر شادیوں پہ والدین ناخوش ہی ہوتے ہیں، کیونکہ آج کل کے بچے ان کی پسند کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنی مرضی کرتے ہوئے ان کے طے کردہ رشتوں کو رد بھیج دیتے ہیں۔ یہ تو میرے بچے ہیں کہ جوں باپ نے کہا اس پر راضی ہو گئے، ورنہ تو۔۔۔“ انہوں نے معاشرے پہ ایک تبصرہ کرتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔

سونیا بھابی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری سی ٹکئیں ابھرتی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔



”ویل۔۔۔ یہ ڈھینڈھ کرتا ہے۔“ جہان نے کولڈ ڈرنک کے گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے، ہاں باپ اگر اپنی مرضی مسلط نہ کریں تو چیزیں ٹھیک رہتی ہیں۔“

صائمہ نائی کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ فاطمہ کے چہرے پہ ایک تاریک سایہ لہرایا اور حیا کی گردن مزید جھک گئی۔ بھرے پنڈال میں گویا اس کی بے عزتی کردی گئی تھی۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ تایا فرقان نے سر ہلا کر تائید کی۔ ”تمہاری واپسی کب ہے؟“ جواب مل گیا تھا، سو بات بدل دی۔

”سوموار کی فلائٹ ہے۔“

”حیاتو نہیں جاری نا۔ شکر ہے سلیمان نے کوئی عقل کے ناخن لیے۔ ویسے میرا بھائی میری طرح بزدل نہیں ہے بلکہ کافی بہادر ہے۔ میری بیٹی نے بھی آکر اسی اسکا لرشپ کا کام تھا، مگر میں نے اس کی ماں سے کہا کہ اسے سمجھاؤ ایک لڑکی جب دوسرے ملک یوں تنہا جاتی ہے تو پورا خاندان انگلیاں اٹھاتا ہے۔ بھیجی جتنی احتیاط کرے، لوگ تو باتیں بناتے ہیں کہ کو ایجوکیشن میں پتا نہیں کیسے رہتی ہے وہاں اکیلے باہر آنا جانا ہو گا، کس سے ملتی ہے، کس سے نہیں، پھر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ماں باپ تو ہونگے بدنام۔ خیر! ویسے تیری تو اچھا مسلمان ملک ہے اور تمہاری فیملی ساتھ تھی تو ہمیں اپنی بیٹی کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔“

انہوں نے کہتے ہوئے مسکرا کر حیا کو دیکھا جو خاموشی سے پلیٹ میں دھرے چاول کاٹنے سے ادھر ادھر کر رہی تھی۔ وہ کھا نہیں رہی، کسی نے محسوس نہیں کیا۔

”حیا! تم نے شادی کے کپڑے بنوائے؟“ صائمہ نائی نے گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑا۔ اس نے ذرا سی نفی میں گردن ہلائی۔

”ابھی دیکھوں گی۔“ اسے علم نہیں تھا کہ اماں نے

کپڑے بنوائے ہیں یا نہیں۔

”چلو تم تو بیڑی میڈ بھی لے سکتی ہو، آسانی ہو جائے گی۔ سارا مسئلہ میری ارم کا ہو تا ہے۔ دوپٹا شیفون کا نہ ہو، پتلہ دوپٹا سر پہ ہی نہیں نکلتا، آستین باریک نہ ہو اور پھر جو اچھا جوڑا لگتا ہے اس کی آستینیں ہی غائب ہوتی ہیں۔ تمہاری تو خیر ہے، تم سب ہی کچھ پہن لیتی ہو، ساری مصیبت تو میری آئی رہتی ہے۔ بار بار درزی کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔“

بات ختم کر کے انہوں نے ایک نظر جہان پہ ڈالی۔ وہ نشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

”بس کیوں کردی بیٹا! اور لوٹا، کھانا ٹھیک لگا تمہیں؟“

”جی! ماما! کھانا تو بہت اچھا تھا، بس ذرا مرچ زیادہ تھی۔“ وہ پہلی دفعہ ذرا سا مسکرا کر بولا۔

جہان نائی کی مسکان چھکی ہوئی، وہاں سونیا بھابھی نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے چوہ جھکایا۔

☆ ☆ ☆

رات دیر تک جاگنے کے باعث وہ صبح دن چڑھے تک سوئی رہی اور آنکھ کھلی بھی تو موبائل کی آواز سے۔

اس نے مندی مندی سی آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اپنا پاکستانی موبائل اٹھا کر دیکھا۔ وہاں ”پرائیوٹ نمبر کالنگ“ جلتا، جھٹکا کھائی دے رہا تھا۔

”اف۔۔۔ یہ پھر پیچھے پڑ گیا۔“ اور اسے پتا تھا کہ جب تک اٹھائے گی نہیں وہ کال کرتا رہے گا۔

”ہیلو؟“ اس نے کمینوں کے بل اٹھتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

”ویلم بیک۔ کیسی ہیں آپ؟“ وہی دھیما، خوب صورت، گلیمر لہجہ۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

”کیوں فون کیا ہے آپ نے؟“

”آپ کی دوست کا ساتھ بہت افسوس ہوا۔“

”آئندہ آپ کو کبھی افسوس ہوا خوش ہو، مجھے فون مت کیجیے گا۔“

”آپ اتنی بدگمان کیوں رہتی ہیں؟ آپ اگلے بندے کی پوری بات کیوں نہیں سنیں؟“ اسے جیسے غصہ آیا تھا۔

”دیکھیں! میں جانتی ہوں کیا آپ کون ہیں، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کس کے بیٹے ہیں اور یہ بھی کہ آپ کا میرے خاندان سے کیا البشو ہے، مگر بات جو بھی ہے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپ آئندہ فون کریں گے بھی تو میں نہیں اٹھاؤں گی۔ خدا حافظ۔“

اس نے زور سے بٹن دبا کر فون بند کیا اور تکیے پہ اچھال دیا۔ پتا نہیں کون سا گناہ تھا اس کا جو وہ شخص اس کے پیچھے پڑ گیا اور اپنے ساتھ بہت سے مسئلے اس کے پیچھے لگانے لے۔

شام میں فاطمہ کے بے حد اصرار اور پھر ناراض ہونے کی دھمکی کے بعد حیادہ کا دارانار کلی فراق پہننے پہ راضی ہوئی جو رنگ کے فرق کے ساتھ تمام لڑکیوں نے مہندی کے لیے بنوائے تھے۔ اس کا قطعاً ”تیار ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر فاطمہ نے اس کی ایک نہیں سنی۔

”جو ہو چکا ہے، ہم اسے بدل تو نہیں سکتے۔ پھر لوگوں کو خود پہ تنسخر کرنے کا موقع کیوں؟ فریٹش ہو کر جاؤ ورنہ تمہاری تالی کوئی نہ کوئی قصہ بنا دیں گی۔“

لبا انار کلی فراق گہرے سبز رنگ کا تھا اور اس پہ دیکے کا سلور کام ہوا تھا۔ ساتھ میں سونیا بھابھی نے اس کو اپنا سبز اور سلور پر اوندھ باندھ دیا کہ سب لڑکیاں پر اوندھے پہن رہی تھیں۔ سلور ٹپکا بھی سونیا نے ہی اس کی پیشانی پہ سجایا، مگر کسی بھی قسم کے سنگھار کے لیے وہ قطعاً ”راضی نہ تھی۔

”کاجل تو ڈال لو۔“ سونیا اس کے ساتھ سیڑھیوں کے اوپر کھڑی بجٹ کر رہی تھی۔ وہ اس وقت تایا فرقان کے گھر میں تھیں۔ سیڑھیوں سے نیچے لاؤنج میں ہر طرف رشتہ داروں کی چل پھل تھی۔ مہوش اور سحرش کی چھوٹی بہن شاکیما لے ادھر ادھر بھاگ

رہی تھی۔ اس کا فراق سرخ گلر کا تھا۔ سونیا کا اپنی بری کا تھا، لگا لگا رہی۔

”میں رہنے دیں بھابھی!“ اس نے بدلی سے چہرہ پیچھے ہٹایا۔ چاندی کے گول ٹیکے نے دھلے دھلائے چہرے کو سجایا تھا۔

سونیا تاسف سے سر جھٹک کر گویا اس پہ ماتم کرتی، سیڑھیاں اتر گئی۔ اس نے ایک آخری نگاہ دیوار پہ آویزاں آئینے پہ ڈالی، کلیڈار سبز دوپٹا کندھے پہ ڈالا۔ اور دوسرا بلوٹا میں پانڈو سے آگے نو نکال لیا اور پلٹ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ تب ہی اس نے جہان کو دیکھا۔ وہ سب سے لا تعلق سا اپنے موبائل پہ کچھ پڑھتا سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ فاطمہ اس کے لیے دو تین کرتے لے آئی تھیں اور اس وقت اس نے ان میں سے ایک سیاہ والا کرتا زیب تن کر رکھا تھا، جس کے گلے پہ سنہرے دھاگے کا کام تھا۔ آستین کمینوں تک موڑے وہ کوئی سچ لکھ رہا تھا۔

وہ سچ سچ کر باریک پھیل سے زینے اترنے لگی۔ ناقصم والا واقعہ اسے نہیں بھولتا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پہ تھی، جب جہان نے سر اٹھایا، ایک لمحے کے لیے رگ کر اسے دیکھا، پھر اس کی طرف آیا۔

”جیا۔۔۔!“ وہ آخری زینے پہ ایک ہاتھ ریٹنگ پہ رکھے تھہری گئی۔

”میں نے اپنی سوموار کی فلائٹ بک کروائی ہے۔ تمہاری بنگ تو نہیں کروائی نا؟ تم واپس نہیں جا رہی رائٹ؟“ اس لا تعلق سے انداز میں وہ محض کام کی بات پوچھ رہا تھا۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اگلنے لگا۔

”نہیں، میں واپس نہیں جا رہی۔ اب ایک دفعہ فیصلہ کر لیں تو پھر وہ اسے نہیں بدلتے۔“ وہ آخری زینہ اتر کر اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی ہوئی۔

”اوکے!“ وہ شانے اچکاتے ہوئے پلٹنے ہی لگا تھا کہ شا اس بل کیمر لے ان کے سامنے آئی۔

”ایک منٹ جہان بھائی! یہیں کھڑے رہیں، میں



آپ دونوں کی پکچر لے لوں۔“ خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے کمر اپنے چہرے کے سامنے کیا۔  
جہاں نے ذرا چونک کر ساتھ کھڑی جا کو دیکھا اور پھر قدرے ناگوار سی وہ چند قدم آگے کو آیا۔ شاہو فوکس کر رہی تھی نے ذرا حیران ہو کر کمر اپنے چہرے سے نیچے کیا۔

”کسی کی پکچر بنانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا چاہیے۔“ لب بچھنے، ذرا درختی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

شاہکارنگ ساند پر گیا۔ اس کا کمرے والا ہاتھ ڈھیلا ہو کر پلو میں آگرا۔ اس نے پلٹ کر راہداری کی سمت دیکھا، جہاں وہ جا تا دکھائی دے رہا تھا، پھر دبے دبے غصے سے سر جھٹکا۔

”میری توبہ جو کبھی ان کی تصویر بناؤں یا ان سے بات بھی کروں۔“ وہ خشکی سے بڑبڑاتے ہوئے آگے چلی گئی۔

حیائے انگلی کی نوک سے آنکھ کا بھیگا گوشہ صاف کیا اور سر کو خفیف سی جنبش دے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے پاس رونے کے لیے بہت سے غم تھے۔

مندى كافنكشن زاهد پچا کے لان میں ہی منعقد کیا گیا تھا۔ لان کاٹی کھلا اور وسیع تھا، سوتلاتوں سے صرف اوپر کی چھت بتائی گئی باقی اطراف کھلی رکھی گئیں۔  
جہاں ہر سو دیواروں پر لڑیوں کی صورت بتیاں جگمگا رہی تھیں۔

اسٹیج پر رکھے لکڑی کے جھولے کو گیندے کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور موش اس پر کسی ملکہ کی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کا انار کلی فراک باقی لڑکیوں کے برعکس دور نکاتھا۔ سرخ اور زرد۔ ان ہی دو رنگوں کا پرانہ آگے کندھے پر ڈالے دوپٹا سر پر نکائے وہ مسکرا کر بہت پر اعتماد طریقے سے سب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس اعتماد میں غرور کی جھلک بھی تھی۔ وہ خوب صورت نہیں تھی، مگر خوب سارا پیسہ اپنی تراش

خراش پر لٹانے کے بعد آب بے حد پر کشش لگ رہی تھی۔

پہلو میں بیٹھا اس کا ماموں زاد عفان عام سی شکل کا کینڈین نیشنل تھا مگر سننے میں آیا تھا کہ تازہ ماہ بے حد امیر ہوا ہے۔ ابھی یہ کہانی حیاتے پوری سنی نہیں تھی۔

وہ بالکل کونے میں رکھی ایک میز کے گرد کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہاں جگہ جگہ ایسے ہی میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھی ایسے ہنز فراک میں ادھر ادھر خوش باش پھر رہی ہوتی مگر توجہ اندر سے اتنی بے زار اور اواس تھی کہ وہیں بیٹھی سب کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھ گئی۔

ہر طرف لڑکیاں، لڑکے آ جا رہے تھے۔ شاہکارنگ اٹھائے ماتھے، جھوٹا ٹپکا سنبھاتی، ادھر ادھر اٹھاتی تصویریں کھینچتی پھر رہی تھی۔ اسٹیج صائبر تائی جھک کر موش کو مندی لگا کر اب مٹھائی کھلا رہی تھیں۔  
ارم بھی وہیں تھی۔ اس کا انار کلی فراک ہلکا نیوزی تھا اور کبھی وہ دھپٹا گردن میں ڈال لیتی تو کبھی سر پہ کرتی کہ خواتین اور مردوں کا ایک ہی جگہ انتظام تھا اور تیارا فرقان بھی اس پاس ہی تھے۔

زاهد چچا روشن خیال تھے تو موش کے ماموں کا خاندان بھی آزاد خیال تھا، سو مندی كافنكشن مشترکہ رکھا گیا تھا۔ البتہ ان کے خاندان کے لڑکے اور مرد ذرا الگ تھک چند میزوں پر براہمن تھے ماکہ برائے نام ہی سسی، نگہپاریشن ہو جائے، تیارا فرقان اور سلیمان صاحب سب وہیں تھے۔

وہ اسی طرح بیٹھی، پرانہ آگے کو ڈالے، غیر دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ میں گرد پیش کا جائزہ لے کر جہاں کو ڈھونڈنا چاہا تھا اور وہ اسے نظر ابھی گیا تھا۔ دور، مردوں کی طرف، تیارا فرقان اور سلیمان صاحب کے ساتھ کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ، جمائے ہوئے آستین عاتوا، کینڈیوں تک موڑے وہ خالصا تعلق سا بیٹھا تھا۔ یقیناً، وہ جی بھر کر رور ہو رہا

تھا۔  
وہ تلخی سے سر جھٹک کر واپس اسٹیج کو دیکھنے لگی، جہاں اب فاطمہ، موش کو مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس کی جڑواں بہن حشر بیٹھی مسکرا کر کمرے کو دیکھتی تصویر بنا رہی تھی۔ اس کا انار کلی فراک پستی رنگ کا تھا۔ دونوں بہنوں کی شکل و صورت سمیت سب مختلف تھا۔ مگر بے بد لے یہ مغرورانہ انداز یکساں تھے۔ شاہو فوکس جھوٹی یا فطرتاً مختلف تھی، سواس نے یہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔

”حیائے ادھر بیٹھی ہو؟“ ارم اپنا نیوزی کا مدار دھپٹا کر ہٹک سے جھٹکے ہوئے اس کے ساتھ کرسی پہ آ بیٹھی۔ کل کی نسبت اس کا رویہ قدرے دوستانہ تھا۔  
”ہاں، تم سناؤ! تھک گئی ہو؟“ وہ بھی جواباً نرمی سے بولی۔

”ہاں بس، تھوڑی بہت۔ اچھا وہ۔۔۔“ لہجہ ذرا سرسری بنا کر وہ بولی، ”فون فارغ ہو گا تمہارا؟ مجھے ذرا فضا کو کل کرنی تھی، کچھ نوٹس کا کتا تھا۔ میرا فون خراب ہے آج کل۔“  
حیائے گہری سانس اندر کو کھینچ کر خارج کی۔ ”تو ارم سے اس کا فون بھی لے لیا گیا تھا۔“

”ہاں! فون فارغ ہے، جب چاہے لے لو، مگر کریڈٹ ختم ہے، جب سے آئی ہوں ڈلوایا ہی نہیں ہے۔ دوسرے فلٹر کو ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ ملے تو اس کو بھیج کر کارڈ منکواؤں۔“

اس نے تیارا فرقان کے کل وقتی لگ کا نام لیا۔ گو کہ یہ سچ نہیں تھا اور کریڈٹ اس نے جی ہی ڈلوایا تھا مگر وہ ارم کو فون نہیں دینا چاہتی تھی۔  
”اچھا۔۔۔“ ارم کے چہرے پہ واضح مایوسی پھیلی تھی۔

”ہاں! کا فون فارغ ہو گا، لے آؤں؟“ وہ اٹھنے لگی تو اس کی توقع کے عین مطابق ارم نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔  
”رہنے دو، میں بعد میں، اب اسے لے لوں گی۔ میرا

فون ذرا رہی ہو گا، لے لے نہ گیا ہوتا تو۔۔۔ خیر تم سناؤ، ترکی میں سب ٹھیک تھا؟“ وہ بات کا سرخ پلٹ گئی۔  
”بس۔۔۔ وہاں کی تواب دنیا ہی بدل گئی ہے، کوریہ موش، حشر کے انداز اتنے بدلے بدلے کیوں لگ رہے ہیں؟“ اس نے پرانے کو ہاتھ سے پیچھے کر پھ ڈالتے ہوئے حیرت کا اظہار کر رہی دیا۔ آخر دونوں کزنز تھیں اور کبھی بہت اچھی دوستیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

”دلغ خراب ہو گیا ہے ان دونوں کا۔“ ارم سرگوشی میں کہتے ہوئے ذرا قریب کھٹک آئی۔ ”یہ جو عفان صاحب ہیں نا، جن کو میں اپنا ذرا سہر بھی نہ رکھوں۔ انہوں نے کینڈا میں کسی رنفلٹھی لی وی شو میں حصہ لے کر ڈیڑھ ملین ڈالر زیتے ہیں اور ان سب کی جون ہی بدل گئی ہے۔ شاہے دونوں بہن مولن پہ یورپ کے ٹور پہ جا رہے ہیں۔“ ارم کے لہجے میں نہ حد تھا نہ رشک۔ بس وہ آگاہی ہوئی لگ رہی تھی۔

”تب ہی میں کہوں!“ اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ارم کچھ دیر مزید بیٹھی، پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اسے اگر کسی نے اسٹیج کی طرف بلایا تو کبھی وہ نہیں گئی اور اصرار بھی کسی نے نہیں کیا۔ اس کے صدمے سے سب واقف تھے، مگر اس کی دوست کے غم میں کسی نے اپنا کام نہیں چھوڑا تھا اور وہ کسی سے ایسی توقع کر بھی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی دل پہ ایک بوجھ سا تھا۔ کتنی بے حس تھی۔ دینا۔ کیسے جہوں میں لوگ ختم ہو جاتے ہیں اور یہاں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سب کام جاری و ساری تھے اور۔

ایک دم سے بجلی غائب ہو گئی۔ باہری بتیاں گل ہو گئیں۔ ہر طرف اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔ صرف کیرا مین کے کیمروں کی ٹلیش لائٹس کی روشنی رہ گئی۔ پھر مایوسی غصہ پھری متھل سی آوازیں بلند ہوئیں۔  
موبائل کی ٹارچز آن ہوئیں، کسی نے بھاگ کر برآمدے کی پو پی ایس کی ٹیوب لائٹ جلائی تو مدہم سفید روشنی برآمدے میں پھیل گئی۔

رضا، فرخ، سچ وغیرہ کو ان کی ماؤں نے آوازیں دیں۔ جنرل آؤٹنگ تھا پھر کیوں نہیں چلا؟



”کوئی تو جزیرہ چلائے۔“ ہر طرف لڑا ہٹ بھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔  
لڑکے بھاگ کر برآمدے میں آئے اور سچے جلدی سے آگے بڑھ کر جزیرہ چلانے کی کوشش کی مگر اس کا جن مردہ ہزارا۔  
ایک بھلے فنکشن میں بد مزگی سی ہو گئی۔ ہر طرف بے چینی اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر میز پر ایک عثمانی موبائل کی تاریخ بنگار رہی تھی۔  
”پتا نہیں اب انہیں چل رہا۔“ داور بھائی نے دو چار دفعہ کوشش کی، مگر بے سود۔ وہ ہاتھ جوڑ کر یوں سیکتے ہوئے کھڑے ہوئے۔

ابا اور تایا فرقان بھی برآمدے کے ستونوں کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ حیا کی میز جو تکہ برآمدے سے بہت قریب تھی، سو وہ گردن موڑ کر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔  
”جاؤ، مکینک کو بلا کر لاؤ یا دوسرے جزیرہ کا بندوبست کرو۔ جلدی۔“ تایا فرقان رہی سے ڈانٹتے اپنے بیٹوں کو دوڑا رہے تھے۔ کوئی ادھر بھاگا تو کوئی ادھر۔ ہر طرف ایک شرمندگی اور بے زاری پھیل گئی تھی۔

وہ ایک کسبی میز پر نکائے، ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے، گردن ترچھی کر کے برآمدے کو دیکھے گئی، جہاں مدھم مدھم روشنی میں رکھا جزیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ قریب ہی تایا فرقان اور سلیمان صاحب کھڑے قدرے متاسف سے آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔

دفعۃً وہ ذرا چوکی۔ اس نے جہاں کو برآمدے کے زینے چڑھتے ہوئے دیکھا۔ تایا فرقان اور ابا نے اسے نہیں دیکھا تھا، وہ آپس میں مصروف تھے۔  
وہ خاموشی سے آستینیں مزید پیچھے موڑتے ہوئے آگے بڑھا اور جزیرہ کے سامنے ایک بچہ اور ایک گھٹنے کے بل بیٹھا۔ نچلا بوائے انتوں سے دبائے، وہ اب گردن جھک کر جائزہ لینے لگا تھا۔

پھر سر اٹھایا اور مبتلا شہی نگاہوں سے ادھر ادھر

دیکھا۔ پھر قریب سے افرا تفری کے عالم میں گزرتی ٹانگوں نے آواز دی وہ ٹھنک کر رکی۔ اس نے کچھ کماتو وہ ذرا حیرت سے سر ہلاتی واپس اندر چلی گئی۔ لکھوں بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس نے چھری، پیچ کس اور ایسی چند چیزیں لا کر اس کے ساتھ رکھیں اور پھر خود بھی وہیں کھڑی ہو گئی۔

وہ جزیرہ کو آتارنے لگا۔ تب ہی تایا فرقان کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ چونکے۔ وہ بغیر اپنے کرتے کی پروا کیے، زمین پر بیٹھا جزیرہ میں ہاتھ ڈال کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ تایا فرقان کی نگاہوں کے تعاقب میں سلیمان صاحب نے بھی اس طرف دیکھا۔

”فیول والوں میں کچھ پھنس گیا ہے، ابھی صاف ہو جائے گا۔“ اس کی آواز مدھم مدھم سی حیا تک پہنچی تھی۔ شا بہت حیرت، بہت متاثر سی اس کے ساتھ کھڑی اس کو کام کرتے دیکھ رہی تھی جو بالکل کسی ماہر مکینک کے انداز میں بہت مہارت سے تاریں ادھر ادھر کر رہا تھا۔

چونکہ ہر سواند میرا تھا اور روشنی صرف برآمدے میں تھی، سو برآمدے کا منظر سارے منظر پر چھانے لگا۔ لڑکیاں اور رشتہ دار خواتین مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ ساحل پر چھائی بے چینی ذرا کم ہوئی۔

اس نے کور واپس ڈالا۔ اس کے ہاتھوں پر کالک لگ گئی تھی۔ پھر اس نے جزیرہ کا لیور کھینچا اور پیچھے کو ہٹا تو ساتھ ہی ایک جہماکے سے ساری بتیاں روشن ہو گئیں۔ اتنی تیز روشنی سے حیا کی آنکھیں لمحے بھر کو چند لمحوں میں اس نے بے اختیار انہیں پیچ کر دھیرے دھیرے ہٹا دی۔

شاخوشی اور تشکر سے کچھ کہتے ہوئے چیزیں اٹھا رہی تھی۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ رہا تھا۔ ٹانے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کماتو وہ اسی سنجیدگی سے سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ شا بھاگ کر اس کے پیچھے گئی۔

سلیمان صاحب جو قدرے دم بخود سے دیکھ رہے تھے، ذرا سنبھل کر واپس مڑ گئے۔ وہ متاثر ہوئے تھے

اور وہ اس تاثر کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ حیا مسکرا ہٹ دبانے واپس سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ جس شخص نے اندھروں میں روشنیاں کھیری تھیں، اس سے سب ہی متاثر تھے۔ البتہ وہ جانتی تھی کہ ابا نے بھی یہ توقع نہیں کی ہوگی کہ جہاں یوں زمین پر بیٹھ کر جزیرہ کھولنے لگ جائے گا۔ اس کے دل میں ایک بے پایاں سا خچر جاگا۔ اس کی اور یقیناً، ٹانگی بھی خود ساختہ سی شکل اب کہیں نہیں تھی۔

مہمانوں کے لیے ریفریوشمنٹ بھی اور ان کے جانے کے بعد گھر والوں کے لیے کھانے کا انتظام تھا۔ جب مہمان چلے گئے اور صرف وہی اپنے لوگ رہ گئے تو لان میں خواتین کا کھانا لگا دیا گیا جبکہ مردوں کا انتظام اندر تھا۔ مرد حضرات اور لڑکے وغیرہ اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ لان خالی خالی سا ہو گیا تھا۔

وہ پانچوں کزنز اب اسٹیج پر چھوٹے اور ساتھ رکھی کر سیوں پر آ بیٹھی تھیں۔ موش ٹھوڑی دیر بیٹھی، پھر ”میں اب آرام کروں گی“ کہہ کر کزانت سے اپنا فراک سنبھالے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

”جہاں بھائی تو بڑے کمال کے ہیں۔“ شا اپنی بھینز اتار کر دھتے پیروں کو ہاتھ سے سہلا رہی تھی۔ ”میں نے تو ان سے کہہ بھی دیا کہ جہاں بھائی! میں نے آپ کو پاس کر دیا۔“ پہلے تو حیران ہوئے پھر نرس بڑے سچ چیا آئی، آپ کے فیانی ہیں بڑے اسارٹ۔“

”اچھا۔“ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔  
”ان فیانی صاحب کو تو شاید خود بھی اپنی مقننی کا علم نہیں ہے۔ سلوک دیکھا ہے ان کا حیا کے ساتھ؟“  
ارم جو قدرے بے زار سی بیٹھی تھی، تنگ کر بولی، ”مرد جب سچ بھائی مکینک کو لا رہے تھے تو کیا ضرورت تھی بھرے مجمع میں الیکٹریشن بننے کی؟ لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے، ترکی سے یہی سیکھ کر آئے ہیں۔“

ٹانکے تو ٹکڑوں پر لگی، سر پر بھیجی۔  
”ارم آئی! بات سنیں، سچ بھائی کو الیکٹریشن لانے

میں پون گھنٹہ تو لگی ہی جانتا تھا، جبکہ جہاں بھائی نے چھ سات منٹ میں سارا مسئلہ حل کر دیا اور رات کی کیا بات ہے لوگ تو امپریس ہی ہوئے ہوں گے۔“  
”ہاں، بہت امپریس ہوئے ہوں گے کہ ہمارا ٹرکس کزن باورچی ہونے کے ساتھ ساتھ مکینک بھی ہے، ارم بڑے مسخرے ہنس کر اٹھ گئی۔ ٹانے غصے بھری نگاہوں سے گردن موڑ کر اسے جالتے دیکھا۔  
”ارم آئی! بھی نا، ہر وقت مرچیں ہی چباتی رہتی ہیں۔“

”اچھا جانے دو۔ اس کی تو عادت ہے۔ تم مجھے آج کی پکچر دکھاؤ، اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔“ اس نے کماتو شا سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی اندر آئی تھیں۔

لاؤنج میں سارے مرد حضرات بیٹھے تھے۔ جہاں بھی ادھر ہی تھا۔ ایک سنگل صوفے پر بے پشاور غور سے داور بھائی کی باتیں سن رہا تھا جو وہ اپنے مخصوص انداز میں با آواز بلند کہہ رہے تھے۔ وہ دونوں تیز تیز چلتی لاؤنج کے سرے پر بنے دروازے تک آئیں۔ وہ باہر کھڑی رہ گئی، جبکہ ٹانے دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر بھاٹکا۔ وہ موش کا کمرہ تھا، جس کے اندر شا کا کیرا رکھا تھا۔ ٹائٹ بلب کی مدھم روشنی میں بیڈ پر لیٹی، آنکھوں پر پانڈو کے موش نظر آ رہی تھی۔ ٹاؤبے قدموں اندر گئی اور ڈرننگ ٹیبل سے کیرا اٹھایا۔  
”آہٹ! موش نے بازو ٹپایا۔  
”کیا ہے شا! سوئے دونا چھے۔“ وہ تنگ کر بولی۔  
”سوری آئی! بس جاری ہوں۔“ شا کیرا اٹھا کر جلدی سے باہر آئی اور دروازہ بند کیا۔

”ایک تو موش آئی بھی نا۔“ وہ ذرا خفگی سے کہتی اس کے ساتھ چکن کی جانب بڑھ گئی۔ ایک دفعہ پھر لاؤنج سے گزر کر وہ دونوں چکن میں آئی تھیں اور حیا جانتی تھی کہ وہ نامیک اپ کے بھی اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اس کے بہت سے کزنز نے نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا، البتہ وہ ویسے ہی داور



بھائی کی جانب متوجہ تھا۔

وہ دونوں اب بچن میں کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑی  
ٹاکے ہاتھ میں پکڑے کمرے کی چمکتی اسکرین پہ  
گزرتی تصویر دیکھ رہی تھیں۔ جنہیں ٹاکوٹھ سے  
بن دیالی آگے کرتی جا رہی تھی۔ تب ہی دھاڑ سے  
دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز آئی۔ ان دونوں نے  
چونک کر سر اٹھایا۔

”داور بھائی! یہ کیا تماشا ہے؟“ وہ ضبط کھو کر چلانے  
والی مہوش تھی۔

لحے بھر کو تو وہ دونوں ساکت رہ گئیں، پھر ایک دم  
سے دوڑ کر چوٹ میں آکھڑی ہو گئیں۔

لاؤنج میں جیسے سب کو ساپ سوکھ گیا تھا۔ سب  
ششدر سے مہوش کو دیکھ رہے تھے جو اپنے کمرے  
کے دروازے کے آگے کھڑی کمر پہ ہاتھ رکھے چلا رہی  
تھی۔

”یہ کون سی جگہ ہے تقریریں کرنے کی؟ کسی کو میرا  
احساس ہی نہیں ہے کہ میں نے آرام بھی کرنا ہے،  
کل سارا دن میرا لپار میں گزرے گا، مگر آپ تو میرے  
سر پہ جی رہے ہیں۔ آپ کو آہستہ بولنا نہیں آتا؟ حد  
ہو گئی۔“ وہ چیخ کر واپس مڑی اور اپنے پیچھے اسی دھاڑ  
سے دروازہ بند کیا۔

لاؤنج میں یک دم موت کا سناٹا چھایا تھا سب کو جھٹکا  
لگا تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ پھر ایک دم سے جھان اٹھا۔

”داور! فرخ! انجھے کھڑا پکڑو کہ گے یا میں تم میں  
سے کسی کی کار لے جاؤں؟“

وہ تنے ہوئے نفوش کے ساتھ بہت قطعیت سے

پوچھ رہا تھا۔ اس کے سوال پہ سلیمان صاحب، تایا  
فرقان اور ان کے بیٹوں بیٹے ایک جھٹکے سے اٹھے وہ  
جواب سننے کے لیے نہیں رک۔ تیزی سے بیرونی  
دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ سب اس کی معیت میں  
باہر نکل گئے۔ ذرا پریشان سے زائد چچا اور رضا بھی ان  
کے پیچھے لپکے۔

”مہوش آئی۔ آئی کانٹ بلو دوس!“ ٹانے بے  
جد خیر سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی  
تھیں۔ جانے افسوس سے اسے دیکھا اور پھر خالی  
بڑے لاؤنج کو۔

”ابالوگ بہت غصے میں گئے ہیں، مجھے لگتا ہے وہ  
ہمیں چلے گا کہیں گے۔“ اسی بل اس کا فون بجنے لگا۔  
اس نے موبائل سامنے کیا۔ ”ابالوگ“ باہر پہنچنے کا  
بلاوا آگیا تھا۔

”سوری ٹا!“ اس نے بے بسی سے شانے اچکائے،  
پھر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”کل شادی کے فٹکشن تک سب کا غصہ اتر چکا  
ہو گا۔ فکر نہ کرنا اچھا!“ کمرہ کدہ تیزی سے باہر لپکی۔

\*\*\*

سب سوئے جا چکے تھے اور وہ اپنے کمرے میں  
آئینے کے سامنے کھڑی پرانے کوالٹ پلٹ کر دیکھ  
رہی تھی۔ سونیا نے کافی سخت باندھا تھا مگر کھل کے  
ہی نہیں دے رہی تھی۔ بالا خر پرانہ چھوڑ کر اس نے  
پیشانی پہ جھولنے ٹیکے کو۔ کھینچنے کے لیے جھوٹی تھا  
کہ دروازہ سے دستک ہوئی۔

اس نے ٹپکا چھوڑا اور پھر حیرت سے دروازے کو  
دیکھتی اس تک آئی۔ اہل! ”ابالو تو سوئے چلے گئے تھے، پھر

اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے جہان کھڑا تھا۔  
”سوری! تم سو تو نہیں گئی تھیں؟“ وہ قدرے

جھجک کر بولا۔ سیاہ ٹراؤزر کے اوپر آومی آستین والی  
سفیدی شرٹ پہنے ہوئی ترکی والا جہان لگ رہا تھا۔

”نہیں تم بہتاؤ خیریت؟“  
”ہاں! ابھی میں لاؤنج میں بیٹھا تھا تو وہ فرقان ماموں  
کی بیٹی آئی تھی۔“

”ارم؟“ اس نے ذرا حیرت سے سوالیہ ابرو اٹھائی۔  
”ہاں وہی۔ تمہارا فون اور پرس میز پہ رکھا تھا اس  
نے فون اٹھا کر مجھ سے کہا کہ اسے ایک کال کرنی ہے،  
ابھی پانچ منٹ میں فون لا دے گی، مگر اب۔۔۔ اس

نے کھائی پہ بندھی کھڑی دیکھی۔“ اب بیس منٹ  
ہونے کو آئے ہیں کمرہ واپس نہیں آئی۔ میں نے سوچا  
تھیں بتا دوں۔“

”اف! تم نے اسے میرا فون کیوں لے جانے دیا؟“  
جواباً جہان نے بے چارگی سے شانے اچکائے۔

”اس نے مجھ سے اجازت نہیں مانگی تھی اور میں  
اسے کیسے روک سکتا تھا؟ مجھے تو فرقان ماموں کی فیملی  
سے ویسے ہی بہت ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔  
”کیونکہ وہ سرخ مرچ کا استعمال بہت زیادہ کرتے  
ہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا تو وہ بے اختیار ہنس  
دی اور یہ ترکی سے آنے کے بعد پہلی دفعہ تھا جب وہ  
یوں پورے دل سے ہنسی تھی۔

”سرخ مرچ کا استعمال ہمیں بھی آتا ہے۔ تم ادھر  
ہی ٹھہرو، میں ذرا ارم سے فون لے آؤں۔“ اور آج تو  
وہی ہے ارم کی طرف اس کے بہت سے حساب اکٹھے  
ہو گئے تھے۔

”اچھا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ مسکرا کر کرتا  
صوفے پہ بیٹھ گیا اور وہ باہر چلی آئی۔

تایا فرقان کے لاؤنج میں سب ہی موجود تھے  
سوائے ارم اور سونیا کے۔ تایا اب بہت پرطال انداز سے  
نفی میں سر ہلاتے کچھ کہہ رہے تھے، شاید آج والے  
واقعے کا تذکرہ جب حیا کو آتے دیکھا۔

”او آؤ بیٹا۔“ انہوں نے مسکرا کر اپنے ساتھ  
صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر سونیا کو آواز دی۔  
”سونیا! اجائی چائے بھی لے آنا۔“

”جی! اچھا! سونیا نے جواباً کچن سے آواز لگائی۔  
”نہیں تایا! میں چائے نہیں پیوں گی، بس اب  
سوئے ہی جا رہی تھی۔“ وہ بے تکلفی سے کہتی تایا اب  
کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔

ان کی کھلی سیاستیں اور وقتی تندو تیکھی باتیں ایک  
طرف، تایا فرقان اس سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور

آج مہوش کی بد تمیزی پہ جہاں وہ دھکی تھے وہاں انہیں  
حیا کی قدر بھی آئی تھی۔  
”ابا سو گئے تمہارے؟“

”جی، کب کے۔ میں بس ذرا ارم سے فون لینے آئی  
تھی۔“

”فون، کیوں؟“ تایا ابابری طرح چونکے۔ صائمہ  
تائی بھی ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”ارم کو کوئی کال کرنی تھی تو وہ میرا فون لے کر گئی  
تھی، مگر ابھی مجھے اپنی فریڈ کو مسیج کرنا ہے، سو سوچا  
فون لے لوں۔“ وہ بہت سادگی سے کہہ رہی تھی۔

تایا کے چہرے کا رنگ فوراً ہی بدل گیا تھا۔ نرمی کی  
جگہ سختی نے لے لی۔

”ارم۔ ارم۔“ انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔  
”جی ابا!“ وہ دوڑتا سنبھلتی بھاگتی ہوئی آئی، مگر حیا کو  
بیٹھ دیکھ کر اس کا رنگ ایک دم سے فق ہوا۔

”حیا کا فون اسے واپس دو۔“ تایا نے اسے کڑی  
نگاہوں سے گھورتے ہوئے بڑے ضبط سے کہا۔

”جی۔۔۔ جی وہ فضا کو مسیج کرنا تھا تو۔۔۔“ وہ ہٹکا  
گئی۔ تایا اتنی شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھ رہے  
تھے کہ وہ رک نہیں۔ اٹے قدموں واپس مڑی اور چند  
ہی لمحوں بعد فون لا کر حیا کو تھمایا اور ساتھ ہی ایک کینہ  
توڑ نگاہ اس پہ ڈالی تھی، گویا کچا جانا چاہتی ہو۔ وہ

جواباً ”سادگی سے مسکرا دی۔  
”تھنک یو، میں چلتی ہوں، آپ لوگ چائے  
انجوائے کریں۔“ وہ فون لے کر وہاں سے اٹھ آئی اور  
وہ جانتی تھی کہ اب چائے انہوں نے خاک انجوائے  
کرنی تھی۔

واپس لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے موبائل کا  
log چیک کیا۔ مسیج اور کل لاگ بالکل کلیئر تھا۔  
سارا کل ریکارڈ غائب۔

”ارم کی پچی!“ اسے ارم پہ بے طرح سے غصہ  
آیا۔ کل ریکارڈز میں موجود تمام نمبرز اس کے پاس  
محفوظ ہی تھے، البتہ جب وہ ترک فون ریسٹورنٹ میں



چھوڑ آئی تھی، یوک ادا جانے سے قبل تو اس کے اسی پاکستانی موبائل پر عبدالرحمن پاشا کا فون آیا تھا۔ اس کا نمبر اس نے محفوظ نہیں کیا۔ وہ بس کل لاگ میں پڑا رہ گیا تھا۔ اب وہ مٹ گیا تھا۔ چلو خیر، اس نے کون سا کبھی اے آر پی کو کل کرتی تھی۔

جہاں صوفے پر اسی طرح بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیسے ملا؟ مرحلوں کے استعمال سے؟“ اس کی نگاہیں جیا کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر تھیں۔

”نہیں، جہاں شکر کے استعمال سے بات بن جائے، ہمدردی میں صانع نہیں کرتے۔“

”ویسے پاکستان کے لوگ دل کے بہت ہی اچھے ہیں۔ ایک کرنز بغیر پوچھے فون اٹھا لیتی ہے، ایک بہت عزت سے بغیر کھانا کھائے گھر سے نکالتی ہے، اور ایک کھانا بھی نہیں پوچھتی۔“

”وہ خدا بلا!“ اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ”تم نے کھانا نہیں کھایا؟“

”کہاں کھانا؟ وہاں تو ابھی لگا ہی نہیں تھا اور یہاں گھر کی دونوں خواتین نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بھاگ کر جلدی سے پین کی طرف آئی اور فریخ کھولا۔

”آج وہاں کھانا تھا تو کچھ بنایا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں رات کا سالن اگلے دن کوئی نہیں کھاتا۔ چھو! میں انڈے بناتی ہوں۔“ اسے یاد آیا۔ کھانا تو اس نے بھی نہیں کھایا تھا مگر اسے اتنی بھوک نہیں تھی۔ انڈوں کا خانہ کھولا تو اندر دو ہی انڈے رکھے تھے۔ اسے بے پناہ شرمندگی ہوئی۔

”ان دو انڈوں سے تو کچھ بھی نہیں بنے گا۔“ اس نے غصے سے کہتے ہوئے فریخ کا دروازہ بند کیا۔

جہاں نے جیسے اس پر افسوس کرتے ہوئے سر نہی میں ہلایا۔

”تمہیں شاید بھول گیا ہے کہ تم استنبول کے بہترین شیفس میں سے ایک سے بات کر رہی ہو۔

آرام سے بیٹھ جاؤ ادھر کرسی پر۔۔۔ میں خود ہاتھوں کا سب کچھ۔“

اس نے اپنا سلور اسمارٹ فون میز پر رکھا اور پھر آگے بڑھ کر فریخ، فریزر، کمینیسٹس، ہر چیز کھول کھول کر اٹھا بلایا ہر نکلنے لگا۔ فرزون قیہم، پاستا کا پیکٹ، جے مغزوں کا لفافہ، سائز، سبز یوں کے خانے سے چند سبزیاں جن لیں۔ وہ تمام چیزیں کاؤنٹر پر جمع کر تاجا رہا تھا۔

”تم اس وقت پاستا بناؤ گے؟“ وہ متعجب ہی کرسی پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سبز فراک پر اندے اور نیلے سمیت بیٹھی تھی اور اسے پکڑے تبدیل کرنا بالکل بھول گیا تھا۔

”ہاں اور مجھے کوکنگ کے درمیان ٹوکنا مت۔ میں بہت برا ہوتا ہوں۔“ مسکراتے ہوئے وہ سبزیاں دھو رہا تھا۔ ”اور تمہارا بخار کیسا ہے؟“

”اب ٹھیک ہے۔“ اس نے خود ہی اپنا ہاتھ چھوا۔ وہ کل کی نسبت قدرے ٹھنڈا تھا۔

”ویسے مجھے حیرت زائد ماموں اور ان کے بیٹے پر ہے۔ اس لڑکی نے اتنی بد تمیزی کی اور انہوں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ واقفانہ حیرت سے کتابت سبزیاں کنگ بورڈ پر رکھ کر کھانا کھٹ کٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

”اس کی ایک دن کے بعد رخصتی ہے، شاید وہ اس کا دل برا نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”مگر اس نے بہت مس بلی ہو کیا۔“ وہ افسوس سے کتابتانی اپنے کے لیے رکھ رہا تھا۔ دوسری جانب اس نے فرانتک پین میں ذرا سائیل گرم ہونے رکھ رکھا تھا۔

”اصل میں اس کے فیا کسی نے کسی کینیڈین رینیلمی شومیں ایک ڈیڑھ ملین ڈالر جیتے ہیں، اسی پر اس کا مبلغ ساتویں آسمان پر ہے اور وہ زمین پر بغیر دماغ کے گھوم رہی ہے۔“ وہ نیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی بتا رہی تھی۔

”کینیڈین شومیں ڈیڑھ ملین ڈالر؟ بہت اچھی کور اسٹوری ہے۔“ اس نے ذرا سائیل کر سر جھٹکا۔ ساتھ ہی وہ فرانتک پین میں فرانی ہوتی سبز یوں کو بجائے تفکیر سے ہلانے کے، فرانتک پین کا ہینڈل پکڑے دائیں بائیں تو سمجھی اوپر نیچے ہلا رہا تھا۔ سبزیاں چند انچ اوپر کو اڑتیں اور پھر واپس پین میں آگرتیں۔

”کیا مطلب؟“ اس نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”اگر کسی پاکستانی نے کینیڈین شومیں اتنی خطیر رقم جیتی ہوتی تو میڈیا پر ہر جگہ آچکا ہوتا۔ مجھے تو وہ لڑکا شکل سے ہی کمرشل لگ رہا تھا۔ تاہم تازہ آنی بلیک منی کو ادائت کرنے کے لیے کو رہنایا ہے اور کیا۔“

”اچھا!“ اسے تعجب ہوا۔ اس سچ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، البتہ کمرشل سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

”جہاں! تمہارے ریسٹورنٹ پر جو حملہ ہوا تھا اس کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“ وہ گردن ترچھی کیے ساس کی بوتل پین میں انڈیل رہا تھا۔ ”حالانکہ میری استنبول میں کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ قوی امکان ہے کہ کسی اور کے دھوکے میں ان لوگوں نے میرا ریسٹورنٹ الٹ دیا۔“

ایک دشمنی تو خیر اب اس کی بن چکی تھی، مگر وہ تو خود بھی اس سے واقف نہیں تھا۔

”تم تو کہتے تھے کہ استنبول میں ایسا کوئی کرائم سین نہیں ہے؟“

”خیر، اب اتنے بھی برے حالات نہیں ہیں اور ڈارک سائیز تو ہر بڑے شہر کی ہوتی ہے۔“

وہ چولے کے سامنے کھڑا اس کی طرف پشت کیے، پین میں قیہم بھون رہا تھا۔ نیچے اور شملہ مرچ کی بھیننی بھیننی اشتہا انگیزی مسک سارے میں پھیلنے لگی تھی۔ اس کی گم گشتہ بھوک ایک دم سے جاگ اٹھی۔

”تمہیں پاکستان آکر کیا لگا جہاں!“ وہ ٹھوڑی تلے مٹھی رکھے اسے دیکھتی سادگی سے بوجھنے لگی۔ یہاں آنے کے بعد ان کی پہلی باضابطہ گفتگو تھی۔

”اچھا لگا بلکہ بہت اچھا لگا، مگر فرقان ماموں کی باتیں

میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے رشتے دار اتنی ٹیکھی باتیں بھی کر لیتے ہوں گے۔“ اس نے جیسے بھر جھری لے کر سر جھٹکا۔ آج وہ سارا دن تایا فرقان کی کپنی میں رہا تھا تو یہ رد عمل فطری تھا۔

”وہ اتنے ٹیکھے نہیں ہیں، اور بہت پیار کرتے ہیں ہم لوگوں سے، پس ان کے اپنے نظریات ہیں جو اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی ان پر پورا نہ اترے تو وہ اس کی گریڈنگ بہت نیچے کر دیتے ہیں۔“

”واٹ اپور!“ وہ اب اہل پاستا کے قیلے میں قیہم اور ساس انڈیل رہا تھا۔ پھر ان کو اچھی طرح کس کر کے اس نے اسے دم پر رکھ دیا اور سنگ کی ٹوٹی کھول کر ہاتھ دھونے لگا۔ وہ سمجھی اب وہ اس کے پاس آکر بیٹھے گا، مگر وہ ہاتھ دھو کر اب سارا پھیلاوا اٹھینے لگا تھا۔ جھوٹے برتن، سبز یوں کے چھلکے، خالی شاپ۔ وہ جلدی سے اٹھی۔

”میں کروتی ہوں۔“

”پلیز تم بھی رہو، جتنی پھوڑ تم ہو، میں جانتا ہوں۔ اگر تم نے میری مدد کرانی تو تو نے کھٹے لگ جائیں گے، جبکہ میں اکیلا کروں تو دو منٹ میں ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، خود ہی کرو۔“ وہ قدرے خشکی سے کہتی دوبارہ بیٹھ گئی۔

اور واقعی اس نے دو تین منٹ میں ہر چیز اپنی جگہ پر رکھ دی۔ چند ایک برتن چونکانے کے دوران میلے ہوئے تھے، وہ دھل کر اسٹینڈ میں لگ گئے اور سلیب چمکا دیے گئے۔ وہ بندہ مکمل کا تھا۔

”تم کب سے ریسٹورنٹ چلا رہے ہو؟“

”اب تو بہت عرصہ ہو گیا۔ اچھا۔ میں برتن لگاتا ہوں، تم سلیمان ماموں کو بلا لاؤ، انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔“

”ارے ہاں!“ وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی اٹھی، پھر نگاہ اس کے سلور اسمارٹ فون پر پڑی جو میز پر رکھا تھا۔

”تمہیں پتا ہے، ڈی جے کو تمہارا فون بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ جہاں سے کہنا، جب اپنا یہ دو



دھاتی لاکھ کافون پھینکتا ہوتا سہانگی کے باہری پھینکے۔  
وہ اداسی سے مسکرا کر بولی تو وہ ہنس دیا۔  
”ویسے یہ اس کے لگائے گئے جینے سے کیس زیادہ  
منگاہے۔“  
”اچھا۔“ اسے ذرا حیرت ہوئی۔ ”اتنا قیمتی فون  
کیوں خریداتے ہیں؟“  
”خرید انہیں تھا گفت ملا تھا۔ اس پیش گفت!“ وہ  
مسکرا کر جیسے کچھ یاد کر کے بولا۔  
”کس نے دیا تھا؟“

”سم دن اسپیکل! اچھا جاؤ۔ ابھی ماموں کو بلا لاؤ!“  
وہ ٹال گیا تو وہ شائے اچکانی وہاں سے چلی آئی۔ ابا کا  
دروازہ بجا کر وہیں سے بلا کر وہاں لاؤنچ میں آئی تو وہ  
وہاں میز پر بیٹھیں اور گلاس رکھ رہا تھا۔ وہ بڑے صوفے  
پر بیٹھی اور ریوٹ اٹھا کر بولی چلا دیا۔  
جس وقت ابذا حیران سے باہر آئے، جہان پاستا کی  
ڈش اٹھائے کچن سے نکل رہا تھا اور وہ مزے سے اپنے  
کام دار جوڑے میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی چھینٹ  
بدل رہی تھی۔  
”ابا!“ ان کو دیکھ کر جلدی سے اٹھی اور جہان کے  
ہاتھ سے ٹرے لی۔

”سوری ماموں! ہم نے آپ کو اٹھایا۔ آپ نے  
کھانا نہیں کھایا تھا سو۔۔۔“ وہ اور اچھوڑ کر اس  
نے ان کی طرف پلٹ کر بڑھائی۔  
”تھینک یو۔“ ابا نے قدرے نا سبھی سے کھانے  
کو دیکھا اور پھر حیا کو۔ ”یہ تم نے بنایا ہے؟“  
”نہیں، جہان نے!“ وہ مسکرا ہٹ گیا۔  
”ویسے ماموں! یہ اٹالین دسبھی نہیں ہے، ذرا  
دسی اسٹائل میں بنایا ہے جیسے می بناتی ہیں، آپ کو  
پاستا میں قیصر پسند ہے نا، مٹی نے تیار کیا تھا۔“  
سلیمان صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس کو  
دل توڑنے کافون آتا تھا تو ٹوٹے ہوئے دلوں کو دوبارہ  
سے جوڑ کر انہیں جیتنے کافون بھی آتا تھا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ  
وہ روف اور لف سا بندہ تو بھوکا بھی سو جا تا مگر رات کے

ایک بجے اگر ۱۔ نے اتنا اہتمام کیا تھا تو صرف اور  
صرف ابا کے لیے، کیونکہ اسے یاد تھا کہ ابا نے کھانا  
نہیں کھایا اور اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سے  
ذرا گھٹے گھٹے رہتے ہیں۔ اور حیا کو خواب یاد آیا  
تھا کہ قیصر والا پاستا ابا کا پسندیدہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس  
عمل سے جہان نے اپنے اور ابا کے درمیان حائل  
برف کو پکھلانے کی کوشش کی تھی۔

پاستا بہت مزے کا تھا۔ منہ میں جاتے ہی گھل  
جاتے والا۔ سلیمان صاحب نے تعریف نہیں کی مگر  
ان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ انہیں اپنا یوں خیال کیا  
جانا اچھا لگا تھا۔ وہ خود بھی بہت شوق سے کھا رہی تھی۔  
ڈی جے کے بعد یہ پہلا کھانا تھا جو اس نے دل سے  
کھایا تھا۔

”کوئی مینس دو لڑکیوں کا اغوا۔“  
ٹی وی اسکرین پر بی بی سی چل رہا تھا، اور جو خبر نیوز  
کاسٹر نے پڑھی، اس پر ان تینوں نے چونک کر سر  
اٹھایا۔ کوئی تری کا شہر تھا۔  
جہان نے بجلی کی تیزی سے ریوٹ اٹھایا اور چینل  
بدل دیا۔

”کیا کہا اس نے۔۔۔ کوئی؟“ ابا جو ہاتھ روک کر  
اسکرین کو دیکھنے لگے تھے چینل تبدیل ہونے پر الجھ کر  
جہان کو دیکھنا سواری سے مسکرایا۔

”نہیں، کوئی نہیں، اس نے کہا تھا کینیڈا۔۔۔ اور لیں نا!“  
وہ ریوٹ ایک طرف رکھ کر انہیں پھر سے سرو  
کرنے لگا۔ ابا نے ذرا تذبذب سے سر ہلایا، گویا وہ اپنی  
سماعت کے دھوکا دینے پر الجھے ہوئے تھے۔ حیا نے  
جہان کو دیکھا اور جہان نے اسے پھر دونوں زیر لب  
مسکرا دیے۔

ابھی وہ ابا کے سامنے ترکی کا میج سیو تازہ ہوتا دیکھنے  
کے متحمل نہیں تھے۔



بارت کے لیے وہ مین ہال کی جانب رواں دواں  
تھے، ابذا راہو کر رہے تھے اور آج وہ خاموش نہیں تھے

بلکہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے جہان کو سڑک کے اطراف  
میں گزرتی جگہوں کے بارے میں مختصر فقرہوں میں  
آگاہی دے رہے تھے۔ وہ بھی جواباً کوئی مختصر سا  
جواب دے دیتا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی کم گو تھا جتنا دو روز  
قبل تھا، مگر وہ برف کی دیوار پکھل گئی تھی۔  
وہ پچھلی نشست پر بیٹھی لاٹھلی سی باہر دیکھ رہی  
تھی۔ اسے ڈی جے کے بغیر یوں ان خوشی کی تقارب  
میں شرکت کرنا سخت برا لگ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر  
احساس جرم کا ڈھار تھی۔ ابھی اسے پچھڑے دن ہی  
کتنے ہوئے تھے مگر مجبوری تھی۔ جانا تو تھا۔ وہ آج بھی  
خاص تیار نہیں ہوئی تھی۔

کاجل اور پچھل لب اسٹک کے علاوہ کوئی میک اپ  
نہیں کیا، بال یونی کھلے چھوڑ دیے۔ جیوری بھی  
نہیں پہنی۔ ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس کی کبھی  
ٹخنوں سے بالشت بھر لوچی قیص کے گلے یہ کافی کام  
تھا۔ وہ شیفون کی قمیص پہنی، اور اس کا رنگ آلو  
بخارے کے پھلے کا سا تھا۔ قیص کا گلا گردن تک بند  
تھا اور گردن سے لے کر وہ بالشت نیچے تک سیاہ اور آلو  
بخارے کے رنگ کے چھوٹے بڑے ہر ساز کے  
Diamonties (نگ) لگے تھے۔ ان کی جھلکا ہٹ  
بہت خوب صورت تھی۔ نیچے ہم رنگ سلک کا پاجامہ  
تھا اور آستینیں کلاسیوں تک آلی چوڑی دار تھیں۔  
لیکن آج بھی اسے کل کی طرح اپنے لباس کی خوب  
صورتی سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

میرج ہال کے باہر بارات ابھی ابھی اتری تھی۔  
داخلی دروازے پر خاصا رش تھا۔ سنی سنوری، زیورات  
قیمتی ملبوسات اور خوشبوؤں میں رچی بسی لڑکیاں اور  
خواتین گاڑیوں سے نکل کر اپنے بل اور میک اپ  
ٹھیک کرتی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ رضا  
اور زاہد چچا وہاں کھڑے خوش اخلاقی سے مسکراتے  
مہمانوں کو دیکھ کر رہے تھے۔ اسے پتا تھا کہ موش کی  
کل والی بات کو آج بھلا کر سب شادی میں شرکت  
کریں گے اور واقعی یہ ہو رہا تھا۔

کارر کئے پر اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہیل باہر

مشہور و مزاح نگار اور شاعر  
انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین  
آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب گانام قیمت

450/-	سفرنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفرنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفرنامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفرنامہ	چلتے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفرنامہ	مغربی مہر اسافر
225/-	طہر و مزاح	خدا گندم
225/-	طہر و مزاح	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس بستی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاندگر
225/-	مجموعہ کلام	دل دشتی
200/-	ایڈیٹر این این انشاء	انہما کتواں
120/-	ادبیری این این انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طہر و مزاح	باتیں انشاء جی کی
400/-	طہر و مزاح	آپ سے کیا پردہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37، اردو بازار، کراچی



پھر بی زمین پہ رکھی۔ بے اختیار اسے اپنی ٹوٹی ہوئی سرخ بیل یاد آئی۔ سر جھٹک کر وہ باہر نکلے اور برس سنبھالے ہوئے دروازہ بند کیا۔ لیا، جہاں اور ماں ایک ساتھ مین جہال کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے اور وہ بھی وہیں چلی جاتی اگر جو اس کے پاؤں پہ وہ پھر آکر نہ لگتا۔

”اوج!“ اس نے کراہ کر پھر بٹایا۔ وہ بجری کا چھوٹا سا نکلا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ مخالف سمت سے آیا تھا، جہاں پارکنگ میں گاڑیاں کھڑی تھیں اور کسی نے بہت ناگ کر اسے مارا تھا۔ ان گزرے تین چار ماہ میں اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ اتفاقات نہیں ہوتے تھے۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے اس سمت دیکھا اور پھر ٹھہری گئی۔ پارکنگ کے پیچھے سے ایک ہیولا سا نکلا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ چند لمحوں میں وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔ رات کی تاریکی میں پارکنگ ایریا کو اونچے پولیٹری زردیٹوں نے مدھم مدھم روشنی بخش رکھی تھی۔ اس روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا یا دے رہی تھی۔

بھڑکتا ہوا نیلا زرد تارو پٹا، ہم رنگ جوڑے کے اوپر پہنے ہوئے کپڑے چہرے پر ذرا سا ڈالے اسے دانتوں سے یوں پکڑے ہوئے تھا کہ دور سے اس پر کسی عورت کا گمان ہوتا تھا۔ چہرے کو سفید پینٹ کیے، گہرے آئی میک اپ، سرخ چونچ سی لپ اسٹک اور سنہرے بالوں کی دو لگائے، وہ اس کی طرف چلتا آ رہا تھا۔ وہ اسے ایک نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔

”پنکی!“ اس نے ہر اسال نگاہوں سے گردن موڑ کر دور ہال کی طرف کو دیکھا۔ ابائی اس کی جانب پشت تھی۔ وہ واپس ٹیٹب تک وہ قریب آچکا تھا۔

”کیسی ہو باجی جی؟“ وہ مسکرایا تھا۔

”تم۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے سرا سہمی سے اسے دیکھتے اپنے پرس پہ گرفت مضبوط کر لی گویا ذرا بھی وہ آگے بڑھا تو وہ بھاگ اٹھے گی۔

”آپ سے ملنے آئی تھی جی! پنکی کہتے ہیں مجھے۔ یاد ہے جی؟“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اچھی طرح یاد ہے اور معمولی تو تمہاری ماں اور بہن بھی نہیں ہوں گی! اب ہٹو میرے راستے سے“

”غصہ کیوں کر رہی ہو جی! میں تو آپ کو کچھ بتانے آئی تھی۔“

”ماں! فٹ! مسئلہ کیا ہے آپ کو؟ مگر احمد؟“ وہ پیر پیر کر بولی۔

”اتنے باوقار عہدے پہ فائز ہو کر کیسی حرکتیں کر رہے ہیں آپ؟“

”ٹوٹی۔۔۔ میں تو ڈولی کا پیغام دینے آئی تھی مگر۔۔۔“

”کیا پیغام؟“ وہ اسی رکھائی سے بولی۔

”ڈولی کی حالت امید بخش نہیں ہے، پتا نہیں کتنے دن جی پائے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ وہ ذرا چونکی۔

”ادھر ہسپتال میں ہے، خود چل کر دیکھ لیجیے۔“

”آئیے! میں آپ کو لے جاتی ہوں۔“

”نہیں نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

”ایک دفعہ تو اس سے مل لیں اس نے کچھ بتانا ہے آپ کو۔“

”مجھے کچھ نہیں جانا۔ تم لوگوں کی ساری معلومات مجھے اے آر پی کی ماں سے مل گئی تھیں۔“ تنگی سے کہتے ہوئے اس نے پھر سے پلٹ کر دیکھا۔ بات کے مہمان اندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

”ہو سکتا ہے کچھ ایسا ہو جو اس کی ماں کو بھی نہ پتا ہو۔“

”کیا؟“ وہ چونکی، پھر بغور پنکی کو دیکھا۔ اس کے اونچے قد کے سوا کوئی چیز اس روز جنٹل سپر کی شاپ میں ملنے والے اس اسٹارٹ ٹھاسروالے نوجوان کا پتا نہیں دیتی تھی۔ پنکی کا تو چہرہ بھی جلا ہوا نہیں لگتا تھا مگر نہیں۔ اس کا چہرہ تو سلیٹ کی طرح چپٹا تھا۔ ایسی جھلی جس نے سب نقش چھاپ دیے ہوں۔ خدا یا! کیسے یہ لوگ اپنے چہرے بدل لیتے تھے۔ مگر آنکھیں پسند نہ ہو چکی یہ

آنکھیں وہی تھیں۔ وہی گلاسز کے پیچھے سے جھلکتی آنکھیں۔ اب ان کی شینڈو کی چمکیلی تہہ کے باوجود وہ انہیں پہچان گئی تھی۔

”اس بات کا جواب تو بس ڈولی کے پاس ہے جی اور اس نے مجھے یہی آپ کو بتانے کا کہا تھا۔“ سلیٹ کی دوستی نبھا رہی ہوں میں تو جی! اور نہ میری جوتی کو بھی شوق نہیں ہے آپ جیسی بد زبان خاتون کے منہ لگنے کا۔“

چڑ کر کہتے ہوئے اس نے دوپٹے کے اندر چھپے ہاتھ باہر نکالے۔ اس میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبہ تھا۔

”یہ ڈبہ نے بھیجا ہے۔ اسے اسی طریقے سے کھولے گا جو اس نے لکھا ہے، مگر جب تک آپ اسے کھول پائیں گی وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔“

جیانے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں پکڑے اس ڈبے کو دیکھا۔ اس کی کلائی پہ وہی کانٹے کا سرخ بھورا نشان تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے اچھٹے سے سر اٹھا کر پنکی کو دیکھا۔ وہ کہاں کھڑی ہے، اسے لمحے بھر کو بالکل بھول گیا تھا۔

”یہ ایک پہیلی سے کھلے گا، مگر یہ پہیلی صرف آپ ہی بوجھ سکتی ہیں اور آپ بوجھ ہی نہیں کی۔ یہ بہت آسان ہے، لیکن اس کے اندر موجود چیز نکالنے کے لیے اسے توڑنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اسے توڑ دیا تو وہ چیز آپ کے کام کی نہیں رہے گی۔“ پنکی نے مسکرا کر کہتے ہوئے ڈبہ اس کے مزید سامنے کیا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھام لیا۔

”اچھا باجی جی! رب راکھا۔“ وہ وہی خواجہ سراؤں والا لہجہ بنا کر لوٹا، سلام جھاڑ کر دوپٹا منہ پہ ڈالے پلٹ گیا۔

اس نے جلدی سے ڈبا پرس میں رکھا اور پیشانی پہ نمودار ہوئے سینے کے قطرے نشو سے تپتپتی اپنی خود کو کمپوز کرتی ہال کی جانب بڑھ گئی۔

بارات کا فنکشن دیر سائی تھا جیسا کسی بھی شاندار شادی کا ہونا چاہیے۔ ہفتہ نور بنا ہال، بہترین سجاوٹ،

دلہن کا قیمتی ڈیزائیز سوٹ اور جیولری، مہوش کی نصیاتی کزنز کے گروپ ڈانسز، اور ہر ٹکلف طہام کی اشتہا انگیز خوشبو جو ابھی کھلا نہیں تھا۔ آج بھی مرد و خواتین اکٹھے تھے مگر یوں کہ آدھے ہال میں مرد اور بانی آدھے کی میزوں پہ خواتین براجمان تھیں تاکہ ایک حد تک علیحدگی رہے۔ ان کی فیملی کی کسی بھی لڑکی نے رقص میں حصہ نہیں لیا مگر مہوش کی کزنز ہر طرف چھائی رہیں۔

وہ آج بھی ایک الگ تھلگ کونے والی میز پہ بیٹھی رہی۔ اس کا دل اس بچے جاکر مہوشی بنانے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا۔ اس شریفوں کے بچے نے اسے ایسا احساس عدم تحفظ بخشا تھا کہ وہ کسی بھی دوسرے کے کیمرے یا موبائل میں تصویر کھینچوانے سے احتیاط برت رہی تھی۔ یہ مہوش اور تصاویر کہاں کہاں نہیں کھومتی ہوں گی۔ اس نے بھر جھری لے کر سر جھٹکا۔

اتنے بڑے ہال میں کوئی بھی اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ ویسے بھی اس میز پہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے چند لمحے کے لیے سوچا، پھر میز پہ رکھے پرس سے وہ ڈبہ نکالا اور فانوس کی چکا چوند روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

وہ ایک ہاتھ جتنا لمبا اور پانچ انچ موٹا مستطیل ڈبہ تھا۔ ڈبہ نہ بہت بھاری تھا نہ بہت ہلکا۔ وہ گہری لکڑی کا بنا تھا اور اس کے ڈھکن کے علیحدہ ہونے کی جگہ پر چھ خانے بنے تھے جن کے اندر A لکھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک A پہ انگلی رکھ کر نیچے کو گزرا تو A نیچے چلا گیا اور B سامنے آ گیا۔ وہ اسے نیچے کرتی گئی۔ ان چھ خانوں میں پوری انگریزی کے حروف تہجی لکھے تھے۔ جیسے عموماً بریف کسز پہ نین ایسی اسٹریٹس لگی ہوتی ہیں جو تین زیرو پہ کھل جاتی ہیں، ویسے ہی اس باکس کو کھولنے کے لیے کوئی چھ حرفی لفظ سامنے لانا تھا۔

پنکی نے کہا تھا کہ اسے کھولنے کا طریقہ اس ڈبے پہ لکھا ہوا ہے۔ اس نے ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور



لحظہ بھر کو ٹھنھکی۔ اسے دھکن کی اوپری سطح پر کچھ کھدا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ چوڑے پہ چھکائے آنکھیں سکڑ کر دھنسنے لگی۔ وہ بہت باریک انگریزی میں لکھا ایک فقرہ تھا۔

"Into the same river  
no man can enter twice."  
(ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔)

اس نے الجھن بھرے انداز میں وہ فقرہ ہرایا۔ کیا یہی وہ پہلی تھی جس کا ذکر بنگی نے کیا تھا؟ مگر یہ پہلی تو نہیں لگتی تھی۔ اس میں تو کوئی سوال نہ تھا۔  
"السلام علیکم جیا!"

آواز پر اس نے کثرت کھا کر گردن اٹھائی اور ساتھ ہی گود میں رکھے دو ڈبے دو پٹاؤالا۔  
سامنے شہلا کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا کے اوپر گہرے سبز اسکارف کا نقاب اٹکیوں سے تھامے، اپنے انزلی نرم انداز میں مسکراتے ہوئے۔  
"وعلیکم السلام شہلا بھابھی! کسی ہیں آپ؟ آئیں بیٹھیں۔" وہ ذرا استنبھل کر اٹھی اور جلدی سے ڈبا پرس میں ڈال کر ان سے ملنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ مجھے علم نہیں تھا کہ تم آئی ہوئی ہو۔" وہ رسلان سے کبھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی۔ "پھر ابھی فاطمہ پھپھو نے تمہاری فرینڈ کا بتایا۔ ریلی سوری فار ہر۔"

ڈی جے کے ذکر پر اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ پھر سے افسردہ ہو گئی۔

"پتا نہیں شہلا بھابھی! اللہ تعالیٰ کی کیا مرضی تھی۔ میری ایک ہی دوست تھی ترکی میں اور وہ میری تمام دوستوں سے بڑھ کر ہو گئی تھی۔ بہت دعا کی میں نے اس کے لیے، مگر کوئی دعا قبول نہیں ہوئی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شگہہ یوں پہ آگیا۔

"اللہ تمہیں مبرورے نگہ ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ۔" شہلانے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ "سین آئی کا بیٹا بھی آیا ہے؟"

"جی وہ اوھر ہے۔" اس نے نگاہوں کا زاویہ موڑا تو شہلانے تعاقب میں دیکھا۔  
الٹیچ کے قریب وہ سلیمان صاحب کے ساتھ کھڑا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں بلوس اس کی مقناطیسی شخصیت بہت شاندار لگ رہی تھی۔ سلیمان صاحب اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے کسی سے اس کا تعارف کروا رہے تھے اور وہ جیسے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ اتنے مطمئن اور مسرور لگ رہے تھے گویا رو حیل واپس آگیا ہو۔

"بہت اچھا ہے ماشاء اللہ۔"

"تھنکس۔ شہلا بھابھی! ایک بات کہوں۔ آپ کی ساس نے آپ کی اتنی خوب صورت بری بٹائی تھی اور آج بھی آپ نے ان ہی میں سے کوئی سوٹ پہنا ہو گا، اس طرف تو عورتیں ہی ہیں۔ آپ کا عبایا۔ میرا مطلب ہے، آپ کے کپڑے تو نظر ہی نہیں آ رہے۔" وہ رک رک کر ہچکچاتے ہوئے بولی تھی۔ داور بھائی کی مندی پر اس نے بہت کھنک دار لہجے میں شہلا کو نقاب اتارنے کے لیے کہا تھا مگر آج اس کی آواز سے وہ کھنک مفقود تھی۔

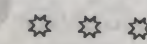
جواباً "شہلا بہت تھکن سے مسکرائی تھی۔  
"کیا فرق پڑتا ہے جیا! اتنے مردوں کو اپنے کپڑے دکھا کر تجھے کیا مل جائے گا؟"

"تو نقاب ہی اتار دیں۔" اس کا لہجہ بہت کمزور تھا۔ اس نے نقاب ڈھیلا بھی نہیں کیا۔ جیانے پھر نہیں کہا۔ اس سے کہانی نہیں گیا۔

وہ تو خود دل سے نہیں چاہتی تھی کہ شہلا نقاب اتار دے۔ وہ تو بس اس کا جواب سننا چاہ رہی تھی۔ اسے شریفیوں کے مجھے کا وہ منظر اچھی طرح سے یاد تھا، جب سنہری اور چاندی کی محو رقص پریوں کے پیچھے کرسی پر ترجمی ہو کر بیٹھی کسی آئی سے بات کرتی شہلا نظر آ رہی تھی، مگر نقاب میں ہونے کے باعث اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ سو اس کے حصے میں وہ بدنامی نہیں آئی، جو ان دونوں کے نصیب میں آئی تھی مگر آج وہ اتنی پشیموگی اور تھکن سے کیوں مسکرائی

تھی۔ یوں جیسے اس کا دل اندر تک زخمی ہو۔ وہ دکھ نہ تھکن وہ زخمی نگاہیں۔ اسے کسی نے پکار لیا اور وہ اٹھ کر چلی گئی کر حیا کی نگاہیں کلنی دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

چھپل دفعہ اسے شہلا کو عبایا میں دیکھ کر عجیب کو فٹ بھرا احساس ہوا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی ان دکھ بھری آنکھوں میں انک کر رہ گئی تھی۔ شہلا کو کیا غم تھا۔ اتنی اچھی فیملی میں شادی ہوئی۔ اتنا ہینڈ سم شوہر، امیر کبیر مال باپ کا کلو تائیٹا، پھر۔ پھر اسے کیا دکھ تھا؟ وہ پھر سارا افکشن ہی سوچنے لگی۔



آدھی رات گئے اپنے کمرے میں بیٹھے وہ پھر سے اس ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جہان، ڈولی، پٹی، احمد، پاشا مگر انگریزی میں یہ سارے نام پانچا جڑی تھے۔ چھنا حرف نہیں ملتا تھا۔ وہ بار بار اس سطر کو پڑھنے لگی مگر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ سمجھ کون سا شخص تھا جس کے پاس اسے ہر محنت طلب مسئلے کا حل ہوتا تھا؟  
وہ ڈبا لیے بھاگ کر باہر آئی۔ جہان کچن میں کھڑا کاؤنٹر پر گلاس رکھ بیانی کی بوتل اس میں اندیل رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آئی اور باکس اس کے ساتھ رکھا۔  
"یہ مجھے کسی نے دیا ہے اور مجھے اس کا پاس درڈ نہیں معلوم اسے کھول دو۔"

وہ آواز پر چونکا، پھر بوتل رکھ کر ڈبا اٹھایا۔  
"یہ ہے کیا؟" وہ ذرا اچھٹے سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"جو بھی ہے تم اسے کسی طرح کھول دو۔"  
"ہوں اکل جائے گا تو براہم۔" وہ ڈھکن اور ڈبے کی بند دراز پر اٹکی پھیر کر کچھ محسوس کر رہا تھا۔ "تم مجھے ایک بڑا چھرا اور ایک تھوڑا لالا دو۔"  
"افو! تو زنا نہیں ہے اسے بلکہ تم تو رہنے ہی دو۔" اس نے خفگی سے ڈبا اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔  
"کیا ہوا؟ میں کھول تو رہا تھا ایک منٹ مجھے دیکھنے تو

دو۔"

"میں خود کربلوں کی تہم رہے دو۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کرتے۔" پتا نہیں وہ کس بات پر اس سے خفا تھی جو جھنجھلا کر بولی۔

"پھر سوچ لو۔ میں تو ابھی ماموں کے پاس جا رہا تھا انہیں تمہیں دوبارہ استنبول بھیجنے کے لیے راضی کرنے مگر ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرتا۔" وہ شانے اچکا کر پانی پینے لگا۔  
"سچ؟" اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔  
"تم انہیں مناسکتے ہو؟"

"میں ایک اچھا شیف اور اچھا مکینک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا ویل بھی ہوں۔ ٹرائی می!" وہ گلاس رکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

"ابا ایک دفعہ اڑ جائیں تو کبھی فیصلہ نہیں بدلتے۔ تم انہیں کیسے مناؤ گے؟"

"دلیے تو تمہارا دوبارہ استنبول جانا میرے مفاد میں قطعاً نہیں ہے کیونکہ اب تم ہر ٹورسٹ اٹریکشن دیکھنے جانے کے لیے مجھے ہی خوار کرواؤ گی، مگر مجھے لگا تم جانا چاہتی ہو۔ سو میں ماموں سے بات کرنے ہی جا رہا تھا اور وہ مان جائیں گے۔ بروقت کونیا کو کینیا نہ بنا تو شاید وہ سمجھی نہ مانتے۔"

"ہاں استنبول تو بہت محفوظ شہر ہے اور پاکستان میں تو روز بدم دھماکے ہوتے ہیں اور پاکستان میں تو پتا نہیں لوگوں کے پاس انٹرنیٹ کی سولت موجود ہے بھی یا نہیں!" وہ ذرا جل کر بولی۔ وہ بیٹا کچھ کے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اگلا ایک گھنٹہ وہ کچن میں کرسی پر بیٹھی جہان کا انتظار کرتی رہی۔ بالا خرچ وہ ابا کے کمرے سے نکلا تو وہ تیزی سے اٹھی۔  
"کیا ہوا؟"

"پکینگ کرلو۔ ہم کل صبح کی فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں۔" وہ دھیمبا مسکرا کر بولا۔ "مگر اس شرط پر کہ فی الحال تو تم ہمارے ساتھ رہو گی، بعد میں جب تمہاری اسپرنگ بریک ختم ہو جائے تو بے شک چلی جانا۔"



”ج“؟ وہ بے یقینی و خوشگوار حیرت میں گہری اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک طمانیت بھرا احساس اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا۔ البتہ ایک بات وہ جانتی تھی۔ استنبول ڈی جے کے بغیر کبھی بھی ویسا نہیں ہو گا جیسا پہلے تھا۔

☆☆☆

”تمہارا دل غریب درست ہے؟“

ہاشم نے بے یقینی سے اپنی بیوی کو دیکھا جو بستر کے دوسرے کنارے پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان حارث آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ہاشم کے ہاتھ میں تھا۔ ”ایسا کیا غلط کہہ دیا ہے میں نے؟“ وہ جی بھر کر کوفت کا شکار ہوئی۔

”تم پاگل ہو گئی ہو، تمہارے حواس جواب دے گئے ہیں۔“ حیرت کی جگہ اب جھنجھلاہٹ نے لے لی تھی۔

”حواس تو تمہارے جواب دے گئے ہیں۔ میں تمہیں ایک سیدھا سا واسطہ بتا رہی ہوں اس سارے مسئلے کا۔ تم روز کے چوبیس گھنٹے بھی کام کرو تو اس رقم کے آدھے لیزاز بھی اکٹھے نہیں ہوں گے جو ہمیں حارث کی سرجری کے لیے چاہیے۔ اور ایسے مت دیکھو مجھے۔“ آخر میں وہ خفا ہو کر بولی۔

”پاشا مجھے جان سے مار دے گا۔ وہ اس کی لڑکی ہے۔“

”اور پاشا کو بتائے گا کون؟ وہ تو مبینہ بھریسلی انڈیا چلا گیا تھا۔ تم نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔“ وہ چمک کر بولی۔ نیم روشن کمرے میں سبز بلب کی پدھم رونی اس کے چہرے کو عجیب سا اثر دے رہی تھی۔

”وہ انڈیا گیا ہے، مرنے نہیں گیا، جو اسے کبھی پتا نہیں چلے گا۔ وہ مجھے جان سے مار دے گا سہلی۔“

”تو پھر تم اپنی جان سنبھال کر بیٹھے رہو اور حارث کو مرنے کے لیے چھوڑ دو۔“ غصے سے کتنی اٹھ کر چادریں تہہ کرنے لگی۔

”سہلی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اب کے وہ قدرے متذنب سے بولا تھا۔

”تو تم کر کیا سکتے ہو؟ اور کیا کیا ہے تم نے حارث کے لیے؟“

”میرا بیٹا مجھے بہت پیارا ہے۔“ اس نے سوتے ہوئے حارث پر ایک نظر ڈالی۔ ”مگر وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔“

”میں بھی تو کسی کی بیٹی تھی مجھے اس ڈربے میں لا کر بل مارنے سے پہلے تم نے یہ سوچا؟“ وہ چادر کا گولہ بنا کر ایک طرف پھینکی جارحانہ انداز میں اس کی طرف آئی۔ ”تم مرد ہو کر ڈرنے کیوں ہو؟“

”تم پاشا کو نہیں جانتیں۔“

”میں بس اتنا جانتی ہوں کہ اگر میرا بیٹا مر رہا ہے تو اس کا ذمہ دار عبدالرحمن پاشا ہے۔ اگر وہ تمہیں تمہاری مطلوبہ رقم دے دیتا تو ہم کبھی یہ کرنے کا نہ سوچتے۔ کوئی تو نہیں ہے اس کو پیسے کی پھر بھی اس نے ہاتھ روک کر رکھا ہوا ہے۔ اب یا تو تم اس کا خیال کر لو یا اپنے بچے کا۔ فیصلہ تمہارا ہے۔“ سہلی کے نفوش مدھم رونی میں مجڑے بگڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت یوں تیز تیز بولتی وہ میک بٹھ کی چوٹھی جاو گئی لگ رہی تھی۔

ہاشم متذنب سا اسے دیکھ گیا۔ وہ جو کہہ رہی تھی وہ اتنا مشکل تو نہ تھا مگر۔

☆☆☆

وہ جہان کے ساتھ سیدھی اس کے گھر آئی تھی، پھر کھانا کھا کر اس نے اجازت چاہی۔ اس کا سارا سامان سبائی کے ڈورم میں رکھا تھا اور جس افرا تقری میں وہ گئی تھی، سوائے چند چیزوں کے کچھ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ پھپھو نے اصرار بھی کیا کہ وہ چٹشیاں ختم ہونے تک ان کے پاس رک جائے مگر وہ کل آنے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تو پھر کہوں گی کہ رک جاؤ۔“ پھپھو ذرا خفا تھیں۔

”پھپھو! میں کل آؤں گی ناں پر امس۔ اب چلتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر کل ضرور آنا۔“ جہان نشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ڈانٹنگ ٹیبل سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک گلابی پڑ چکے تھے۔ سرد گرم علاقوں کے بائین سفر کا موسمی اثر تھا کہ استنبول پہنچتے پہنچتے اس کا نلو بخار میں بدل گیا تھا۔

”تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“

”صرف تا قسم تک چھوڑنا۔ آگے سے میں گورسل پکڑ لوں گی۔“

”میں سبائی تک چھوڑ دوں گا، تو پر اہل۔“ وہ چابی پکڑے، جیکٹ پہنتے ہوئے بولا۔

”نہیں اس بخار میں تم سے پینتالیس منٹ کی ڈرائیونگ کروانی تو پینتالیس دن تک تم جتاتے رہو گے۔ ویسے بھی مجھ پر تمہارے احسان بہت جمع ہو گئے ہیں۔ اتنے سارے پیسے آتا رہا کی؟“ وہ اس کے سامنے سینے پر بازو لینے کھڑی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اتارنے کے لیے کس نے کہا ہے۔“

وہ ذرا سا مسکرا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس کی پشت کو دیکھ گئی۔ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ جہان کا رویہ اس کے ساتھ نرم پڑتا جا رہا تھا۔ پاکستان میں پہلے دو دن تو وہ لا تعلق رہا شاید اس لیے کہ دونوں کو ٹھیک سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا مگر پھر اس نے خود ہی کچھ محسوس کیا تھا مکتب ہی وہ خود آگے بڑھا اور ان کے درمیان کھڑی سرد پوار ڈھادی لیکن کیا وہ اس کے لیے وہ محسوس کرتا تھا جو وہ اس کے لیے کرتی تھی؟ کیا اسے ان کا وہ بھولا بھرا رشتہ یاد تھا جس کے متعلق اس گھر میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ابھی کچھ دن وہ اس کے گھر رہے گی تو ان سارے سوالوں کے جواب جاننے کی کوشش ضرور کرے گی۔ اس نے تہہ نہ کر لیا تھا۔

ہاشم اسکو آواز کا مجسمہ آزادی اسی طرح تھا، جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ مجستے کے گرد گول چکر میں آگئی گھاس

پہ سنخ اور زردیولپ فیشول کے پوسٹرز لگے تھے جو ہر سال کی طرح اس موسم بہار میں بھی استنبول میں منعقد ہوتا تھا۔ یولپ کا پھول استنبول کا ”سبل“ تھا، مگر ان کی دلفریب مہک میں ڈوبا ہاشم اسکو آواز جیسا کو خزاں آلود لگا تھا۔ وہ بہار اب وہاں نہیں تھی جیسے ڈی جے نے نہیں تھی۔

”تم جارہی ہو، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تم کچھ دن ہمارے گھر رہو۔“ گاڑی روکتے ہوئے جہان نے چرو اس کی طرف موڑے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”میں کل آ جاؤں گی مگر کل تک میں سبائی اپنا ڈورم ہلاک نہ بھیل اور ہر وہ جگہ جہاں میں اور ڈی جے اکٹھے گئے تھے، ایک دفعہ پھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اکیلے بالکل اکیلے۔ میں ان بیٹے لکھوں کو پھر سے جینا چاہتی ہوں۔“

”مست کرو۔ تمہیں تکلیف ہوگی۔“

”بہت تکلیف سہلی اب اس سے زیادہ تکلیف مجھے نہیں مل سکتی۔“ اس نے بھیگی آنکھ کا گولہ انگلی کی نوک سے صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اوکے!“ اس نے سمجھ کر سر ہلادیا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک خفا تھی۔

جہان چلا گیا اور وہ مجسمہ آزادی کے گرد آگئی گھاس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ گھاس کا گولہ قطعہ اراضی دراصل یوں تھا جیسے کوئی چنار کھا گول سا سبز پھول ہو جس کی سبز پتیاں بنی ہوں، اور پتی کے درمیان ایک سیدھی روش تھی جو مجستے تک لے جاتی تھی۔

ہاشم کے ہر پھول، ہر پتھر اور ہر پتھر پر جیسے یادیں رقم تھیں۔ وہ اس کا اور ڈی جے کا زیرو پوائنٹ تھا۔ مین اسٹاپ۔ تقریباً ہر دوسرے روز وہ ادھر آتی تھیں۔ گورسل انہیں ہمیں جو اتار کرتی تھی۔ یہاں سے آگے وہ عموماً ”میٹروپولین پکڑ لیا کرتی تھیں۔ اس اسکو آواز کا چپ چاپ نہیں یاد تھا اور ڈی جے کے بغیر سب کچھ ادھر اور تھا۔

اور اس طرف استقلال اسٹریٹ تھی وہاں سے کی گئی ان کی ڈھیروں شاہنگ۔ جو رائیگاں چلی گئی۔ استقلال



اسٹریٹ آج بھی ویسی ہی تھی، بہت طویل، نہ ختم ہونے والی۔ مگر زندگی ختم ہو گئی تھی۔  
گورسل کی کھڑکی کے شیشے کے پار وہ باغوں کا عظیم الشان سمندر دیکھ رہی تھی۔ وہاں سے ایک فیری گزر رہا تھا۔ اسے یاد تھا جب پہلی دفعہ ان دونوں نے اسی جگہ پل پار کرتے ہوئے نیچے فیری تیراؤ کیا تھا تو وہ تو خوشی اور جوش سے پاگل ہی ہو گئی تھیں۔ وہ کبھی بحری جہاز میں نہیں بیٹھی تھیں اور صرف اسے دیکھ کر ہی وہ رجوش ہو گئی تھیں پھر فیری وہیں رہ گیا اور زندگی ختم ہو گئی۔

دھپری ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ سبائی کے دروازے پر پھیلی تھی۔ ڈورم بلاکس تقریباً "دیران پڑے تھے۔ اسپرنگ بریک ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور اسٹوڈنٹس اپنے اپنے ٹورز پر تھے۔ اسے کسی کو اطلاع دینے کا ہوش ہی نہیں تھا مگر پاکستان روایتی والے دن جانے ہالے کو کسی نے بتایا اور پھر سب کے فون آنے لگے تھے۔ معصوم، حسین، ثانی، سارہ، لطیف، نجم، باجی سب اسے برابر فون کرتے رہے تھے، مگر وہ سب یقیناً "ابھی واپس نہیں آئے تھے۔

وہ اپنے ڈورم بلاک کی گول چکر کھاتی بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب وہ سبائی آئی تھیں تو ان زینوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ اب وہ برف ہمارے کئی تھی۔ اس نے گردن اوپر اٹھا کر بالکونی کے بلب کو دیکھا اور پھر اداسی سے مسکرا دی۔ کتنا ڈر گئے تھے وہ اپنے پہلے دن کہ پتا نہیں یہاں کون سے جن بھوت ہیں۔

"نکے، ہم وہی پاکستان کے پنڈو۔" ہالے کے یہ بتانے پر کہ یہ ٹیکنالوجی کا کرشمہ تھا ڈی جے اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر افسوس کرتی رہی تھی۔ اس نے ڈورم کلاک کھولا۔

کمر انسان پڑا تھا۔ صاف ستھرے بنے ہوئے بستر، میز پر ترتیب سے رکھی چیزیں، ڈی جے کے بینک کی میز البتہ خالی تھی۔ اس کی ساری چیزیں حیا نے اس کے بھائی کو بیک کر کے دے دی تھیں۔ وہ کھڑکی میں اکھڑی ہوئی اور سلائیڈ کھولی۔

"گڈ۔ گڈ۔" اس نے کنا چاہا مگر آواز گلے میں انک گئی۔ آنسوؤں نے اس کا گلاب بند کر دیا تھا۔ دور کس کی دوسرے بلاک سے ڈی جے کو جواب دینے والے لڑکے نے اتنے دن کی غیر حاضری پر کچھ تو سوچا ہوگا، مگر شاید وہ خود بھی اسپرنگ بریک نہ ہو۔ اب وہ آئے گا تو اسے کوئی آواز نہیں آئے گی۔ اسے کیا معلوم کہ اب ساری آوازیں ختم ہو گئیں۔  
"گڈ مارننگ ڈی جے!" اس نے کھڑکی میں کھڑے بھیگی، بے حد مہم آواز سے ڈی جے کو پکارا۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر چہرے پر لڑھک رہے تھے۔ جواب نہیں آیا۔ اب جواب بھی نہیں آتا تھا۔ وہ پلٹ کر اپنے بینک کی طرف آئی اور شانے سے پرس انار کر اپنی میز پر رکھا، پھر زپ کھول کر اندر سے لکڑی کا وہ چھوٹا سا ڈبا نکالا۔ اس کا جواب بھی اسے ڈھونڈنا تھا۔

"وہ حیا۔۔۔ تم کب آئیں؟" آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔ کھلے دروازے میں معصوم کھڑا تھا وہ رابڈری سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر حیرت سے رکا تھا۔  
"آج ہی آئی ہوں۔ تم سب واپس آگئے؟" اسے ایک گونا گونا طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ ڈبا ہاتھ میں لیے اس کی طرف آگئی۔  
"نہیں، وہ سب تو ابھی کوئنا میں ہیں۔ مجھے ذرا کام تھا اس کے لیے آیا تھا۔" وہ دانستہ لہجہ بھر کر کہ "مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ خدیجہ۔۔۔ اتنا اچانک کیسے ہوا؟"

"اللہ کی مرضی تھی معصوم! ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ میری اینورزم چھٹے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچانک سے انسان کو لپٹس گرتا ہے اور اچانک مر جاتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو چند روز قبل سر درد شروع ہوتا ہے ڈی جے کو بھی ہوا تھا مگر اس نے میگزین سمجھ کر نظر انداز کیے رکھا اور پھر سب ختم ہو گیا۔"

"دوستوں کو کھونا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔" وہ دونوں اسی طرح جو کھٹ پہ کھڑے تھے۔

"میں تو تب سے یہی سوچ رہی ہوں معصوم! کہ کیا زندگی اتنی غیر یقینی چیز ہے؟ ایک لمحے پہلے وہ میرے ساتھ تھی اور اگلے لمحے وہ نہیں تھی۔ موسم بتی کے شعلے کی طرح بے ثبات زندگی جو ذرا سی پھونک سے بجھ جائے۔ لمحے بھر کا کھیل؟"

"یہی اللہ تعالیٰ کا ڈیزائن ہے حیا اور ہمیں اسے قبول کرنا پڑے گا۔ یہ کیا کوئی پزل باکس ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑے ڈبے کو دیکھ کر ذرا سا چونکا۔ اس نے نا بھجی سے ڈبا کی اس طرف بڑھایا۔  
"چائنیز پزل باکس؟" تم نے یہ کہاں سے لیا؟" وہ ڈبا الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"نہی نے دیا ہے مگر میں اسے کھول نہیں پا رہی۔ کیا تم اسے کھول سکتے ہو؟" اس نے پر امید نگاہوں سے معصوم کو دیکھا۔  
"میں دیکھتا ہوں، ٹھہرو۔" وہ اس کا اوپر نیچے سے جائزہ لے رہا تھا۔ "یہ قدم چائیز باکس کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اس کے اوپر عموماً کوئی پزل بناتا ہے جس کو سالو کرنے سے یہ کھلتا ہے یا پھر کوئی پانچ حرفی لفظ لگانے سے۔ ایک منٹ۔" اسے جیسے اچنبھا ہوا۔  
"پانچ نہیں، اس پر تو چھ حرف ہیں۔ اس طرح کی چیزوں پر بیش پانچ حرف ہوتے ہیں، مگر شاید اس کا جواب کوئی خاص لفظ ہو جس پر چھ حرف ہی پورے آتے ہوں۔"

"مگر اب یہ کھلے گا کیسے؟" وہ بے چینی سے بولی۔  
"یہ تو جس نے دیا ہے اس کو ہی۔" وہ رکا اور اوپر لکھی سطر پڑھنے لگا۔  
"ایک سی دریا میں کوئی شخص دودھ نہیں اتر سکتا۔ ہوں۔۔۔ حیا! تمہارا واسطہ کسی جینٹلمن سے پڑ گیا ہے۔ یہ ایک پہیلی ہے اور اسے حل کرنا ہے۔"  
"اور اس نے کہا تھا کہ اسے صرف میں ہی حل کر سکتی ہوں اور اگر اسے توڑا تو یہ میرے کسی کام کا نہیں رہے گا۔"

"یعنی وہ چاہتا ہے کہ تم دماغ استعمال کرو۔ ویسے یہ فقرہ۔" وہ اس سطر پر انگلی پھیرتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ "یہ فقرہ مجھے کچھ سنا لگ رہا ہے۔ شاید۔۔۔ شاید۔۔۔ جیسے یاد کرنے لگا۔" اس دن جب ہم جیو انفارمیشن کی کلاس میں لکھ لکھ کر باتیں کر رہے تھے تب شاید پروفیسر نے یہ بولا تھا۔  
"نہیں، مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں۔"

"پتا نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "انسان کی یادداشت چیزوں کو بہت کوریٹ کرتی ہے۔ ہمیں ایک چیز کو دیکھ کر اس سے متعلقہ چیز یاد آ جاتی ہے۔ مجھے بھی اس کو دیکھ کر وہی کلاس یاد آئی۔ خیر! جو بھی ہے، تم فکر نہ کرو، ہم اس کا کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ ابھی تو میں کام سے جا رہا ہوں، دیر سے آؤں گا۔ تم دروازہ اچھی طرح لاک کر دینا، آج کل ڈورم بلاک تقریباً "خالی ہے ٹھیک ہے؟"

اس کے یوں خیال کرنے پر وہ زیر لب مسکرا دی۔ وہ چلا گیا تو اس نے واقعی کرا اچھی طرح لاک کر لیا۔ سبائی اتنی دیر ان تھی کہ اسے اچانک سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ٹائم سے یہاں آنے تک اسے مسلسل محسوس ہوتا رہا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ حالانکہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اسے سب کچھ معقول کے مطابق ہی نظر آتا تھا مگر کچھ تھا جو اسے بے چمن کیے ہوئے تھا۔

رات بہت دیر تک لیٹے لیٹے وہ پزل باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے، انگوٹھے سے حرف "جی" کی سلائیڈز اوپر نیچے کرتی رہی۔ اس نے حرف کے کئی جوڑے بنائے مگر وہ مقفل رہا۔ اسے نیند نے کب گھیرا، اسے علم بھی نہیں ہوا۔ پزل باکس اس کے گرد۔ ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سرد، جامد اور مقفل۔

☆ ☆ ☆  
صبح وہ دیر سے اٹھی۔ ناشتا کر کے رات والے شکن آلود لباس پر ڈھیلا سا سویٹر پہنے، بالوں کو جوڑے میں باندھتی وہ نیچے آگئی۔ اس کا رخ یونیورسٹی میں فوٹو کلب کی طرف تھا۔ وہاں سے اس نے کچھ نوٹس کئی



روز پہلے فوٹو اسٹینٹ کر دئے تھے اور انہیں اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

مج کی چمکیلی مگر ٹھنڈی ہوا سانسہ کی سبزہ زار پہ بہہ رہی تھی۔ وہ فوٹو کاٹھنوں کے پاس آئی اس نے نوٹس اٹھائے سانسہ کی کارڈ سے اوایسکی کی اور پھر واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اسے ایک میز پر رکھا لاوارث سارجرٹار آیا۔ رجسٹر جانا پچھانا تھا۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹا اس پر برا برا DJ لکھا تھا۔

”وہ ڈی جے“ ایک او اس مسکرا ہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ ڈی جے کانسیان۔ وہ ہمیشہ اپنا رجسٹر فوٹو کاٹھنوں پہ چھوڑ جایا کرتی تھی۔ اس نے رجسٹر اٹھالیا۔ وہ اب اس کا تھا۔ باقی چیزیں تو وہ ڈی جے کی فیل کی کووے چکی تھی مگر اس کی ایک یادگار سنبھالنے کا حق تو اسے بھی تھا۔

وہ باہر آگئی اور گھاس پہ بیٹھ کر ڈی جے کے رجسٹر کے صفحے پلٹنے لگی۔ وہ اس کا رُف رجسٹر تھا جسے وہ زیادہ تر لکھ لکھ کے باتیں کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی اور ایسی باتیں عموماً ”وہ آخری صفحے پہ ہی کیا کرتی تھیں۔ اس نے آخری صفحہ پلٹا تو دھیرے سے مسکرا دی۔

اس روز جو انفارمیشن سسٹم کی کلاس میں ان کی اور فلسطینیوں کی اسپرنگ بریک کی پلاننگ اس پہ لکھی تھی۔ وہ بہت محبت سے ڈی جے کے لکھے الفاظ پہ انگلی پھیرتی انہیں پڑھ رہی تھی جب ایک دم وہ رک گئی۔ رجسٹر کے اس آخری صفحے کے اوپر برا برا کر کے ڈی جے کی لکھائی میں لکھا تھا۔

Into the same river no  
man can enter twice -  
Heraclitus 535-475.b.c

(ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا)  
ہرا قلیطس ۵۳۵ء ۴۷۵ء قبل مسیح  
وہ بالکل شل سی سانس روکے، تحیر سے اس سطر کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ پزل باکس اسے ڈی جے نے بھیجا تھا؟

”جب تک آپ اسے کھول پائیں گی وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔“  
وہ رجسٹر کیے ایک دم سے اٹھ کر ڈورم کی طرف بھاگی۔ اسے مقصم کو ڈھونڈنا تھا۔

\*\*\*

”ہرا قلیطس۔۔۔ یونانی فلسفی۔۔۔ یاد آگیا۔“ مقصم نے وہ سطر پڑھتے ہوئے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ”یہ ہرا قلیطس کا ایک قول ہے جیسے تم اس کے دوسرے اقوال سے ہوں گے مثلاً۔۔۔“ وہ یاد کر کے بتانے لگا۔ ”کتے اسی پہ بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے ہوئے یا انسان کا کردار اس کی تقدیر ہوتا ہے۔“ وہ انگریزی کے چند مشہور اقوال بتا رہا تھا۔

”ہاں بالکل۔“ جیانیہ اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اس میں سے کوئی بھی قول نہیں سن رکھا تھا۔ ”تو ثابت ہوا کہ ہم اس پزل کے ٹھیک راستے پہ چل نکلے ہیں۔ اور اس راستے پہ اس شخص نے یقیناً“ بریڈ کمبیز کرائے ہوں گے۔ اب ہمیں ایک ایک کر کے ہنسل اور گمشدگی کے ان بریڈ کمبیز کو چھنا ہے۔“

”شش!“ دور بیٹھی لائبریرین نے کتاب سے سر اٹھا کر عینک کے پیچھے سے ان کو ناگواری سے ٹوکا، وہ دونوں اس وقت لائبریری میں آئے سانسے بیٹھے تھے۔ ”سووری میم! جیانیہ گردن موڑ کر ایک معذرت خواہانہ مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی اور واپس پلٹی۔ ”مجھ اب کیا کرنا ہے؟“ وہ دھیمی سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔ ”مگر اس نے ہرا قلیطس کا ایک قول ڈبے کے اوپر لکھا ہے تو یقیناً“ اس کے کوڈورڈ کا تعلق اسی قول ہو گا۔“

”یا پھر شاید ہرا قلیطس کی ذات سے۔“ ٹھہرو! میں ایک منٹ آیا۔“ وہ اٹھا اور چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں موٹی موٹی چند کتابیں اوپر نیچے پکڑ رکھی تھیں۔ ”یہ رہا ہرا قلیطس کا اعمال نامہ۔“ اس نے دھپ

کی آواز کے ساتھ کتابیں میز پر رکھیں۔  
لائبریرین نے چہرہ اٹھا کر اسے تملکاروہ کھا۔  
”موسم ری!“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہتا واپس کر سی پہنچا۔

”میں لاء کی اسٹوڈنٹ ہو کر فلاسفی کی یہ اتنی وزنی کتابیں پڑھوں؟ یہ مجھ سے یہ نہیں ہو گا۔ میں ہرا قلیطس کو گوگل کر لیتی ہوں۔ لیپ ٹاپ ادھر دکھاؤ۔“ اس نے ساتھ رکھے مقصم کے لیپ ٹاپ کا رخ آبی طرف گھمایا اور کی بیڈ پہ انگلیاں رکھیں۔ ”ف!“ جب اتنے ذمہ سارے نتیجے کھلے تو وہ بے زاری ہو گئی۔ اسے جلدی سے کوئی جواب چاہیے تھا اور بس جلدی سے وہ باکس کھولا تھا۔ اتنے لمبے لمبے ڈاکو منٹس پڑھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

”ادھر لاؤ“ میں پڑھ کر ہمیں مین یونائٹس بتاتا ہوں۔“ اس کی کوفت دیکھ کر مقصم نے لیپ ٹاپ اپنی طرف گھمایا اور پھر اسکرین پہ نگاہیں دوڑاتے ہوئے پڑھنے لگا۔

”ہوں۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہرا قلیطس کا تعلق ایشیا مائیز سے تھا۔ خاصاً بد مزاج فلاسفر تھا۔ اپنے علاقے میں چیف پریسٹ بھی رہا ہے اور بہت خاندانی بھی تھا۔ بڑے بڑے فلسفیوں کو خاصی حقارت سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں فیثا غورٹ ہو م کو بھرے چوک میں لے جا کر درتے مارنے چاہئیں اور Hesoid اتنا جاہل ہے کہ اسے دن اور رات کا فرق نہیں پتا۔ ہرا قلیطس کے مشہور اقوال یہ ہیں۔۔۔

”مگر مے سونے پہ گھاس کو ترجیح دیتے ہیں، کتے ہر اس شخص پہ بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے اور۔۔۔“ ”بس کرو مقصم! اور نہ میں پاگل ہو جاؤں گی!“ اس نے جھنجھلا کر لیپ ٹاپ کی اسکرین ہاتھ سے دبا کر فولڈ کر دی۔ مقصم ہنس دیا پھر اپنا موبائل نکالا۔

”لطیف رات کو آگیا تھا۔ اس کا ایک سائیڈ کو رس فلاسفی ہے اس کو ملتا ہوں۔“  
لطیف کو ادھر آنے اور اس کو ساری بات سمجھانے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اب وہ مقصم کے ساتھ والی

نشست پہ بیٹھا سوچتے ہوئے اس پزل باکس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنو لگ اور خالصتاً ”ڈیج ٹھاکر افغانستان میں پیدا ائش کے وقت اس کے ماں باپ نے اپنے کسی افغانی دوست لطیف کے نام پہ اس کا نام رکھا تھا اور چونکہ اس کو پہلی خوراک ایک مسلمان نرس نے دی تھی سو لطیف ذہنی اور اخلاقی طور پہ ان فلسطینی لڑکوں جیسا ہی لگتا تھا۔

”میں تو ہرا قلیطس نامہ سن کر تنگ آگئی ہوں“ اور اس کے یہ کتوں گدھوں اور۔۔۔“ جیانیہ باکس کی طرف اشارہ کیا۔ ”دریاؤں والے اقوال میری سمجھ سے تو باہر ہیں۔“

”ایک منٹ!“ لطیف ذرا چونکا، ”وہ کتوں اور گدھوں والے اس کے اقوال ہوں گے مگر یہ دریا والا صرف اس کا قول نہیں بلکہ اس کی مشہور زانہ فلاسفی ہے۔ Flux فلاسفی ہم نے سن تو رہی ہوگی؟“

”میں ہرا قلیطس کا نام آج پہلی دفعہ سن رہی ہوں، کجا کہ اس کی فلاسفی۔“

”اور نہ۔۔۔ تم نے بلکہ ہر کسی نے یہ فلاسفی سن رکھی ہے۔ یہ محاورہ تو تم جانتی ہو تاکہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ لطیف آگے ہو کر بتانے لگا۔

”یہ محاورہ دراصل ہرا قلیطس کی اسی فلاسفی کا نیچوڑ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی شخص ایک ہی دریا میں دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔ یعنی کہ جب انسان ایک دفعہ پانی میں قدم رکھ کر نکلتا ہے تو وہ پانی آگے بہہ جاتا ہے پانی اور انسان دونوں ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہیں، وہ دوبارہ جغرافیائی لحاظ سے تو اسی دریا میں قدم رکھتا ہے مگر نہ وہ خود وہی پہلے والا انسان ہوتا ہے، اور نہ وہ دریا پہلے والا ہوتا ہے۔ سمجھ آئی؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے قطعاً سمجھ نہیں آئی تھی۔

”نہیں، تمہیں سمجھ نہیں آئی۔ دیکھو! جب استنبول میں پہلے دن تم نے باسفورس کا سمندر دیکھا تھا“



تب وہ مسند پر نہیں تھا، جو تم نے دیکھا۔ اب نہ تم وہ ہو، اور نہ مسند وہی ہے۔ ہر چیز لمحہ بہ لمحہ بدل جاتی ہے یہ ہے ہر اقلطیس کی فلسفی آف چیچنگ!“

”فلاسی آف چیچنگ!“ حیا نے اثبات میں سرھلاتے باکس اٹھایا۔ ”پور تمہیں پتا ہے چیچنگ میں پورے چھ حروف ہوتے ہیں۔“

”وہ ہاں!“ معصم نے ذرا جوش سے دیکھ کر ہاتھ مارا۔

ادھر ادھر ٹیبلز پہ پڑتے چند طلباء نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”لاسٹ ٹائم!“ ایچ چیچ اسٹوڈنٹس!“ لائبریرین نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے انگلی اٹھا کر وارننگ کی۔ معصم نے فوراً ”سر جھکا دیا۔“

وہ دبے دبے جوش سے حروف کی سلائیڈز اوپر نیچے کر رہی تھی، یہاں تک کہ اس نے پورا لفظ چیچنگ لکھ لیا۔

”اب یہ کھل جائے گا۔“

مگر پزل باکس جلد رہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کوڈ کچھ اور ہے۔ اور وہ کچھ ایسا ہے جسے صرف تم کھول سکتی ہو۔ کچھ ایسا جو صرف تمہیں ہی معلوم ہوگا۔“

”حیا! تم ہر اقلطیس کی مینا فرس میں تو انٹرسٹڈ نہیں ہو؟“ لطیف کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

”فی الحال تو میں صرف ٹائم جمانے میں انٹرسٹڈ ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیار ہو جاؤں۔“ وہ ہار مانتے ہوئے باکس کیے اٹھ گئی۔

”ہم نے بھی ٹائم جمانا ہے اور ابھی گورسل ٹکٹے میں ڈیڑھ گھنٹہ تو ہے۔ تم تیار ہو جاؤ تو اکٹھے چلتے ہیں۔“

لکڑی کا وہ پزل باکس اس نے اپنے ڈورم کے لاکر میں رکھا، پھر اپنے پڑنے لگنے لگے۔ جس افرا تفری میں گئی تھی، یہ یاد کہاں تھا کہ لائبریری کو کپڑے نہیں دیے۔ اس وقت جو ایک واحد استری شدہ جوڑا بیٹنگر پہ لٹکا تھا وہ اس کا سیاہ فرائگ تھا جس کی اوپری بیٹی سنہری

سکوں سے بھری تھی۔ وہی جو وہ جہاں کے استقلال اسٹریٹ میں دیے جانے والے ڈرنپہ پن کر گئی تھی۔ فی الحال وہ پچھو سے پہلے اپنی ان میزبان آئی کے گھر جا رہی تھی جنہوں نے پہلے روز ان کا کھانا کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک طرح سے ڈی جے کے لیے ہی جا رہی تھی سو یہ کام والا فراک مناسب نہ تھا لیکن وہ اوپر سیاہ کوٹ پہننے لگی تو کام چھپ جائے گا، اور نیچے سے تو فراک ساتھ ہی تھا۔ اس نے لباس بدل کر بال کچھو میں باندھے، پھر اپنے سنہری کلچ میں پاکستانی مسلم سا موبائل ڈالا۔ کلچ چھوٹا سا تھا، اس میں ترک بھرا فون پورا نہیں آتا تھا، سو اس نے ترک فون کوٹ کی جیب میں رکھ دیا اور کلچ کی زنجیر کو ایک کندھے سے گزار کر دوسرے پہلو میں ڈال کر بڑی پن کے ساتھ فراک کی بیٹل سے بٹھی کر دیا۔ سنہری سکوں کے کام میں سنہری ستاروں والا پرس بالکل چھپ سا گیا تھا۔ کم از کم اب کوئی اس کا پرس چھین تو نہیں سکتا تھا۔

مسز عبداللہ کا پتا اس کے پاس تھا۔ ہالے سے ان کا نمبر لے کر ان کو فون بھی کر دیا تھا۔ جب سے وہ ترکی آئی تھی، ان کے گھر پلٹ کر نہیں گئی۔ اب اسے لازمی جانا چاہیے تھا۔

گورسل میں وہ درمیانی راستے والی نشست پر بیٹھی تھی۔ راستے کے اس طرف معصم اور اس کے ساتھ لطیف بیٹھا تھا۔ حیا کے بائیں طرف کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر ایک ترک لڑکی موجود تھی۔

”تمہارا قلوبیلا فلسطین کب پہنچے گا معصم!“ وہ سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے پچھتی گردن موڑ کر اس سے مخاطب تھی۔

”جون میں پہنچ جائے گا۔“

”اسرائیلی اسے داخل تو ہونے دے گا؟“

”امید تو ہے کیونکہ یہ قلوبیلا ترکی کا ہے، اور اس میں بہت سے ممالک کے وفد ہیں۔“ جواب لطیف نے دیا تھا۔

”اور اگر اسرائیلیوں نے ایسا نہ ہونے دیا تو؟ آخری اسرائیل سے کسی بھی چیز کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

”تو پھر یہ یاد رکھنا کہ جتنے ہی اسرائیل وہ ہیں اتنے ہم بھی ہیں۔ وہ سامنے دیکھو! وہ اسرائیلی ایجینسی ہے! معصم کے اشارے پر ان دونوں نے گردیں اوچی کر کے وینڈ اسکرین کے پار دیکھا، جہاں ایک جھنڈے والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔

”فکر قلوبیلا غرہ نہ پہنچا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ ایجینسی اسٹبل میں دوبارہ نظر نہیں آئے گی۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ لطیف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”جی تو!“ حیا نے فوراً کہا۔

”جی تھری!“ ساتھ بٹھی ترک لڑکی نے فوراً انگلی اوپر کی۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

”دیے معصم!“ بالی کو اغوا کرنا زیادہ مناسب رہے گا نہیں، لطیف کی بات پر وہ سب ہنس پڑے تھے۔ اسے یاد تھا، ڈی جے کو ان کی ٹالی سے دوستی کتنی بری لگتی تھی۔

ٹائم اسکوائر مغرب اتر رہی تھی اور ہر طرف اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اسکوائر کی بتیاں ایک ایک کر کے جلنے لگی تھیں۔

”تم نے جدھر جانا ہے، ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اکیلی مت جاؤ۔“ وہ دونوں بس سے اتر کر اس کے لیے رکے کھڑے تھے۔

”ترکوں کے ساتھ رہ کر تم بھی ترک بن گئے ہو۔ ان پر خلوص ترکوں سے راستہ پوچھو تو منزل تک پہنچا کر آتے ہیں۔“

”ادام!“ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ ان پر خلوص ترکوں کے اس ملک میں ہر سال تقریباً پانچ سو لاکھ اغوا کر کے آگے بچھڑی جاتی ہیں اور یہ ترکی کا سب سے منافع بخش کاروبار ہے۔“

”چھاب ڈراؤ تو مت مجھے تھوڑی دور ہی جانا ہے۔“ وہ تینوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگے تھے۔

”تم اپنی آنٹی کے گھر جا رہی ہو؟“

”ہاں مگر مجھے ابھی اپنی ہو سٹ آنٹی کے گھر بھی جانا

ہے۔ کچھ دن بعد جب میں واپس آؤں گی تو اس پزل باکس کا حل ڈھونڈیں گے۔“

وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈی ہوا میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مجسمہ آزادی ان کے پیچھے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

لاؤنج میں سوگوارت سی چھائی تھی۔ مسز عبداللہ اور ان کی سرخ بالوں والی بیٹی مریم مغموم سی سامنے صوفوں پر بیٹھی تھیں۔ حیا کے صوفے سے ذرا دور کارپٹ پر مہر کی بیٹی عروہ کشن کا سہارا لیے نیم دراز ریوٹ پکڑے لیوی پر کارٹون دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو پتا ہے، ہم دونوں ہر ہفتے آپ کی طرف چکر لگانے کا پلان بناتے تھے مگر ہر دفعہ کچھ نہ کچھ روک لیتا اور اب اس نے سانس سے سر جھکا۔“

”تم مجھے اسی روز بتا دیتیں تو کم از کم میں اسے دیکھ ہی لیتی، پھر کلیئر کس میں تمہاری مدد ہی کروا دیتی۔ تم کتنی پریشان رہی ہو!“

”مجھے تو اپنی آنٹی کو بتانے کا بھی ہوش نہیں تھا، ایسا اچانک دھوکا لگا تھا کہ۔“ اس نے فقروادھورا چھوڑا اور سر جھکا کر انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ اونچھا۔ مہر نے بہت فکر مندی سے اسے دیکھا۔

”تم بہت کمزور ہو گئی ہو پہلے سے حیا! اور تمہاری رنگت بھی کم ہلا گئی ہے۔“

”بس۔۔۔ بخار ہو گیا تھا اور پھر سفر کی ٹکٹ!“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ وہ واقعی بہت پرشمرہ اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

”میں ذرا کھانے کا کچھ کر لوں۔“ مسز عبداللہ انھیں تو وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

”کھانا پچھو کی طرف ہے۔ میں بس چائے پیوں گی۔“

”پھر مجھے صرف دس منٹ دو۔“ وہ جگت سے کہتی کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ مہر بھی ان کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی، پھر عروہ کو دیکھا۔



”عروہ! تم جیسا کہ کمپنی دو اور فادر گاڑ سیک! جب کوئی سہانہ آتا ہے تو بیوی نہیں دیکھتے۔“ اس نے جاتے جاتے خفگی سے بچی کو حورا۔ عروہ گڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور مرکز جی کو دیکھا، پھر سادگی سے مسکرائی۔

”کوئی بات نہیں۔ تم بے شک کارٹون دیکھ لو۔ میں بور نہیں ہوں گی۔ ویسے کون سا کارٹون ہے یہ؟“ اسے کارٹون ذرا شناسا لگے تو آنکھیں سیکڑ کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔

”کیپٹن ہلنٹ۔ آپ نے دیکھے ہیں کبھی؟“ عروہ دبے دبے جوش سے بتاتی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ارے! یہ کیپٹن ہلنٹ ہیں؟ میرے فیورٹ! وہ ایک دم خوشی سے کتنی صوفے کے نشست پہ آگے کو ہوئی۔

”مجھے یہ بہت پسند ہیں اور لیزا تو بہت ہی زیادہ ...

عروہ! میری تو جان بھی کیپٹن ہلنٹ میں۔ میں

بچپن سے ہی ان کی بہت جتنی فین رہی ہوں۔ جب یہ سارے ہلنٹس زاپا اپنی انگوٹھیاں فضا میں بلند کر کے فائر آرٹھ وینڈ وائر چلاتے تھے تو میرے اندر اتنی انرجی بھر جاتی کہ مجھے لگتا میں ابھی اڑنے لگوں گی۔“

وہ چھوٹے بچوں سے کبھی بھی اتنی بے تکلف نہیں ہو پاتی تھی مگر یہاں معاملہ کیپٹن ہلنٹ کا تھا۔

”پھر میرے بابائے مجھے سمجھایا کہ آگ مٹی ہوا اور

پانی ہمارے اس سہارے کو بنانے والے

چار اہم عناصر ہیں۔ تب پہلی دفعہ مجھے ان چار یونانی عناصر کا پتا چلا تھا۔“

”ہاں مجھے پتا ہے۔ ماما نے مجھے بتایا تھا کہ یہ یونانی

عناصر ہیں۔“

”مجھے بھی تب ہی بابائے بتایا تھا کہ کس طرح یونانی

فلسفیوں نے یہ چار عناصر باری باری پیش کیے۔ وہ کہتے

کتے ایک دم رکے۔ لمحے بھر کو اس کے اندر باہر بالکل

سناٹا چھا گیا۔

”یونانی عناصر! اس نے بے یقینی سے زیر لب

دہرایا۔ اسے یاد تھا یہ عناصر یونانی فلسفیوں نے پیش

کیے تھے کسی نے کہا دنیا پانی سے بنی ہے، کسی نے کہا ہوا سے۔ اور وہ ہر عنصر اس فلسفی کی پہچان نہ کیا۔

”ہرا قلیطس کا عنصر کون سا تھا؟“ وہ خود سے پوچھتی جیسے چونک اٹھی۔ عروہ منتظر لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”عروہ! مجھے ٹیٹ چاہیے، ابھی اسی وقت! وہ بے چینی سے بولی تو عروہ سر ہلا کر اٹھی اور صوفے پر سے ایک آئی بوڈا اٹھا کر اسے دیا۔

”یہ مٹی کا آئی بوڈا لے لیں۔“

”تھینکس! اس نے آئی بوڈا پکڑ کر اس کا محال تختہ پھیرا اور جلدی جلدی گوگل گوگل کرنے لگی۔

”تقریباً“ آدھ گھنٹے بعد جب وہ ان کو خدا حافظ کر کے باہر آئی تو سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس نے کوٹ

کی جیب سے اپنا ترک فون نکالا اور تیزی سے معتمد کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

”جیا! خیریت؟“ وہ فون اٹھاتے ہی ذرا فکر مند

سے بولا تھا۔

”معتمد! تمہیں پتا ہے یونانی فلسفیوں نے زمین کی

تخلیق کی وضاحت کرنے کے لیے کچھ عناصر پیش کیے

تھے کہ زمین ان سے مل کر بنی ہے؟“ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔

”جیا! میرے خیال ہے تم ذرا تھک گئی ہو، تھوڑا سا

ریسٹ کرو، اس کے بعد تم نارمل ہو جاؤ گی۔“

”معتمد! اس نے جھنجھلا کر زور سے کہا۔ ”میں

سچیہ ہوں۔ میری بات سنو! ہم کو خواہ اس نیم پاگل

آوی کی سوانح عمری پڑھ رہے تھے۔ ہمیں اس کی

فلاسنی چاہیے تھی۔ اس دور کے ہر فلسفی نے اپنا ایک

عنصر پیش کیا تھا اور اس کے خیال میں زمین کی ہر چیز

اس عنصر سے بنی تھی۔ کسی نے کہا دنیا پانی ہے، کسی نے

کہا ہوا، اور یوں ان چاروں، بلکہ پانچوں عناصر کی

فہرست مرتب ہوئی تھی۔ ہرا قلیطس کا عنصر

”آگ“ تھا اور یہی اس کی پہچان تھا۔“

”فائر؟“

”ہاں“ فائر ہرا قلیطس کی دائمی آگ۔ اس نے آگ

کی بنیاد پر اپنی فلاسنی آف چیئنج پیش کی تھی۔ معتمد معتمد! انسان ایک دریا میں دو دفعہ کیوں نہیں اتر سکتا؟ کیونکہ انسان اور دریا دونوں ہرا قلیطس کے خیال میں آگ سے بنے تھے اور دنیا میں سب سے زیادہ تبدیل ہونے والی چیز آگ ہے جو ہر لمحہ بدلتی

ہے۔ اور جو ہر چیز کو بدل دیتی ہے۔ اس بزل باکس پہ لکھی بات ایک ہی لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے

جو ہے ”فائر“۔ وہ کالونی کے سرے پہ کھڑے ہو کر فون پہ کہہ رہی تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اسٹریٹ

پو لڑ جل اٹھے تھے۔

”مگر جیا فلائرس تو چار حروف ہوتے ہیں۔ یہ کوڈ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ کوڈ ہے بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے آگ“ اصلی والی آگ، ٹائی کالاسٹر، اسرائیلی آگ، یاد ہے

تمہیں؟“

”وہ مائی! اسے ایک لمحہ لگا تھا سمجھنے میں۔ ”تمہارا

مطلب ہے کہ اس نے آگ کی طرف اشارہ کیا ہے

کیونکہ اس خط کی طرح اس باکس پر بھی کچھ

لکھا ہو گا جو۔“

”جو صرف آج دکھانے سے ظاہر ہو گا۔“ اس نے

مسکرا کر کہتے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔

”خیریت ہے یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟“

”کیونکہ تم کافی تھک گئے ہو، ذرا آرام کرو، پھر تم

ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

وہ خوابا نہیں دیا تھا۔

”چلو پھر تم رات کو واپس آؤ گی تو اس باکس کو

کھولیں گے۔“

”نہیں میں آج رات واپس نہیں آؤں گی۔ میں

آئی کی طرف رکوں گی۔“

”تمہاری اپنی اپنی پھر وہ سوٹ آئی؟“

”میں۔“ عروہ اس کے لبوں میں رہ گیا۔ کسی نے

اس کے کان پہ لگا فون زور سے کھینچا تھا۔ اسے مرنے یا

چیننے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ کسی نے اس کے منہ پہ

ہاتھ رکھا اور کوئی سوئی کی ٹوک تھی جو اس کی گردن کے

آس پاس کہیں کبھی تھی۔ لمحے بھر کا عمل تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندر بے بادل چھانے لگے۔ وہ چٹنا چاہتی تھیں۔ دل دماغ کے سن ہونے سے قبل جو آخری بات اس نے سوچی تھی وہ یہ تھی کہ کوئی اسے پیچھے کی طرف ٹھیک رہا تھا۔ اور پھر۔۔۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔

☆☆☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ بدقت پلکیں اوپر اٹھیں تھیں ان پہ جیسے بہت بوجھ سا تھا۔

ہر سو اندھیرا تھا۔ گھبراہٹ ایسے پڑی تھی کہ گردن وار سے لگی تھی اور گھٹنے سینے سے۔ وہ جیسے ایک

بہت تنگ و تاریک جگہ پر بہت سے سالان کے اندر کہیں پھنسی بیٹھی تھی۔

اس نے آنکھیں چند ایک بار جھپکائیں۔ منظر دوسرا

ہی رہا۔ اندھیرا تاریکی، بس اتنا احساس ہوا کہ وہ کسی

تنگ سے کمرے میں ہے جہاں اس کے دونوں

اطراف دونی چیزیں رکھی ہیں۔

اس نے کنبیوں کے بل ذرا سا اٹھنا چاہا تو دائیں

ہاتھ میں کھینچاؤ تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچا۔ ذرا سا لوہا

کھٹکا۔ اس کی دائیں کلائی میں ہتھکڑی ڈلی تھی اور وہ

دو پار سے بندھی تھی۔ اس نے زور سے کلائی کو جھکا

مگر بے سود۔

اس کے سر اور کمر میں بے تحاشا درد ہو رہا تھا، جیسے

کوئی چوٹ لگی ہو۔ بمشکل وہ اپنے آپ پہ قابو پاتے

ہوئے، دوسرے ہاتھ کے سہارے ذرا سی سیدھی

ہو کر بیٹھی۔ بائیں جانب کوئی بوجھ سا اس کے اوپر

گرنے لگا۔ اس نے آزاد ہاتھ سے اسے برے دھکیلا

تو وہ نرم سا بوجھ دوسری جانب ذرا سا لڑھک گیا۔

جیانے گردن موڑی۔ دوسری ایک ٹیس بے اختیار

اٹھی۔ اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ پیچھے دیوار لکڑی

کے پھٹیوں سے بنی تھی اور پھٹیوں میں باریک سی

درزیں تھیں۔ اب ذرا آنکھیں اندھیرے کی عادی

ہوئیں تو اسے نظر آیا۔ ان درزوں سے رات کی تاریکی



میں زردی روشنی جھانک رہی تھی۔ وہ مدت چہ اس درز کے قریب لائی اور آنکھیں سکیڑ کر جھانکا۔  
باہر ہر سو سمندر تھا۔ سیاہ پانی جورات کے اس پہر زرد روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ پل کی روشنیوں میں وہ پل ہی تھا۔ وہ باغیچوں کے سمندر پر بنے اس پل کے آس پاس ہی نہیں تھی۔ مگر وہ باغیچوں سے بنی تھی تھا۔ وہ ذرا مختلف لگ رہا تھا۔ یا شاید وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پاری تھی۔

بائیں طرف موجود بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔ اس نے کوفت سے اس پرے دھکیلا تو اس کا ہاتھ نم ہو گیا۔ وہ نم ہاتھ چہرے کے قریب لائی اور دور سے آتی روشنی میں دیکھنا چاہا۔ اسے نمی کا رنگ تو نظر نہیں آیا مگر وہ۔ وہ خون تھا۔

وہ متوحش سی ہو کر ہاتھ اپنے کپڑوں سے رگڑنے لگی۔ اس کا کوٹ اس کے جسم پہ نہیں تھا۔ جو واحد خیال اسے اس وقت آ رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ اسے عبدالرحمان پاشا نے اغوا کروا لیا تھا۔

زور زور سے وہ اپنا ہاتھ سنہری سکوں سے رگڑ رہی تھی جب اس کی انگلیاں ذرا بھاری سی چیز سے ٹکرائیں۔ وہ ٹھہری اور اسے ٹٹولا۔

اس کا چھوٹا سنہری کچ جو فراک کی پیٹ کے ساتھ نتھی تھا۔ اس کے سر میں درد سے تیس اٹھ رہی تھیں۔ ذہن میں اپنی اور پھپھو کی آخری گفتگو گونج رہی تھی۔ اس نے شام میں انہیں یقین دلایا تھا کہ رات کھانے پر وہ ان کے ساتھ ہوگی۔ اب جانے کون سا وقت تھا، پھپھو نے اس کا انتظار کیا ہو گا اور اسے نہ پا کر کیا ان کے ذہن میں آیا ہو گا کہ وہ اغوا ہو گئی ہے؟

اس نے اپنے آزاد ہاتھ سے کچ کھولا۔ اندر اس کا پتلا سا پاکستانی موبائل رکھا تھا۔ انہوں نے اس کا فون کیوں نہیں لیا، وہ سمجھ گئی تھی۔ اس کا ترک فون بھیج کر انہوں نے سمجھا ہو گا کہ وہ اسے رابطے کے ہر ذریعے سے محروم کر چکے ہیں اور فراک کے ساتھ نتھی کچ پہ ہم رنگ ہونے کے باعث کسی نے غور

نہیں کیا ہو گا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس دو فون تھے۔ مگر عبدالرحمن پاشا کو تو معلوم تھا لیکن۔  
اس نے اسکرین کو چھوا تو وہ روشن ہو گئی۔ بند کمرے میں مدھم مدھم کی سفید روشنی جل اٹھی۔ اس موبائل میں موش کی مہندی کے روز ہی اس نے بیلنس ڈلوایا تھا اور یہ پاکستانی نمبر تھا جس کی رو منگ آن تھی۔ معلوم نہیں کتنے میسے بچے تھے، ایک کال کے تو ہوں گے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بیلنس چیک کیا۔ اس میں اتنے ہی روپے تھے کہ وہ ترکی کے کسی نمبر پہ تیس سیکنڈ کی کال کر سکتی بس۔ اتنی سی دیر میں بھی وہ جہان کو اپنی صورت حال سمجھا سکتی تھی۔

وہ جلدی جلدی فون بک نیچے کرنے لگی۔ ”بے“ میں جہان کا نمبر نہیں تھا اس نے ”سی“ میں دیکھا۔ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ ذرا حیرت سے سین پھپھو کا تلاش کرنے لگی۔ ان کا نمبر بھی غائب۔ بس پاکستانی نمبر تھے۔

”کیوں؟“ اس نے دیکھتے سر کے ساتھ سوچنا چاہا اور تب ایک جھمکے سے اسے یاد آیا۔ یہ پاکستانی موبائل تھا اور ترکی کے سارے نمبرز اس نے اپنے ترک فون میں محفوظ کر رکھے تھے۔ اب وہ گھر فون کر کے اپنے اغوا کا نہیں بتا سکتی تھی اور نہ اتنا بیلنس تھا کہ وہ انہیں فون کر کے جہان کا نمبر لیتی۔ تیس سیکنڈ کی کال اسے ضائع نہیں کرنی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سردیوار سے لگا دیا۔ وہ سوچنا چاہتی تھی، فرار کا کوئی رستہ، مدد کی کوئی صورت، اور تب ہی اس نے لکڑی کی اس دیوار کے پار وہ آوازیں سنیں۔ علی میں تیز تیز بوتلیاں آدی جیسے دور سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

”پاشا تمہیں جان سے مار دے گا اگر اسے علم ہوا کہ تم اس کی لڑکی اٹھا دے ہو۔“  
”یہ بھری جہاز روانہ ہو جائے، پھر میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا جہاں پاشا کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔“ دوسری آواز ذرا جھنجھلائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسی دیوار کے پیچھے باتیں کر رہے تھے۔

”تم امید کرو اور تم اچھی امید کرو، کیونکہ اگر پاشا کہے۔“ آوازیں دور جاری تھیں۔ اب وہ مبہم ہو گئی تھیں۔

اس نے ان کی باتوں پہ غور کرنا چاہا۔ وہ پاشا کا ذکر کر رہے تھے کچھ ایسا جو اس کے علم میں نہیں تھا۔ بحری جہاز کی روٹ اور پاشا کی لاعلمی۔ تو کیا پاشا کے کہنے پہ اغوا نہیں کی گئی تھی؟

وہ گھٹتی ہی دیر اپنے درد کرتے سر کے ساتھ سوچنے کی کوشش کرتی رہی مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔

اس فون میں ترکی کا ایک ہی نمبر تھا۔ جب وہ ریٹورنٹ میں اپنا ترک موبائل چھوڑ کر گئی تھی، تو اسے اسی پاکستانی فون پہ پاشا نے کال کیا تھا۔ اس نے وہ نمبر محفوظ نہیں کیا تھا مگر وہ کال لاگ میں پڑا تھا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے لاگ کھولا۔ وہ خالی تھا۔ صرف ایک کال تھی جو ترکی آتے ہی ابانے اس نمبر پہ کی تھی۔ بالی لاگ ارم نے منادیا تھا۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ ہر طرف اندھیرا تھا، ہر راستہ مسدود، ہر دروازہ بند، وہ یہ تیس سیکنڈ کی کال کس کو کرے؟ ہمارے ایمر جنسی نمبرز ترک فون میں تھے اور ترکی کے دوسرے نمبر اسے زبانی یاد نہیں تھے۔ فون نمبرز حیا سلیمان کو کبھی زبانی یاد نہیں رہتے تھے۔

بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔ اس نے موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی اور ایک دھپانکل شل رہ گئی۔ وہ لمبے سنہری بالوں والی ایک لڑکی تھی۔ جو اس پر گری تھی۔ اس کے منہ اور کندھے سے خون نکل رہا تھا۔ بغیر آستین کی قمیص سے جھلکتے اس کے سنہری بازو پہ کچھ لکھا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بازو پہ موبائل کی روشنی کی۔ وہاں سیاہ رنگ سے انگریزی میں لکھا تھا۔ ”Natasha“  
”ناتشا۔“ شاید اس کا نام تھا، اور وہ اس کے نام کا ایک بد صورت سائیٹو تھا۔ یا جلا ہوا کوئی دلغ۔  
اس نے موبائل کی روشنی اوپر اٹھوڑ ڈالی۔ اس جھومنے سے ڈرے میں ہر طرف لڑکیاں تھیں۔ ایک

دوسرے کے اوپر گری ہوئیں۔ بے ہوش، بے سندھ بڑی کسی کے چہرے پہ نیل تھے، تو کسی کے بازوؤں پہ خراشیں یا جھا ہوا خون تھا۔

خون کی بو اور سر میں اٹھتا شدید درد۔ اس کا جی ایک دم سے متلائے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا، وہ پھر سے ہوش کھودے گی۔ اپنے ناکارہ فون کو کھلے کچ میں ڈالتے ہوئے اس کی نگاہ اندر پڑے کارڈ پر پڑی اس نے جلدی سے وہ کارڈ نکالا۔ اطلاعات کا کالنگ کارڈ جو انہوں نے ابوظہبی میں خریدا تھا، مگر اب وہ بے کار تھا۔ اس نے اندر انگلیاں ڈال کر ٹٹولا اور پھر وہ تہہ شدہ کارڈ نکالا۔

کارڈ کو سیدھا کر کے اس نے گھٹنے پہ رکھا اور موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی۔ آف وائٹ کارڈ پہ لکھے سیاہ الفاظ روشن ہوئے۔  
”شیخ عثمان شہیر۔“

نیچے ترکی کے تین نمبرز لکھے تھے۔ آفس، گھر اور موبائل کال۔ اس کا دل نئی امید سے دھڑکنے لگا۔

اسے ایکسٹنشن یاد نہیں آ رہی تھی۔ کوئی تاریخ تھی۔ کوئی نشان، کوئی مشہور واقعہ۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ تیس سیکنڈ کی کال ضائع نہیں کرنی تھی۔ مگر اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ سر میں اٹھتا درد اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول کر دوبارہ کارڈ کو دیکھا اور کچھ سوچ کر موبائل نمبر ملایا۔ گھر اور فون کلن سے لگایا۔  
رک میں ریکارڈنگ چلنے لگی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ فون بند ہے۔ اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ گھر کا نمبر ملایا۔

گھنٹی جاری تھی۔ وہ بے چینی سے لب کاٹتی سننے لگی۔ اس کی امید کا دیوار بار جلتا بجھتا جا رہا تھا۔  
بند کرنے میں خون کی عجیب سی بو پھیلی تھی۔ اس سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ دوسری جانب گھنٹی ابھی تک جاری تھی۔  
”پلیز اللہ تعالیٰ، پلیز۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو



گرنے لگے۔  
 ”السلام علیکم۔“ اسی لمحے فون اٹھایا گیا۔  
 ”کون؟“ عثمان انگل؟“ وہ تیزی سے بولی۔  
 ”آہ۔“ نہیں میں ان کا بیٹا، صغیر؟“ وہ جو بھی تھا۔ ذرا  
 چونکا تھا۔

”میں حیا بول رہی ہوں۔ حیا سلیمان۔ میں عثمان  
 انگل کے ساتھ آئی تھی۔ اتحاد ایزر لائنز۔ سائنٹی  
 یونیورسٹی۔ ایجنسی اسٹوڈنٹ۔“ وقت کم تھا اور وہ اسے  
 تعارف میں ضائع نہیں کر سکتی تھی۔  
 ”کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”نہیں، مجھے ان لوگوں نے اغوا کر لیا ہے، یہاں پر  
 کوئی کرا ہے میں اس میں بند ہوں یہاں چھ سات اور  
 لڑکیاں بھی ہیں۔ پلیز کسی سے کہیں میری مدد کرے۔“  
 وہ تیز تیز بولتی تھی۔

”ایک منٹ۔ مجھے بتائیں آپ کس جگہ پر ہیں۔  
 کوئی آئیڈیا ہے آپ کو؟ کسی کھڑی وغیرہ سے باہر دیکھ  
 سکتی ہیں؟“

”ہاں، یہاں باہر سمندر ہے، مجھے ایک فیری نظر آ رہا  
 ہے اور ادھر ہل ہے، پاس فورس برج۔“ نہیں۔“  
 رابطہ کٹ گیا۔

اس نے بوکھلا کر اسکرین کو دیکھا اور پھر اس باریک  
 درز سے جھلکتے منظر کو۔ اس نے پاس فورس برج پر کھدیا  
 تھا جبکہ وہ پاس فورس برج نہیں تھا۔ اب وہ پہچانی تھی۔  
 یہ سلطان احمدت برج تھا۔ شہر کے دونوں حصوں کو  
 ملانے والا دوسرا ہل۔ اس نے اپنی لوکیشن ہی غلط بتائی  
 تھی۔ اب؟

وہ بے بسی سے موبائل کو دیکھ گئی بیلنس ختم ہو گیا  
 تھا اور اب وہ کل ریسیو کرنے سے بھی قاصر تھی۔  
 دروازے پر آہٹ ہوئی تالا کھلنے کی آواز۔ اس نے  
 جلدی سے فون کچ میں ڈال کر اسے بند کیا اور گردن  
 ایک طرف ڈھکا کر آنکھیں موند لیں۔

دروازہ بھاری چرچاہٹ کے ساتھ کھلا۔ کوئی اندر  
 آیا، اس پر جھک کر اس کی ہتھکڑی چابی سے کھولی اور پھر  
 اسے بازو سے کسی جانور کی طرح کھینچے باہر لے جانے

لگا۔

اس کے لبوں سے بے اختیار کراہ نکلی۔  
 وہ آوی اسے بڑے کمرے میں لایا اور اب کرسی پر  
 بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں کرسی سے باندھ رہا تھا۔  
 ”مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔“ وہ منمنائی تھی۔  
 اس نے جواباً ”ٹیپ کا ایک کلک اور انا سے کٹ کر اس  
 کے لبوں سے کس گرج چکایا۔

”آہ۔“ وہ گردن دائیں سے بائیں مارنے لگی۔  
 ٹیپ سے اس کی آواز کھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ توجہ دینے  
 بنانے لگے ڈک بھرتا ہر چلا گیا۔

اس نے نگاہیں پورے کمرے پر دوڑائیں۔ وہ  
 بڑا سا کمرہ تھا۔ ایک طرف بڑا صوفہ رکھا تھا اور دوسری  
 طرف آتش دان جس کے پاس وہ کرسی سے جھکی  
 بیٹھی تھی۔ آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔  
 ہر اقلیطس کی دکانی آگ۔ ساتھ ہی لوہے کی چند  
 سلاخیں بڑی لاٹھیاں دھک رہی تھیں۔ ان کے سرے  
 انگریزی کے مختلف حروف لکھے تھے اور وہ حروف  
 دھک دھک کر سرخ انگارے بن چکے تھے۔

آتش دان کے ایک طرف ایک چھوٹی انگیٹھی  
 رکھی تھی۔ اس میں جلنے انگاروں پر ایک برتن میں شہد  
 کی طرح کا گاڑھا سامان ابل رہا تھا۔ اس کی بوسارے  
 میں پھیلی تھی۔ شہد سے زیادہ بھورا مالخ۔ وہ شاید  
 ویکس تھی۔

اس نے گردن گرا دی۔ اس کی ہمت ختم ہوتی  
 جاری تھی۔ وہ اب بہت دیر سے اس کمرے میں تھا۔  
 پڑی تھی اور یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔  
 اسے لگ رہا تھا اس نے وہ کل ضائع کر دی۔ بتائیں وہ  
 کون تھا اور اسے اس کی بات سمجھ میں آئی تھی یا  
 نہیں اور وہ کچھ کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر وہ گھر فون  
 کر لیتی تو شاید۔ مگر نہیں، گھر فون کرنے کی صورت  
 میں بات پھیل جاتی اور اس سے تو بہتر تھا کہ وہ یہیں  
 پڑی رہتی۔ لیکن بات تو اب بھی پھیل جائے گی اور جو  
 ذلت جو بدنامی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے  
 سامنے وہ بھولی بھری ویڈیو آگئی۔

شریفوں کا ہجر۔

”نہیں، پلیز اللہ تعالیٰ، پلیز میری مدد کریں۔“ وہ  
 بھیگی آنکھوں کے ساتھ دعا مانگے گئی۔ اس کی دعا پہلے  
 قبول نہیں ہوئی تھی، شاید اب ہو جائے، شاید اب  
 اس کی مدد کر دی جائے۔

آتش دان کے قریب ہونے کے باعث تپش اس  
 تک پہنچ رہی تھی اور اس مسلسل حدت سے اس کے  
 پاؤں دھنسنے لگے تھے۔ وہ زرد لاٹھ کو دیکھ رہی تھی جس کی  
 سرخ لپٹیں اٹھ اٹھ کر ہوا میں گم ہو رہی تھیں۔ گرمی  
 بڑھتی جا رہی تھی اس کا سارا وجود کویا آگ میں دھک رہا  
 تھا۔ لمبے بال کمر اور کندھوں پر بکھرے تھے، وہ ان کو  
 سمیٹنے پر بھی قادر نہیں تھی۔ اس نے پورا زور لگا کر  
 کرسی کو پیچھے دھکیلا، مگر وہ نہیں ہلے۔ پسینے کی چند  
 بوندیں اس کی گردن اور پیشانی پر چمک رہی تھیں۔

دفعاً ”دروازہ کھلا۔“ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ  
 ایک پتہ قد، چینی نقوش کا حامل شخص تھا۔ اس کے  
 ہاتھ میں ایک چھوٹا ٹیک تھا۔ جسے اس نے کمرے میں  
 داخل ہوتے ہی میز پر رکھا پھر اس کی طرف آیا اور ایک  
 ہاتھ سے کرسی کا سرخ اپنی جانب موڑا اور ہاتھ سے  
 ڈک ٹیپ کا کنارہ پکڑ کر کھینچ کر اتارا۔

”آہا۔“ نتاشا! وہ قریب سے دیکھنے پر کوئی روسی  
 لگتا تھا۔

”میں نتاشا نہیں ہوں، پلیز مجھے جانے دو۔“ ایک  
 امید سی بندھی کر وہ اسے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ  
 لائے تھے۔

”ناؤ یو آر نتاشا۔ انگلش؟ انگلش؟ آل رائٹ، آل  
 رائٹ! وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکراتا ہوا انگیٹھی کی  
 طرف بڑھ گیا۔

”پلیز مجھے جانے دو۔“ وہ اس کی پشت کو دیکھتے  
 ہوئے منت بھرے لمحے میں بولی۔ وہ آگ کے سامنے  
 کھڑا تھا۔ تپش کا رستہ رگ گیا۔ زرا سا سکون ملا۔

”پور کٹنی، تو رستہ گرل، پور پیمپل!“ وہ نفی میں  
 سر ہلا کر ایک سلاخ اٹھائے اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا  
 تھا۔

”میرا باپ امیر آدمی ہے، وہ تمہیں تالوں کی رقم  
 دے دے گا۔“

”سو متشا، یو وائٹ انگلش نیم؟“ وہ ٹوٹی پھوٹی  
 انگریزی میں کتا اس کی طرف پلٹا۔ وہ جواب دینے بنا  
 یک ٹک اس سلاخ کو دیکھ گئی جس پر لکھا ”نیم“  
 دھک رہا تھا۔ یا شاید وہ ”ڈبلو“ تھا۔

وہ سلاخ کیوں دھک رہا تھا؟ کس لیے؟

ایک خوف سا اس کے اندر سراٹھانے لگا۔ اسے  
 بے اختیار اس کمرے میں بے سدھ بڑی لڑکی کا بازو یاد  
 آیا۔ وہ ٹیو نہیں تھا۔ وہ لمبے بھر میں جان گئی تھی۔  
 ”یو وائٹ انگلش نیم؟“ وہ اس کے بالکل سامنے  
 آکھڑا ہوا تھا۔

”نہیں۔“ وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتی  
 جڑ پڑاتی۔

”ناؤ اس از یور نیم!“ وہ سلاخ کا دھکٹا لوہا اس کے  
 قریب لایا۔

”نہیں۔“ نہیں۔“ وہ گردن دائیں بائیں ہلاتی  
 زور سے چلانے لگی۔ وہ اسے اس گرم لوہے سے  
 داغنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ خوف و دہشت سے سفید پڑ گیا  
 تھا۔

”یور نیم!“ اس نے جتا کر کتنے سلاخ حیا کے بازو  
 کے قریب کی جہاں فراک کی چھوٹی آستین ختم ہوئی  
 تھی۔ کندھے سے ذرا نیچے وہاں وہ سلاخ قریب لے  
 گیا۔ اسے دھتے انگارے کی حدت محسوس ہوئی۔ وہ  
 تڑپ کر ادھر ادھر سر مارنے لگی۔

”نہیں پلیز۔“ نہیں۔“

اس لمحے اس نے بہت دل سے دعا کی تھی کہ کوئی  
 آجائے اور اس پتہ قد روسی سے اسے نجات دلا دے۔  
 کوئی آجائے، چاہے وہ عبدالرحمن پاشا ہی کیوں نہ  
 ہو۔ کوئی تو۔

روسی نے دھتکا ہوا لوہا اس کے بازو کے اوپری حصے  
 پر رکھ کر دیا۔ وہ بری طرح سے ہلکا اٹھی۔ اس کے  
 حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی تھی مگر وہ اسی طرح  
 زور دے کر سلاخ دبائے کھڑا تھا۔



اندر سے اس جلنے لگا تھا۔ وہ روح میں اتر جانے والی زخمی کر دینے والی بدترین جلن تھی۔ وہ چیخ رہی تھی وہ دور رہی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے سلاخ اٹھالی۔ وہ مکمل طور پر جل گئی تھی۔

روسی دوبارہ پٹنا اور سلاخ رکھ دی۔ اس کے دائیں بازو کے اوپر ہی حصے پہ سیاہ جلا ہوا حرف لکھا تھا۔

روسی واپس اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ جانے متورم سرخ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور دہل کر رہ گئی۔

اس کے ہاتھ میں دوسری سلاخ تھی جس پہ HO لکھا تھا اور اوپر تلے لکھے دونوں حرف انگارہ بن چکے تھے۔

”نہیں۔۔۔ تمہیں اللہ کا واسطہ نہیں۔“ وہ وحشت سے تڑپتی خود کو پیچھے دھکیلتے ہوئی مکرر سیوں نے اسے اتنی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل بھی نہ پائی۔

”نہیں۔“ وہ خوف سے چلا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا سیاہ داغے گئے حرف تلے سلاخ گاڑ دی۔

کھولتا ہوا گرم درد دیکھتے انگارے، آگ اس کی تکلیف آخری حد کو چھوئے گی۔ وہ درد سے کھٹی کھٹی سی چیخ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اس تکلیف سے مرنے والی ہے۔ وہ جسم کے اندر تک گھس کر جلا دینے والا درد تھا۔

چند لمحوں بعد اس نے سلاخ ہٹائی تو حیا کی گردن بے دم کی ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی۔ اس کا تنفس آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ تکلیف سے وہ ہوش کھونے والی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیجا تھا مگر مزید روکنے کی سکت وہ خود میں نہیں پاتی تھی۔

روسی اب تیسری سلاخ اٹھا لیا تھا۔ اس پہ RE لکھا تھا۔ حیا نے تکلیف سے بند ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس میں مزید کچھ کہنے کی سکت نہیں رہی تھی، اپنی ساری زندگی فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ بچپن کے دن یادیں اس کے ٹانا کا گھر اس کی نانی اس کے لمبے بالوں میں گنگھی پھیر

رہی تھیں۔ منظر بدل گیا۔ وہ اور روحیل کار کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھے تھے، اسکول بیگ لیے، وہ اسکول جا رہے تھے روحیل کچھ تباہ تھا اور وہ ہنس رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو ابائی لا بریری میں دیکھا۔ وہ ان کی ایک مولیٰ سی کتاب کھول رہی تھی جس میں سوکھا پھول رکھا تھا۔ وہ اس نے خود ہی وہاں رکھا تھا۔ اب وہ تباہ فرقان کو اپنے عید کے کپڑے پیٹنگ سے اٹھائے دکھا رہی تھی اور وہ اس کا جوش و خروش اور خوشی دیکھ کر مسکرا رہے تھے روحیل اس کے ساتھ لان میں بھاگ رہا تھا، ان کے آگے دو خرگوش دوڑ رہے تھے وہ دوڑ دوڑ کر تھک گئی تھی۔ اس کے لمبے بال کمر پہ بکھرے تھے۔ خرگوش گھاس پہ دوڑ بھاگتے جا رہے تھے۔ سفید نرم نرم سے خرگوش۔

روسی نے گرم سلاخ اس کے بازو سے مٹس کی، ایک کھولن سی اس کے اندر اترتی گئی۔ اگلے ہی بل اس نے کرنٹ کھا کر سلاخ ہٹائی کہیں فون کی کھنٹی بجی تھی۔

خرگوش غائب ہو گئے۔ درد ہر شے پہ غالب ہو گیا۔ وہ پہلی دودھ سے کی گنا زیادہ شدید درد تھا کہونکے سلاخ جلدی ہٹانے کے باعث جلد پوری نہیں جلی تھی اور حساب باقی تھیں۔ اسے لگتا تھا اس کی ہمت ختم ہو گئی ہے مگر وہ پھر سے رو رہی تھی۔

”فون؟ یور فون؟“ آواز کے تعاقب میں وہ آگے بڑھا اور اس کے فزاک کی بیٹ سے لگا پر اس نوجوان سیٹف ہی بن ٹوٹ گئی، کپڑا پھٹ گیا۔ اس نے تیزی سے پرس کھولا اور فون نکالا۔ وہ زور زور سے سن رہا تھا۔

شدید تکلیف میں بھی جو پہلی بات اس کے ذہن میں آئی تھی وہ یہ تھی کہ اس کا فون رو منگ پہ تھا اور بیلنس ختم پھر فون کسے بجایا؟

روسی کبھی بے یقینی سے اسے دیکھتا، کبھی فون کو۔ پھر اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اس پہ اس نے جلدی سے فون بند کیا اور پوری قوت سے اسے دیوار پہ دے مارا۔ فون کی اسکرین چمکتا چور ہوئی زمین پہ جاگری۔

”یو کالڈ سم دن؟“ وہ وحشیوں کی طرح اس پہ چھپتا اور گردن کے پیچھے سے بال دبوچ کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔ حیا نے نیم جاں بیڑھا حال آنکھوں سے اس کو دیکھا اور پھر اس کے منہ پہ ٹھوک دیا۔

وہ بلبلہ کر پیچھے ہٹا۔ اس کے بال چھوڑے اور انگیٹھی پہ دھکتا برتن ہینڈل سے اٹھایا۔ کھولتی ہوئی ویکس۔

”یو۔۔۔ یو؟“ وہ غصے میں مغالطت بکاتا اس کے قریب آیا اور برتن اس کے سر پہ اونچا کیا۔

”نن۔۔۔ نو۔۔۔“ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ”میرے بال۔۔۔“ اس کے لبوں سے بس اتنا ہی نکل پایا تھا کہ روسی نے برتن اس کے سر پہ الٹ دیا۔

گرم کھولتی ہوئی ویکس تیزی سے اس کے بالوں کی مانگ پہ گری اور ہر طرف سے پیچ لڑھکنے لگی۔ اس کی دلخراش چیخ نکل۔ اگلے بارے نے اس کے سر کی جلد کو گلا دیا تھا۔ بازو کا درد غائب ہو گیا وہ وحشانہ انداز میں زور زور سے چیخ رہی تھی، اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بھی چیخ رہا تھا۔ اور تب اس نے زور سے اس کی کمری کو دھکا دے کر الٹ دیا۔ وہ کمری سمیت اوندھے منہ زمین پہ جاگری۔ آتش دان کے بالکل قریب۔

کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ ویکس اس کے سر پر جھننے لگا تھا۔ اس کا سر بے حد ذہنی ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ کمرے میں دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔ آتش دان سے آگ کی لپٹیں لپک لپک کر اس کی طرف آ رہی تھیں۔

اس نے زمین پہ گرے پھل فرش پہ رکھے بند ہوئی آنکھوں سے اس دھندلے منظر کو دیکھا۔ دھوئیں کے اس پار کوئی اس روسی کا سر پکڑ کر دیوار سے مار رہا تھا۔ چیخیں دھواں، آگ، خون۔ اس کا پورا جسم آگ میں دھک رہا تھا۔

جو آخری شے اس نے دیکھی وہ اس کا سیاہ فزاک کا دامن تھا۔ آگ کی ایک لپٹ نے اسے چھو لیا تھا۔ اس

نے سیاہ کپڑے کو زرد شعلے میں بدلتے دیکھا۔ ہر طرف دھواں تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ مری رہی تھی۔ اس کے سفید خرگوش اس دھوئیں میں غائب ہو رہے تھے۔ وہ جل کر مری رہی تھی، ہر اقلیدس کی دائمی آگ ہر سو پھیل رہی تھی۔

\*\*\*

اس نے دیر سے آنکھیں کھولیں۔ وہ سپر سفید چھت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی جس پہ خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔ درمیان میں ایک قیمتی یو نیس فانوس لٹک رہا تھا۔

اس کا سر ایک نرم گلداز تکیے پہ تھا اور مخملیں کبل گردن تک ڈالا تھا۔ اس نے ایک خالی خالی سی نگاہ کمرے پہ دوڑائی۔ وسیع و عریض پر تعیش بیڈ روم، ایک طرف دیوار گیر کھڑکی کے آگے برابر کیے گئے سفید جالی دار پردے جن سے صبح کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

اس نے آنکھیں پھر سے موند لیں اور ان پہ بازو رکھ لیا۔ ان گزریے دنوں میں سوچی جاگتی کیفیت میں وہ بہت روئی تھی بہت چلائی تھی۔ یہ کمر اس نے دیکھا تھا۔

وہ ادھر ہی لائی گئی تھی۔ ہاتھ سے گئی ڈرپ اپنے بالوں میں نرمی سے جلتے اس سموری آنکھوں والی لڑکی کے ہاتھ وہ انجکشن قنیم بے ہوشی۔ اسے ٹوٹا ٹوٹا سا سب یاد تھا اور اس ڈوبتی ابھرتی نیند میں بھی وہ جانتی تھی کہ وہ بیوک اوامیں ہے عبدالرحمن پاشا کے سفید محل میں۔

دروازے پہ دیر سے دستک ہوئی اور پھر وہ ہلکی سی جڑا ہٹ کے ساتھ کھلا۔ قدموں کی نرم سی آواز بیڈ کے قریب آئی۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کون تھی۔

”صبح بخیر! نیند پوری ہو گئی ہے تو اٹھ جاؤ، ناشتا کرلو۔“

باقی آئندہ شمار میں





محبت میں قرب کے طریقے اور ہوتے ہیں  
مقدار اور ہوتا ہے، ستارے اور ہوتے ہیں  
محبت مجلسی باتوں سے کب پروان چڑھتی ہے  
جو تہذیبیں بدلتے ہیں، وہ قلعے اور ہوتے ہیں  
دلوں میں جھانکنے والی نظر کچھ اور ہوتی ہے  
نظر آتے نہیں جو، وہ تماشے اور ہوتے ہیں

### اعتبار

پھول کھلنے لگے

زخم سلنے لگے

ابتلائے محبت کے ہیں روز و شب

شبہی شبہی ایک احساس ہے

دھیمی دھیمی سی جاگی ہوئی پیاس ہے

اب کہیں بھی رہے

تو مرے پاس ہے

خالد معین

ہم اس کو دیکھ کر انکس جھکالتے ہیں اس دے  
کہ جو تصویر ہوتے ہیں، وہ لمحے اور ہوتے ہیں

بھٹکنے کے سوا کیا کیجیے ان رہ گزاروں میں  
جو منزل پر پہنچتے ہیں، وہ رستے اور ہوتے ہیں

ہمیں لگتا ہے محسن، زندگی ہم سے نہیں ہوگی  
اکیلے پن میں زندہ رہنے والے اور ہوتے ہیں

عمن اسرار

سرود صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں  
آٹنے میں یہ میرے سوا کون ہے؟  
سارے پرندے، ہجرت کرتے جاتے ہیں  
ایک تو میں ہوں، یہ دوسرا کون ہے

جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں  
دہ بھی چپ ہے اگر، میں بھی چپ ہوں اگر  
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں  
تم بھی چپ ہوا اگر، بولتا کون ہے؟

کیسے کیسے یاروں کا بہروپ کھلا  
میں کہاں سے اُلجھتی چلی آئی ہوں  
کیسے کیسے خول اُترتے جاتے ہیں  
ڈور ہوں میں اگر تو سرا کون ہے؟

دہیروں کی خاموشی کو غور سے سن  
نقش بنتے رہے، نقش مٹتے رہے  
یوں ہے جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں  
لورج دل پہ جو لکھا رہا، کون ہے؟

کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے  
جب سے اذن تکلم ہوا ہے انہیں  
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں  
بولتے ہیں سب ہی، سوچتا کون ہے؟

صغریٰ یوسف

احمد فراز



## تالائق

باپ نے طیش میں آکر بیٹے سے کہا۔  
”میں نے اپنا عیش و آرام غارت کیا، دن رات مشقت کر کے روزی کماتا رہا۔ ایک ایک پیسہ بچا کر رکھا، محض اس لیے کہ تمہیں میڈیکل کی تعلیم دلاؤں گا۔“

انہوں نے مسکین صورت بنا کر کھڑے ہوئے بیٹے پر ایک نظر ڈالی اور پھر غصے میں کہنے لگے۔  
”اور اب جبکہ تم ڈاکٹر بن چکے ہو تو تم کہہ رہے ہو کہ۔۔۔ ابائی، اسگریف چھوڑ دیجئے۔“  
یامین ناز نوید۔ کلشن کراچی

## علیحدگی

عدالت میں علیحدگی کا کیس تین سال تک چلا۔  
آخر کار میاں بیوی سے کلغذات پر دستخط کروائے گئے۔

دستخط کرنے کے بعد بیوی نے شوہر سے کہا۔  
”میں تمہیں بتاتے دیتی ہوں کہ اگر تم نے الاؤنس کی ادائیگی میں ایک دن کی بھی تاخیر کی تو میں علیحدگی منسوخ کر کے تمہارے گھر آ بیٹھوں گی۔“

## تبدیلی

بڑی عمر کے ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا۔  
”زمانہ واقعی بہت بدل گیا ہے۔“  
”تمہیں یہ احساس کیوں کر ہوا؟“ ان کے دوست نے پوچھا۔

”کل میں ایک یارٹی میں گیا، جہاں زیادہ تر نئے

شادی شدہ جوڑے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عورتیں اور مرد دونوں کی صورت میں کھڑی سیاست پر باتیں کر رہی تھیں اور مرد کو نے کھدروں میں بیٹھے کھانے پکانے کی ترکیبوں کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔“

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

## حاصل کلام

وکل استغاثہ نے گواہ پر جرح کرتے ہوئے کہا۔  
”ہاں تو۔۔۔ رضوان صاحب دو فروری کو آپ مسز سعید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟“

”آجیکشن پور آنر۔“ وکیل صفائی نے فوراً مداخلت کی۔  
”فاضل وکیل کو میرے موکل سے یہ سوال کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔“

”کیوں نہیں پہنچتا؟“ وکیل استغاثہ نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

اس کے بعد دونوں وکیلوں کے درمیان ایک گھنٹے تک بحث ہوتی رہی۔ وکیل استغاثہ نے بیسیوں قانونی حوالے دیے اور پچاسوں مثالیں پیش کیں، جن کی بنا پر اسے وہ سوال کرنے کا حق حاصل تھا۔ ان کے جواب میں وکیل صفائی بھی بیسیوں دلائل پیش کرتے رہے، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وکیل استغاثہ اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ آخر کار جج صاحب نے وکیل استغاثہ کو سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

وکیل استغاثہ نے گہری سانس لے کر گویا ناز دم ہوتے ہوئے نئے سرے سے سوال کیا۔

”ہاں تو۔۔۔ رضوان صاحب۔ دو فروری کو آپ

مسز سعید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟“  
”کچھ بھی نہیں۔۔۔ وہ گھر پر ہی نہیں تھیں۔“ گواہ نے سادگی سے جواب دیا۔

روایک۔ اسلام آباد

## معصومیت

باہر کچھ گھر کی زوردار آواز سن کر ایک کسان گھر سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے گھاس کا ایک بڑا سا گھڑبڑا ہے اور بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا قریب کھڑا منہ بسور رہا ہے۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں برخوردار!“ کسان نے اسے تسلی دی۔ ”آؤ! میرے ساتھ اندر چلو کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ ٹھنڈا پانی پیو پھر گھوٹا لیں گے۔“

لڑکے نے بہت انکار کیا لیکن کسان اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھانے کے دوران لڑکا بار بار کہتا رہا۔

”آج تو اب غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ مجھے بہت ماریں گے۔“

کسان نے شفقت سے کہا۔ ”ماما کہ تمہیں دبر ہو گئی لیکن اس میں تمہارا کیا قصور۔ اب کیوں ماریں گے تمہیں؟“

”اس لیے کہ وہ باہر گھاس کے گھڑکے نیچے دبے ہوئے ہیں۔“ لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا۔

طلعت اقبال۔ اسٹیل ٹاؤن کراچی

## پریشانی

محروکود فرم میں ملازمت شروع کئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اپنے برابر کی میز پر سامھی کلرک کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر اس نے ازراہ ہمدردی پوچھ لیا۔ ”کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“

”میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ جب ہم دونوں ہنسی مومن پر جائیں گے تو دفتر میں میرے اور آپ کے

حصے کا کام کون سنبھالے گا؟“  
سامھی کلرک نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”ہنسی مومن؟“ محروک آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔  
”ہمارے درمیان تو ابھی صحیح طرح سے بات چیت بھی شروع نہیں ہوئی ہے یہ آپ نے شادی اور ”ہنسی مومن“ کے بارے میں کیسے سوچنا شروع کر دیا؟“

”فرض کرنے میں کیا حرج ہے؟“ سامھی کلرک نے ذرا سا شرما کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

گزیا شاہ۔ کہوڑپکا

## ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں ثار صاحب کا جلالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔“

”کیا ثبوت ہے اس بات کا؟“ مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

”جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سسرال جا رہا تھا۔“

افشاں فرقان۔ نئی حسن کراچی

## خصوصی پرواز

بیس گھنٹے کے سفر پر روانہ ہونے والی مسافر پرواز کی ایر ہوٹس نے پھر پورا انداز میں سب مسافروں کو خوش آمدید کہا اور شیریں سبجے میں گویا ہوئی۔

”میں اپنے ادارے کی طرف سے تمام مسافروں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے پرسکون اور محفوظ سفر کے لیے ہماری کمپنی کا انتخاب کیا۔ آپ کو بتاتے چلیں کہ ایک چھوٹی اور غیر معمولی خبر یہ ہے کہ بی بی بھگت اور

ملک پاؤڈر ختم ہونے کی وجہ سے چائے یا کافی دستیاب نہیں ہوگی۔“ یہ سننے ہی مسافر سرد آہیں بھرنے لگے۔

ایر ہوٹس دوبارہ قائل مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”ایک اور خبر یہ ہے کہ لچ اور ڈز کا انتظام نہ کرنے



کے سلسلے میں ہماری معذرت قبول فرمائیں۔ اگر ہم مطلوبہ سامان خریدنے جاتے تو ممکن تھا کہ ہماری پرواز لیٹ ہو جاتی۔ لہذا ہم نے آپ کے قیمتی وقت کو اہمیت دی انسان گھر میں جا کر بھی کھا پی سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ مسافر جن کا بھوک سے برا حال تھا انتہائی غصے میں ہوئے۔

”ارے! اس جہاز میں کیا پینے کا پانی بھی نہیں ہے؟“  
ایر ہوسٹس ایک کافر ادا کے ساتھ ہنسنے لگی۔  
”اس بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس ایک ڈیزل لیٹر مشین والٹر موجود ہے۔“

یہ سنتے ہی مسافروں نے غصے کے عالم میں کہا۔  
”اسے گلاس میں ڈالو اور شرم سے ڈوب مرو۔“ یہ سن کر ایر ہوسٹس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے گردن جھکائی اور بار بھرے لےجے میں کہا۔

”آپ لوگ کتنے اچھے ہیں۔ آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ پینے کے لیے پانی مانگ لیتے تو ہمیں کتنی پر اہم ہوتی۔“  
صفیہ اعوان مہموش اعوان۔ انک

## بہادوری

کلج کی ٹیم بین الصوبائی تقریری مقابلے میں حصہ لینے جا رہی تھی۔ ٹیم میں شامل ایک مقرر نے جانے سے پہلے جوش کے عالم میں باتیں کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”یہ تقریری مقابلہ محض تقریری مقابلہ نہیں ہے، یوں جھوٹے صوبے بھر کے نوجوانوں کے درمیان ذہانت کی جنگ ہے۔“

”بے شک۔“ ایک کلاس فیلو نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہاری بہادری دیکھو کہ تمہارا بے بغیر یہ جنگ لڑنے جا رہے ہو۔“

بیناعابد۔ کورنگی کراچی

## مشورہ

تعلیم سے فارغ ہونے والے ایک نوجوان نے ایک کامیاب بزنس مین سے کہا۔

”میں بھی کاروبار کرنا چاہتا ہوں اور کاروباری دنیا میں اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے کوئی مشورہ دیجئے کہ مجھے سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟“

”بیٹا! سب سے پہلے تو اپنی کلائی پر بندھی ہوئی یہ گھڑی بیچ دو۔ اور ان پیسوں سے الارم والا کوئی اچھا سا کلاک خرید لو۔“ کامیاب بزنس مین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

شہنشاہ اقبال کراچی

## اصلاح

”میں اور میرے بہترین دوست ارشد نے جب یہ پڑھا کہ تمہارا سچا اور حقیقی دوست وہ ہے جو تمہیں تمہارے عیوں سے آگاہ کرے۔ تو ہم نے اس پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا۔“

”اس سے تم دونوں کو اپنی اصلاح کرنے میں کافی مدد ملی ہوگی۔“

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ پچھلے پانچ سال سے ہماری بول چال بند ہے۔“

ترغم اعجاز۔ کراچی

## ناگزیر

ممتاز صاحب کو ایک سنان گلی میں ایک ڈاکو نے روک لیا اور پیشانی پر پستول رکھ کر بولا۔

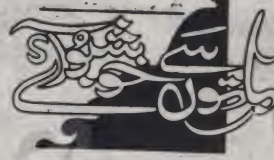
”تمہارے پاس جو کچھ ہے نکال دو ورنہ بھیجا ہا ہر نکال دوں گا۔“

”نکال دو۔۔۔“ ممتاز صاحب نے بے پروائی سے کہا۔ ”آج کے دور میں انسان بھیجے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ پیسے کے بغیر نہیں۔“

(بشری غنی۔ نارتھ کراچی)

جنگ

## شگفتہ جاہ



وقت تک قائم نہ فرماتے جب تک حضرت علیؓ سے مشورہ نہ فرمالیتے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں انتہائی خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ مشورہ دیتے۔

جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کی طرف سفر کیا تو تمام امور خلافت پرورد میں ان ہی کو اپنا نائب بنایا۔ (علامہ شبلی نعمانی۔ الفاروق)

## گواہی

حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں حضرت عمرؓ کی زبان سے جب بھی یہ جملہ نکلتا ”میرا گمان اس طرح ہے، تو وہ گمان صحیح ثابت ہو جاتا۔“

آپ کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک غیر معیولی شکل درج ثابت کا آدمی آپ کے قریب سے گزرا۔

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ ”میرا گمان ہے کہ یہ شخص دو درجاہیت میں کا ہوا تھا۔ اسے میرے پاس لاؤ۔“

جب اسے حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو آپؓ نے اس سے اپنے خنیال کی تصدیق چاہی اور اس سے سوال کیا۔

”ماضی میں وہ کیا کرتا تھا؟“ وہ کہنے لگا۔

”ماضی میں کا ہوا تھا؟“ حضرت عمرؓ نے اس سے سوال کیا۔

”ہمیں کوئی ایسی عجیب اور انوکھی بات بتاؤ جس کی خبر تمہیں تمہارے جن نے دی ہو؟“ وہ کہنے لگا۔ ”میں ایک دن بازار میں جا رہا تھا کہ میرا حوکل جن گھبراہٹ میں میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔“

## رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ مصلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے (اس کے گناہوں کی) سزا جلد ہی دینا میں دے دیتا ہے (یعنی تکلیفوں اور آفات کے ذریعے سے اس کے گناہوں کی معافی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔)“

اور جب اپنے بندے کے ساتھ بڑائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے اس کے گناہ کی سزا (دنیائیں) روک لیتا ہے۔ یہاں تک کہ قیامت والے دن اس کو پوری سزا دے گا۔“

## بردباری

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے اپنے غلام کو آواز دی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر یکراں مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ تیسری مرتبہ یکراں۔ جواب نہیں آیا تو آپؓ خود اس کے پاس گئے تو دیکھا۔ وہ لیٹا ہوا ہے۔ آپؓ نے دریافت فرمایا۔

”کیا تیرے میری آواز نہیں سنی؟“ وہ بولا۔ ”جی میرے آقا۔“

آپؓ نے فرمایا۔ ”پھر تو نے جواب کیوں نہیں دیا؟“ وہ کہنے لگا۔ ”یہ اطمینان ہے کہ آپؓ سزا نہیں دیں گے لہذا کالی پیدا ہو گئی ہے مجھ میں۔“

آپؓ نے فرمایا۔ ”جا تجھے خدا کے لیے آزاد کیا۔“

## حضرت علیؓ کی فراست

حضرت عمرؓ کسی بھی اہم معاملہ میں اپنی رائے اس



”کیا آپ کو خبر ہے کہ جنّات ایک انقلاب کے آنے کے بعد نہایت خوف زدہ اور نامید سے ہو گئے ہیں۔ وہ اپنا رخت سبز باندھ چکے ہیں؟“  
سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تائید کی اور فرمایا۔

”یہ سچ کہتا ہے۔ ایک مرتبہ میں ان کے بتوں کے پاس سویا ہوا تھا۔ اچانک ایک شخص آیا۔ اس نے بتوں کے نام پر وہاں ایک نیمخ ڈال دیا۔ پھر وہاں کسی نے نور سے بیج ماری۔ یہ بیج اس قدر بلند ہوئے کہ اس سے بلند بیج میں نے اپنی زندگی میں پہلے بھی نہیں سنی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ”ہائے ہم مارے گئے۔ ایک مائب الہی اور فصیح شخص آگیا ہے۔ جولا لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کا اعلان کرتا ہے“

حضرت عرفہ کہتے ہیں ”میں وہاں سے چل دیا پھر پتھر پڑے عرصہ بعد ہم نے سنا کہ ایک نبی کا ظہور ہوا ہے جولا لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کہتا ہے۔“  
(صحیح بخاری حدیث 3866)

### خلیفہ کا مال

ایک دن حضرت عمر فاروقؓ ارشاد فرما رہے تھے۔ وہ اس وقت غلیظ تھے اور ان کا مال یہ تھا کہ ان کے تہ بند میں بارہ بیوند لگے ہوئے تھے۔  
(امام احمد قیس 124)

### فیصلہ

ایک تاجر کی بیٹی کو گھوڑی جس میں چار سو دینار تھے۔ اس نے اعلان کر دیا جو اسے تلاش کر کے لائے گا اس کو اس بیٹی کی رقم کا نصف حصہ دے دیا جائے گا۔ یہ بیٹی ایک غریب ملازم کو ملی۔ وہ اسے لے کر انعام کی طرح میں تاجر کے پاس پہنچا لیکن بیٹی دیکھ کر تاجر کی نیت بدل گئی۔ اس نے ملازم سے کہا۔

اس بیٹی میں نہایت قیمتی زمر دہی تھی۔ کیا وہ بھی اس کے اندر ہیں؟“  
ملازم نے سن کر گھبرا گیا لیکن یہ بھی سمجھ گیا کہ دھوکا

کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے کچھ دینا نہ پڑے۔ وہ تاجر سے چمکھٹنے لگا۔ آخر یہ دونوں لڑتے ہوئے فیصلے کے لیے قاضی کے پاس پہنچے۔ ملازم نے قسم کھا کر قاضی سے کہا کہ اسے بیٹی میں دینا رول کے سوا کوئی اور چیز نہیں ملی۔

اب قاضی نے مالک سے پوچھا۔  
”بتاؤ وہ زمر کیسے تھے؟“  
مالک نے جواب تو دیا لیکن اس کی اوٹ پٹانک باتیں سن کر قاضی نے سمجھ لیا کہ چھوٹ بول رہا ہے اور انعام سے بچنا چاہتا ہے۔

اس نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا۔  
یہ ملازم جو قاضی لایا ہے۔ اس میں زمر نہیں لہذا یہ تیری نہیں ہو سکتی تو اپنی بیٹی کے لیے میرے اعلان کروا۔ پھر قاضی نے ملازم سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یہ بیٹی چالیس روز تک احتیاط سے رکھ۔ اگر اس کا کوئی دوسرا سچا دعویٰ دار نہ پیدا ہو تو یہ تیری ہے“

### علم کی اہمیت

ایک دولت مند شخص رومان کے ایک عالم کے پاس پہنچا اور اس سے درخواست کی۔  
آپ میرے بچے کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت اپنے ذمے لے لیجیے۔

عالم نے کہا ”معاوضہ کیا دو گے؟“  
امیر نے کہا ”فرمائے کیا لیں گے آپ؟“  
وہ بولا ”پانچ سو نفرتی سیک“  
یہ سن کر امیر کی تودیاں چڑھ گئیں۔ اس نے اس رقم کو بہت بڑا معاوضہ سمجھ کر ذمہ غصے کے ساتھ کہا۔  
”اس سے کم رقم میں تو میں ایک غلام خرید سکتا ہوں“  
عالم نے کہا ”ضرر خرید لیجیے، تاکہ آپ دو غلاموں کے مالک بن جائیں“

### سناوت

حسن بن سہل غلیظ ماموں کا وزیر بہت سخی تھا۔ بے دھرمک لوگوں کو عطیات دیتا۔ ایک مرتبہ ایک

اعرابی نے اسے لکھا۔

”اے حسن! یہ راستہ احسان کا نہیں جو تُو نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ اسراف میں کوئی بھلائی نہیں؟“

حسن نے اعرابی کو جواب دیتے ہوئے لکھا۔  
”کیا تجھے نہیں معلوم کہ بھلائی اور نیکی میں اسراف ہوتا ہی نہیں؟“

### کمزور عشق

مولانا روئے ایک دن خرید و فروخت کے سلسلے میں بازار تشریف لے گئے۔ ایک دکان پر جا کر وہ رک گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت سودا سلف لے رہی ہے۔ سودا خریدنے کے بعد اس عورت نے رقم ادا کرنا چاہی تو دکان دار نے کہا۔  
”عشق میں حساب کتاب کیسا؟ پیسے کی بات چھوڑو اور گھر جاؤ“

اصل میں یہ دونوں عاشق اور معشوق تھے۔ مولانا روئے اس کی بات سن کر عشق کھا کر گر پڑے۔ دکان دار سخت گھبرا گیا۔ اس دوران وہ عورت وہاں سے چلی گئی۔ خاصی دیر بعد جب مولانا روئے کو ہوش آیا تو دکان دار نے پوچھا۔

”مولانا صاحب! آپ کیوں بے ہوش ہو گئے تھے؟“  
مولانا روئے نے جواب دیا۔ ”میں اس بات پر بے ہوش ہوا کہ تم دونوں میں عشق اتنا قوی اور مضبوط ہے کہ آپس میں کوئی حساب کتاب نہیں جبکہ اللہ کے ساتھ میرا عشق اتنا کمزور ہے کہ میں تسبیح کے دانے بھی سن کر گرتا ہوں۔“  
نثر، اقرار، کراچی

### منطالعہ

۱۔ مطالعہ غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔  
(شیخ سعدی)  
۲۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ (امام غزالی)  
۳۔ مطالعہ سے آدمی کی وحشت اور دیوانگی ختم ہو

جاتی ہے۔ (حکیم لقمان)  
۴۔ طالب علم جو ایک کتاب پڑھتا ہے وہ علا جو دو کتابوں میں ایک ساتھ پڑھتا ہے وہ اوسط اور چوتھیں کتاب میں ایک ساتھ پڑھتا ہے وہ مہمل ہے۔

نیلیم شہزادی۔ کوٹ مومن سرگودھا

### غور کیجیے

۱۔ دعا و دستک کی طرح ہے۔ مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔  
۲۔ جب آپ کو محسوس ہو کہ آپ کی طبیعت کو ذکرِ خدا سے غیبت ہو گئی ہے تو سمجھ لو کہ اللہ آپ کو پسند کرنے لگا ہے۔  
۳۔ یادیں محبت کرنے والوں سے زیادہ وفادار ہوتی ہیں۔ گنہگار محبت کرنے والے تو چھوڑ جاتے ہیں مگر یادیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔

### رحم

۱۔ اگر خیال کی اصلاح ہو جائے تو خوفِ دُور ہو سکتا ہے۔ ماضی کی غلطیوں پر توبہ کر لی جائے تو خوفِ دُور ہو جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر لیا جائے۔ اس کے فضل سے مایوسی نہ ہونے دی جائے تو خوف نہیں رہتا۔ کوئی رات ایسی نہیں جو ختم نہ ہوئی ہو۔ کوئی غلطی ایسی نہیں جو معاف نہ کی جاسکے کوئی انسان ایسا نہیں جس پر رحمت کے دروازے بند ہوں۔ رحم کرنے والے کا کام ہی یہی ہے کہ رحم کرے۔ رحم اس کے فضل کو کہتے ہیں۔ جو انسانوں پر ان کی خامیوں کے باوجود کیا جائے اور یہ رحم ہوتا ہی رہتا ہے۔ کسی کو خوفِ ذمہ نہ کیا جائے۔

(داصف علی واصف)  
نوال افضل گھمن۔ گجرات





## شاعری کا بول چال

### نوال افضل گھمن

محبت درد کی صورت  
غزل کے بوجھ سے جب ٹوٹنے لگے ہیں شانے تو  
یہ ان پر ہاتھ رکھتی ہے  
کسی ہمدرد کی صورت  
گزر جاتے ہیں سارے قافلے جب دل کی بستی سے  
فضا میں تیرتی ہے دیر تک  
یہ گرد کی صورت  
محبت درد کی صورت

\*\*\*

محترم و محترم اعتبار ساجد کی غزل آپ کی خدمت  
میں حاضر ہے۔  
عجیب ایسا لطف عطا کیا جو ہر حقانہ وصال تھا  
میرے مومنوں کے مزارِ دال، تجھے میرا لٹائیا تھا  
کیس غزل دل سے لکھا تو تھا تیرے سال بھر کا سا  
وہ ادھوری ڈائری کھو گئی وہ بجلنے کوں سال تھا  
کسی اور جیسے کو دیکھ کر تیری شکل ذہن میں آگئی  
تیرا نام لے کر ملا اُسے میرے حافظہ کا یہ حال تھا

کبھی مومنوں کے سراب میں کبھی بامِ ود کے قلاب میں  
دہاں عمر میں نے گزار دی جہاں سانس لینا محال تھا  
کبھی ٹوٹے غور نہیں کیا کہ یہ لوگ کیسے اُجڑ گئے  
کوئی "میر" جیسا گرفتہ دل تیرے سامنے کی مثال تھا  
تیرے بعد کوئی نہیں ملا جو یہ حال دیکھ کر دھچکا  
مجھے کس کی آگ جھلسائی میرے دل کو کس کا ملاں تھا

شاعری اُداس شاموں میں اُداس لمحوں میں یا  
پھر کسی ناخوش گراؤم کی بے حد خوبصورت سی صحنوں  
سویروں میں کوئی یاد دل میں پھول بن کر کھلے یا درد  
کا نا سوزین کر دوح میں سرایت کرے تو پھر حساس  
دل شاعری کا سہارا لیتے ہیں۔  
سب سے پہلے اجدادِ اسلام امجد کی محبت سے  
شروعات کرتے ہیں۔

محبت اداس کی صورت  
پیاسی بے تلک دی کے ہونٹ کو سراب کرتی ہے  
گلوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے  
سحر کے جھپٹے میں لنگھاتی، مسکراتی، جھگڑاتی ہے  
محبت کے دلوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے  
کسی فردوس کی صورت  
محبت اداس کی صورت  
محبت ابر کی صورت  
دلوں کی سرزمین پر پھر کے آتی ہے ادب برستی ہے  
چمن کا ذرہ ذرہ جھومتا ہے مسکراتا ہے  
اذل کی بے غمونی میں مینو سراٹھاتا ہے  
محبت ان کو بھی آباد اور شاداب کرتی ہے  
جو دل ہیں فہر کی صورت  
محبت ابر کی صورت  
محبت آگ کی صورت  
بچے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں  
محبت کی پیش میں کچھ غیب اسرار ہوتے ہیں  
کہ جتنا یہ بھرتی ہے، اُردوں جاں بھرتی ہے  
دلوں کے ساحلوں پر جمع ہوتی ہے اور بکھرتی ہے  
محبت جھاگ کی صورت  
محبت آگ کی صورت  
محبت خواب کی صورت

آج کل ہماری نوجوان نسل کی — موبائل میسر  
میں سب سے ناپ پر بات ہوتی ہے محسن نقوی منسوب  
کی۔ ان کی ایک شاندار سی غزل حاضر خدمت ہے۔  
اس کو فرصت ہی نہیں وقت نکالے محسن  
ایسے ہوتے ہیں جھلا چاہنے والے محسن؛

کھو گئی صبح کی امید اور اب لگتی ہے  
کہ ہم نہیں ہوں گے جب ہوں گے ابلے محسن  
حاکم وقت کہاں، میں کہاں، عدل کہاں  
کیوں نہ خلقت کی زبان پر لگاؤں تالے محسن

جون ایلیا کی شاعری میں سادگی بھی ہے، پرکاری بھی۔  
وہ بڑی بڑی باتیں بڑے سادہ الفاظ میں کہہ جاتے ہیں۔  
نیا اک رشتہ پیدا کیوں کر۔ میں ہم  
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کر۔ میں ہم

خوشی سے ادا ہو رسمِ دوری  
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کر۔ میں ہم  
نہیں ہے دنیا کو جب پروا ہماری  
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کر۔ میں ہم

برہنہ ہیں سر بازار تو کیا  
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کر۔ میں ہم

احمد فراز کو جتنے جی ایسی شہرت ملی ہے جو افسانہ  
لگتی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فراز کی شاعری کے  
اوصاف اور تجاویز کی بنیادوں تک پہنچنے کی کوئی  
باضابطہ کوشش ابھی تک نہیں ہوئی۔ غیر معمولی شہرت  
اور بے تحاشا مقبولیت اس شاعری کا حجاب بن کر رہ  
گئی ہے۔ احمد فراز کی ایک منفرد انداز کی غزل۔  
وہ جو آجائے مجھے آنکھوں میں تارے لے کر  
جانے کس دلیں گئے خواب ہمارے لے کر

جھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے  
پیرِ درگاہ ہے تو آجاتے ہیں ارے لے کر

وہ جو آسودہ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم  
اب کے موج آتی تو پہلے کی کنارے لے کر

ایسا لگتا ہے کہ ہر موسم بھراں میں بہاں  
ہوٹ رکھ دیتی ہے شاخوں پر تمہارے لے کر

شہر والوں کو کہاں یا دہے وہ خواب فروغ  
بھرتا رہتا ہے جو جگہوں میں بھارے لے کر

نقدِ جاں صرف ہوا کلفتِ ہستی میں فراز  
اب جو زندہ ہیں تو پھر سانس ادھارے لے کر

آخر میں ایسا تعارف۔  
میں نوال افضل گھمن ضلع گجرات سے تھوڑا سا آگے  
نقبہ کڑیا نوالہ کے جٹ زمیندار گھرانے سے تعلق ہے۔  
انگریزی ادب میں ماسٹر زجاری ہے۔ میرا انتخاب پسند  
آیا یا نہیں، دائے ضرور دیکھیں گا۔

افتخار عارف کے اشعار کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔  
عشق کیسا کہ بھر و سا بھی نہیں تھا شاید  
اس سے میرا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا شاید

خاک اُڑتے ہوئے بازاروں میں دیکھا ہے  
میں کبھی گھر سے نکلتا بھی نہیں تھا شاید

زلیت کرنے کے سب انداز اسے ازبر تھے  
مجھ کو مرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا شاید





# دستک دستک

شاہین رشید

صبا قر

”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ٹھاک! اللہ کا شکر ہے۔“

”آپ تو خیر سے“ ہم سب امید سے ہیں ”تمہاری پہچان بن گیا ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اس پروگرام کے لیے

تمہارا انتخاب کیسے ہوا؟“

”بہت ہی اتفاقیہ اس پروگرام میں آئی۔ ہوا یوں کہ کسی کام کے سلسلے میں ڈاکٹر یونس بٹ کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اچانک ہی ڈاکٹر صاحب نے کہا تم ”ہم سب امید سے ہیں“ کی ہوسٹ بنو گی؟ میں نے کہا کہ شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔ کہنے لگے نہیں! میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں اور جب انہوں نے فورس کیا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، جیسے آپ کہیں اور یوں میں ”ہم سب امید سے ہیں“ کی ہوسٹ بن گئی۔“

”اس پروگرام کو نیم سیاسی پروگرام کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ تو اس کے لیے سیاست کی شدید بھی ضروری ہے تمہیں ہے سیاست سے دلچسپی؟“

”جوابات بتاؤں۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن جب مجھے یہ پروگرام ملا تو اس کو اچھے طریقے سے کرنے کے لیے میں نے تھوڑی بہت سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی تاکہ اس پروگرام کو اچھے طریقے سے کر سکوں۔ اور اب آپ کو کبھی ایسا نہیں لگتا ہوگا کہ مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے۔“

”سیاست سے دلچسپی کے لیے کیا کرنی ہو، مطالعہ یا

ملاقاتیں؟“

”نہیں۔ نہیں نہ مطالعہ نہ ملاقاتیں۔ باقاعدگی کے ساتھ نیوز چینلز پر خبریں دیکھتی ہوں اور خبروں سے مجھے کافی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سیاست کیسی چل رہی ہے۔“

”اپنا یہ پروگرام خود کھیا کبھی؟ اور کتنے پروگراموں کا معاملہ ہوا تھا؟“

”بالکل جی۔ اپنا پروگرام ضرور دیکھتی ہوں اور مجھے بہت مزا آتا ہے اپنا پروگرام دیکھ کر۔ ابتدا میں تیرہ پروگرام یعنی تین ماہ کا معاملہ ہوا تھا۔ لیکن سب کو میرا انداز انا پسند آیا اور اتنی تعریفیں ای میلز آئیں اور ہر جگہ سے اتنے اچھے ریٹائر کس ملے تو پھر اس پروگرام کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ ہاں جب لوگ کہیں گے کہ چھوڑ دو تو چھوڑ دوں گی۔“

”اتنی عزت۔ اتنی شہرت۔ کبھی سوچا کہ میں بہت بڑی ہوتی ہوگی؟“

”نہیں کبھی نہیں۔ اور کیوں ایسا سوچوں۔ اس میں میرا کیا مکمل ہے۔ یہ سب کچھ خدا نے مجھے دیا ہے۔ میں اس کی شکر گزار ہوں۔ میں ایسا سوچ کر ان نعمتوں کو کھونا نہیں چاہتی، کیونکہ ناشکری خدا کو سخت ناپسند ہے۔“

”ہوسٹنگ، ماؤنٹنگ، اداکاری، کس خانے میں اپنے آپ کو فٹ سمجھتی ہو؟“

”کتنے فی سفر کا آغاز میں نے ماؤنٹنگ سے کیا تھا۔ لیکن درحقیقت مجھے اداکاری کا ہی شوق تھا اور میں اپنے آپ کو اداکاری کے خانے میں ہی فٹ سمجھتی ہوں اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ہوسٹنگ میں تو

میں اتفاقیہ آئی ہوں اور اللہ کا کام کرم ہے کہ اس نے مجھے اس میں بھی کامیاب کر دیا ہے۔“

”تم نے مجھے اپنے پہلے انٹرویو میں کہا تھا کہ تمہارے گھروالے راضی نہیں تھے کہ تم اس فیلڈ میں آؤ۔ اب گھروالوں کی رائے بدلی کہ نہیں؟“

”ہاں۔ اب سب راضی خوشی ہیں۔ ابتدا میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ میں اپنے خاندان کی واحد لڑکی ہوں جو اس فیلڈ میں آئی۔ میرے والد کا میرے بچپن میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ساری ذمہ داری والدہ نے اٹھائی۔“

”شوہز میں اگر لڑکیاں بہت بدل جاتی ہیں۔ میں نے بہت سی لڑکیوں کو سب کے سامنے سرکٹ پیتے دیکھا ہے۔ تم؟“

”ارے نہیں! مجھے اپنی حدود پتا ہیں۔ سرکٹ نوشی اور اس طرح کی دوسری باتوں سے دور رہتی ہوں اور ویسے بھی اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بری عادتوں سے محفوظ ہی رکھے۔ میں اندر سے ایک مشرقی لڑکی ہوں۔“

”گلدن! اس مشرقی لڑکی کو اگر شادی کے بعد شوہز میں کام کرنے کی اجازت نہ ملے تو؟“

”اجازت نہ ملے تو۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں شوہز چھوڑ دوں گی۔ کیونکہ لڑکی کے لیے اس کا گھر اس کا شوہر اور اس کے بچے سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا اور وہ بھی گیا تو کوئی مسئلہ نہیں۔“

”تو پھر پسند کو ہی ترجیح دو گی؟“

”جو مقدر میں ہوگا وہی ہوگا۔ شادی بیاہ کا معاملہ تو خالصتاً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو وہ کرے گا ہمارے حق میں وہی بہتر ہوگا۔ بس میری دعا ہے کہ جو بھی میرا شریک سفر ہو، وہ میرے حق میں بہتر ہو۔ ایمان دار، پرہیزگار اور مخلص ہو۔ انڈر اسٹینڈنگ ہو۔“

”ہماری دعا ہے کہ تمہیں ایسا ہی شریک سفر ملے۔“



عدیل اظہر

”کہتے ہیں۔ اور یہ بتائیں کہ ہر آر جے کہتا ہے کہ اس کا پروگرام سب سے زیادہ سنا جاتا ہے حقیقت کیا ہے کس طرح بتا چکا ہے؟“

”جی! میں ٹھیک ہوں اور یہ بہت اچھا سوال کیا کہ بتا کیسے چلتا ہے اور جج بات بتاؤں کہ میں ایسا نہیں سمجھتا، لیکن میں جس مارکیٹ کو ٹارگٹ کر رہا ہوں اس میں سب سے زیادہ پروگرام میرا ہی سنا جاتا ہے اب سوال یہ ہے کہ مجھے یہ بات کیسے بتا چلتی ہے تو اس کے تین چار طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو ہے ”فیس بک“ ”میری فیس بک“ میرے پرستاروں کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ جب پائی لوگوں سے اس کا موازنہ کرنا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ کسی کے آٹھ سو ہیں تو کسی کے چودہ سو ہیں۔ کسی کے سولہ سو تو اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ میرا پروگرام زیادہ سنا جاتا ہے پھر دوسرا ذریعہ لوگ ہیں جن سے مجھے فیڈ بیک ملتا ہے۔ میں کہیں میٹنگ میں جاؤں یا کہیں بھی جاؤں لوگ بے ساختہ کہتے ہیں۔ آپ عدیل اظہر ہیں۔ لوگ مجھے آواز سے پہچان لیتے ہیں اور مجھے روزانہ ہی فیڈ بیک مل جاتا ہے۔ اور پھر جیسے میرے احباب ملتے ہیں تو وہ



بھی بتاتے ہیں کہ ہماری کمپنی میں روزانہ ہمارا پروگرام سب لوگ سنتے ہیں اور لیچ میں ہمارے پروگرام کے ٹاپک یہ ہی ڈسکس کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح بتا چکا رہتا ہے۔  
”فکر شلرز بھی اندازہ ہوتا ہو گا؟“

”جی بالکل! ایڈز بھی سب سے زیادہ میرے ہی پروگرام کو ملتے ہیں اور جب میڈیا بانگ ہاؤس کہتے ہیں کہ جی کہیں عدیل اظہر کے پروگرام کے لیے ایڈ دینا ہے۔ تو اس کا مطلب ہے واقعی مجھے بہت لوگ سنتے ہیں۔“

”آپ شاید بیوی پہ بھی آتے ہیں؟“  
”جی بالکل! میں آتا ہوں بیوی پہ مگر بہت کم۔ بیوی پہ بہت مخصوص پروگرام کرتا ہوں۔ بی بی وی سے اسپورٹس کے لائیو پروگرام کرتا ہوں اور چونکہ بی بی وی بہت کم دیکھا جاتا ہے اس لیے زیادہ تر لوگوں نے میری شکل نہیں دیکھی ہوئی۔ اور آج کل نہیں بلکہ ایک زمانے سے بی بی وی اسپورٹس کے لائیو پروگرام کر رہا ہوں۔“

”شہر میں نہیں، لیکن اندرون شہر تو بی بی وی بہت دیکھا جاتا ہے۔“

”جی بالکل۔۔۔ مانسہ ٹوہ نیک سنگھ، فیصل آبادیہ اور ایسے ہی بے شمار چھوٹے چھوٹے شہر اور دیہات میں گاؤں میں بی بی وی دیکھا جاتا ہے اور اس کا اندازہ مجھے آنے والی ای میلز سے ہوتا ہے اور بڑے شہروں میں ان لوگوں کی ای میلز آتی ہیں جہاں گھروں میں کیبل دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور بی بی وی پہ ایک مخصوص ٹیم ہے جس کے ساتھ میں کام کرتا ہوں۔ بی بی وی میں شاملہ شعیب رضوی اسپورٹس پروگرام کی ہیڈ ہیں۔ وہ مجھے بلاتی ہیں تو مجھے جانا پڑتا ہے کیونکہ میں ان کو منع نہیں کر سکتا۔ اور اس طرح بی بی وی کا تھوڑا بہت شوق پورا ہو جاتا ہے۔“  
”دیکر چینل یہ کیوں نہیں آتے؟“

”اس لیے کہ ٹائم نہیں ہے۔ یا تو پھر یہ ہو کہ انسان مکمل طور پر بی بی وی کی طرف آجائے مگر ایسا میں کر نہیں سکتا۔ کیونکہ میں جاب بھی کرتا ہوں جو کہ فل ٹائم ہے۔ بس میں ایک ہی انٹیوٹی کے لیے ٹائم نکال سکتا ہوں اور وہ صرف اور صرف ریڈیو ہے۔ اگر اس سے زیادہ میں نے کام شروع کر دیا تو پھر میری فیملی لائف ڈسٹر ب ہو جائے گی۔“  
”اس کا مطلب ہے کہ چھٹی کا دن فیملی کے ساتھ ہی گزرتا ہو گا؟“

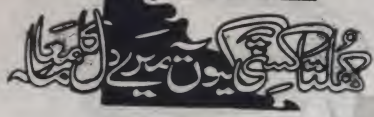
”جی بالکل! چھٹی کا سارا دن فیملی کے ساتھ گزرتا ہے۔ ہمارے صاحب زادے بہت خوش ہوتے ہیں کہ آج ان کے ”بابا“ گھر پر ہیں۔ چھٹی کے دن کہیں نہ کہیں ضرور جاتے ہیں اور ہفتہ کی شب تو گھر سے باہر کھانا کھانے بھی ضرور جاتے ہیں۔ اور اتوار کے دن زیادہ تر تو ڈرامہ ورلڈ چلے جاتے ہیں یا پھر کسی رشتے دار کے یہاں چلے جاتے ہیں۔“

”سارا ہفتہ کام اور پھر اتوار کو گھومنا پھرنا۔ آرام کرنے کو دل نہیں چاہتا کیا؟“

”میری ذاتی طور پر خواہش ہوتی ہے کہ میں گھر پر رہوں۔ خاص طور پر اتوار کے دن۔ کیونکہ سارا ہفتہ کام کر کے کافی تھکن ہو جاتی ہے۔“  
”کبائٹ پروگرام کے ساتھ مزا آتا ہے یا سنگل پروگرام میں؟“

”مجھے کبائٹ پروگرام میں بھی مزا آتا ہے اور سنگل میں بھی۔ کبائٹ پروگرام کرنے کے لیے جس کے ساتھ ہم پروگرام کر رہے ہیں اس کے ساتھ کیمسٹری کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میری سیکینہ اور دانش کی کیمسٹری بہت زبردست ہے۔“

”عدیل اظہر آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔“

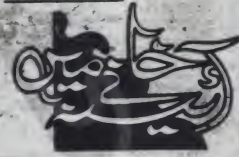


عزیز شہزاد \_\_\_\_\_ چک ۹۰۔ ایم۔ ایل  
راہ ہستی کے اس جلتے سفر میں  
تمہاری یاد کا سایہ بہت ہے  
آقا نوید \_\_\_\_\_ اوکاڑہ  
تسلیم عشق تھا سب اس کے ساتھ ہونے تک  
خدا مال درد نہ کیا نجات ہونے تک  
ملا تھا ہجر کے رستے میں صبح کی مانند  
پھیر گیا تھا مسافر سے رات ہونے تک  
شازیہ رانا \_\_\_\_\_ پاک پتہ شریف  
علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو وہ میں نہ ادھر  
فلسفہ عشق میں کچھ بھی نہیں حیرت کے ہوا  
عائشہ رانجا \_\_\_\_\_ کنڈل سیال  
یہ شہر تنقید گراں، یہاں نہ شیشہ نہ سنگ  
کوئی بھی نقش یہاں معتبر نہیں ہوتا  
خدا دراز کرے عمر موج طوفان کی  
سمندر دل میں کوئی درد بد نہیں ہوتا  
نمرا، آقا \_\_\_\_\_ کراچی  
اہل دل اور بھی ہیں اہل وفا اور بھی ہیں  
ایک ہم ہی نہیں دنیائے فنا اور بھی ہیں  
شمالہ عنایت چغتائی \_\_\_\_\_ بلتھ ماڈل  
تھا بہت عذاب اور اکیلے ہم شب غم بھی میری طول تر  
میری زندگی بھی سراب اور بھی اس نگہ تر بڑی دیر تک  
یہاں ہر طرف ہے عجب سماں بھی خود پسند بھی خود نما  
دل بے قرار کو نہ مل سکا کوئی چادر مگر بڑی دیر تک  
نوال افضل نعمن \_\_\_\_\_ گجرات  
ایک لمحہ ملا تھا کھونے کو  
زندگی کی بات کیا کرتے

سرت الطاف احمد \_\_\_\_\_ کراچی  
کھڑے ہیں مگر سب سے پیچھے کھڑے ہیں  
زمانے کو ہم راستہ دینے والے  
نیلم شہزادی \_\_\_\_\_ کوٹ مومن  
ہم اس کو پاتے ہوئے خود کو کھونے لگتے ہیں  
بہت سے واقعات ساتھ ہونے لگتے ہیں  
ہم اپنے عشق میں شاید ابھی ادھورے ہیں  
بلا جواز پریشان ہونے لگتے ہیں  
امین قاطبہ \_\_\_\_\_ گوجرانوالہ  
مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا اس نے  
ہم سفر اور جن لیا اس نے  
عائشہ ندیم کشیج \_\_\_\_\_ پیر محل  
دیا جلا کہ گئے تھے ہم تو  
تمام گھر میں دھواں دھواں ہے  
عالیہ توصیف \_\_\_\_\_ عوبی بہادر شاہ  
کہیں الفاظ خالی ہو گئے ہیں  
کہیں لہجوں میں ویرانی بہت ہے  
تسلل وقت کا جاری ہے اب تک  
یہ دنیا اب بھی امکانی بہت ہے  
آمنہ قدر \_\_\_\_\_ فیصل آباد  
وصال یار کے طے شمار کیا کرتے  
دو ایک پل تھے جنہیں بے حساب لگتے تھے  
روبینہ کوثر \_\_\_\_\_ ملتان  
ہر ایک خواب ہو گیا، خیال جاگتے رہے  
جواب بی لیے مگر سوال جاگتے رہے  
کوئی جواز دھونڈتے خیال ہی نہیں رہا  
تمام عمر یوہی بے خیال جاگتے رہے  
عائشہ رانجا \_\_\_\_\_ کنڈل سیال (ڈسک)  
ذرا سی دیر میں دل میں اترنے والے لوگ  
ذرا سی دیر میں دل سے اتر بھی جاتے ہیں







### ابھی موڈ نہیں ہے

ہماری فلمی صنعت کالم نہ ہونے کے باعث ویران و سنسان بڑی رہتی ہے۔ بھلا ہو ہماری فلمی ہیروئنوں کا کہ وہ اسٹینڈل کی پھانسیاں چھوڑ کر کچھ نہ کچھ ہانچل مجائے رکھتی ہیں۔ اب چاہے ان چنگاریوں کی زد میں کوئی آئے یا کسی کا ٹیٹھن جل اٹھے، ان کا مقصد تو محض سستی شہرت حاصل کرنا ہو تا ہے۔ خاص طور پر وینا ملک اور میرا ان کے پاس شہرت حاصل کرنے کے لیے اسکیٹل ہی تو ہیں۔ (دونوں میں ایک اور مشترک چیز ”شہمت پائل“ بھی ہیں۔) میرا نے آج کل میدان مارا ہوا ہے اور وہ جہول میں پوری طرح سے ”من“ ہیں۔ میرا بے حد مودب اداکار ہیں، سو وہ اپنے

سینئر کو خاصا مان دیتی ہیں، خاص طور پر ریماکو۔ لہذا وہ ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھتی ہیں۔ (آپ اسے نقل کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔) ریمانے ہرن کے بچے کو لیے تو میرا نے بھی لے ڈالے۔ ریمانے امریکی ڈاکٹر کا انتخاب کیا تو میرا نے فوراً ”امریکی پائلٹ نوید پرویز سے متعلق کر ڈالی۔ مگر جناب! جلد ہی نوید پرویز کے والد منظر نامے میں کووے اور بڑھک ماری۔“ یہ شادی نہیں ہو سکی اے سو نیا! پھر تو بیان بازی کا ایک بازار کرم ہو گیا جس میں نوید پرویز ان کے والد اور میرا کے ساتھ ان کی والدہ بھی کود پڑیں۔

نوید پرویز ان دنوں بنگلہ دیش میں تھے، مگر ان پر پاکستانی ساتھ میرا کا جاوہ ایسا سرچڑھ کے بولا کہ وہ فوراً پاکستان آ بیچے اور میرا کی حمایت میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ بیٹے کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر راجہ پرویز نے فوراً ”پینٹر بدلا۔ (پانی بجلی والے نہیں، بلکہ میرا کے متوقع سرس اور انہوں نے جولائی کے آخر میں اواکارہ میرا اور نوید پرویز کے نکل کا اعلان کر دیا۔ اس پر میرا بدک گئیں کہ وہ بی الجھل شادی کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں اور موڈ ہو بھی کیونکر کہ سنا گیا ہے، میرا کچھ عرصے سے لاہور میں نوید پرویز کے ساتھ ان کے ناؤن شپ والے گھر میں مقیم ہیں۔ (اب ان دونوں کی شادی ہو چکی ہے یا وہ ایسے ہی رہ رہے ہیں یہ خود میرا جانیں یا نوید پرویز۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب و روایات میں ایسی گنجائش نہیں۔)

ششما



رسائل اور جرائد کی دنیا میں آپ نے ہفت روزہ اور ماہنامہ وغیرہ کی اصطلاح تو سنی ہوگی۔ کچھ پرچے سہ ماہی اور ششماہی بھی نکلتے ہیں تو کچھ پرچے اپنا سالنامہ نمبر بھی بڑے اہتمام سے نکالتے ہیں، تاہم ایوارڈ کی دنیا میں ایسی اصطلاحات نہیں پائی جاتیں کہ ایوارڈز تو عرف عام میں سال بھر کی شان و آوار کار کوئی کاصلہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے ایک بار ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد فنکار اگلا سال بے چین رہتے ہیں کہ دیکھیں! آئندہ سال ایوارڈ کا تاج کس کے سر پر جتا ہے۔ لیکن جناب! ایک ایوارڈ ایسا بھی ہے کہ جسے حاصل کرنے والے سے زیادہ دینے والے بے چین رہتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ ایوارڈ کی تقریب سال میں دو مرتبہ کرتے ہیں۔ گویا یہ ایوارڈ سال بھر کی نہیں، بلکہ چھ ماہ کی کارکردگی پر دیے جاتے ہیں۔ یہ ایوارڈ ہیں ”بولان ایوارڈ“ (کیوں نہ انہیں ”ششماہی ایوارڈ“ کا نام دے دیا جائے) بولان ایوارڈ کے منتظمین کو اکثر حکومتوں سے سرپرستی نہ کرنے کا گلہ رہا ہے۔ کئی مرتبہ یہ ایوارڈ بند کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا گیا، تاہم آج حالات تو وہی ہیں۔ (بلکہ شاید پہلے سے بھی بدتر) لیکن یہ ایوارڈ سال میں دو مرتبہ دیے جا رہے ہیں تو یہ یقیناً خوش کن امر ہے۔

(کاش! کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر وطن عزیز

کے سارے مسائل بھی اسی طرح حل ہو جائیں۔)

### ٹیلیٹ ویسی، سرپرست بدلی

خوش قسمتی سے ہمارے ملک کی سرزمین بے حد زرخیز ہے۔ زراعت کے اعتبار سے بھی اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی۔ لیکن یہ شتم ظریفی ہے یا ہماری کوتاہ نظری کہ ہمارا ٹیلیٹ ویس ہمیں بھارتی ریپر میں لپٹا ہوا ملتا ہے تو ہم تب ہی اس کی قدر کرتے ہیں۔ ابھرتے

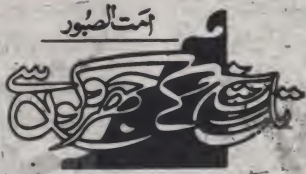
ہوئے گلوکار نعمان جاوید بھی ایسی ہی مثال ہیں۔ ہمارے وطن میں ان کے نام سے عام شائقین موسیقی ابھی آشنا تک نہیں، تاہم موصوف دو عدد بھارتی فلموں میں اپنی آواز کا جاوہ جگا چکے ہیں۔ (بس، ہم ہی سوئے رہے) نعمان نے حال ہی میں یہاں ایک ویڈیو ایلم بنائی ہے جو ریلیز ہو چکی ہے۔ اس ایلم میں ان کے ساتھ فریحہ پرویز بھی شامل ہیں۔ تاہم خبر یہ ہے کہ نعمان جاوید اور فریحہ پرویز کا وہ گانا ایک بھارتی فلم میں جا رہا ہے۔ دیکھیں ہمارے ٹیلیٹ ویسی کی بدلی سرپرستی کب تک جاری رہتی ہے۔

### پہلی مرتبہ

ببرک شاہ ہماری فلموں کے معروف اداکار ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ ایک معروف ٹی وی چینل کے پروگرام







☆ میں شریک ہوئے تو تو ملک کے لیے خوب بولے۔ انہوں نے دینا سے محبت کا اعتراف کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ اب بھی ان سے شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس سے جہاں اور کئی دل ٹوٹے ہوں گے، وہیں غالباً ان کی بیگم نے بھی نوٹس لیا ہوگا۔ جب ہی تو شادی کے بعد وہ پہلی مرتبہ کسی تقریب میں ببرک کے ساتھ نظر آئیں۔ گزشتہ دنوں لاہور میں "ایشین کچل ایکسیلنس اپوارڈ" کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں ببرک شاہ کو بھی اپوارڈ ملنا تھا۔ اس موقع پر ببرک کی بیگم بھی ان کی خوشی میں شریک ہونے (یا شاید ان پر نظر رکھنے) موجود تھیں۔ دلچسپ امر یہ ہے بیگم ببرک شاہ نہایت مہذب انداز میں مکمل ڈھکی چھپی نظر آئیں۔ (بائیں! لیکن ببرک کی پسند تو۔)

### کچھ ادھر ادھر سے

☆ کراچی میں سندھیوں کی ایک ریلی پر اندھا دھند فائرنگ سے 11 افراد مارے گئے۔ یہی وہ تشدد ہے جو شر کو پر غلایا رہتا ہے۔

☆ پاکستان کے ایک فیشن شو میں بھارتی اداکارہ کترینا شرک کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دینا اس شرط پر مل رہا تھا کہ اسے ایک حاضر منظر کے ساتھ ڈنر کرنا ہوگا۔ کترینا نے انکار کر دیا تو اسے دینا انہیں دیا گیا۔

☆ پاکستان کے الیکٹرک میڈیا کا سب سے مظلوم شکار "اسلام" ہے۔ وہ اسے جب جس وقت اور جہاں چاہے گھسیٹ کے درمیان میں لے آتا ہے۔ ایک گھنٹے کا تماشا لگتا ہے میرے ملک کے ساتھ لوگ حاکم کو پکڑ پکڑ کر لایا جاتا ہے جن سے ان تمام ظالمانہ اور جاہلانہ رسوم کو جن سے اسلام کا دور کا بھی واسطہ نہیں اسلام اور مولوی کے کھاتے میں ڈال کر بدنامی کی مہر لگا دی جاتی ہے۔

(حرف راز- اور یا مقبول جان)

☆ چیف جسٹس نے بیٹے کو انصاف کے کٹہرے میں لا کر وہ فیصلہ کیا ہے جو عرض والے کو محبوب ہے۔ وہ یہی تو چاہتا ہے کہ کسی کی محبت تمہیں انصاف سے نہ روکے۔

(حرف راز- اور یا مقبول جان)

☆ اداکارہ میرا سے میرے بیٹے کیپٹن نوید کو خطرہ ہے مجھے خدشہ ہے کہ اداکارہ میرا اپنے بھائی احسن اور والدہ شفقت زہرہ کی مدد سے میرے بیٹے کیپٹن نوید کو اغوا کر لیں گی یا اس کو جانی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔

(کیپٹن نوید کے والد کی وزیراعلیٰ پنجاب کو درخواست)

☆ ملک ریاض حسین سے ہمارے دیرینہ خاندانی تعلقات ہیں۔ ملک ریاض سیلف میڈ آدمی ہیں۔

(مسلم لیگ ق کے صدر چودھری شجاعت حسین)

☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کرپشن میں

دوبلا ہوا ہے۔ وہاں جو تپش پالش کرنے والے سے اقتدار کے ایوان میں اعلیٰ ترین مسند پر بیٹھی ہوئی شخصیت تک سب ہی کرپٹ ہیں۔

(انڈیپینڈنٹ رابرٹ فیسک)

☆ "کراچی میں بھتہ وصول کرنے والوں میں تمام ہی قسم کے لوگ شامل ہیں جن کی سرپرستی سیاسی جماعتیں اور اسٹیبلشمنٹ کرتی ہے مسئلہ یہ ہے کہ اب بھتہ لینے والے اسٹیبلشمنٹ ہولڈرز بڑھ گئے، جھگڑا اسی بات پر ہے۔"

(توصیف احمد خان)

○ لال مسجد اور اکبر بگٹی کا خون جس کے سر ہو ہم اس شخص سے کیسے اتحاد کر سکتے ہیں۔

(عمران خان کا برکھات کو انٹرویو)



### حضرت عزیر علیہ السلام

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے سو سال کے بعد دوبارہ زندہ کیا تھا، وہ حضرت عزیر علیہ السلام ہی تھے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ عزیر علیہ السلام ایک وانا اور متقی آدمی تھے۔ ایک دن اپنے بھتیگوں میں ان کی دیکھ بھال کے لیے تشریف لے گئے۔ واپسی پر ایک کھنڈر کے پاس سے گزر رہے تھے کہ دوسرے کی شدید گرمی سے بچنے کے لیے کھنڈر میں چلے گئے۔ آپ اپنے گدھے سے نیچے اتر آئے۔

آپ کے پاس ایک ٹوکری میں انجیر اور ایک ٹوکری میں انگور تھے۔ آپ نے ایک ویران عمارت کے سائے میں بیٹھ کر اپنا پیالہ لیا۔ پیالے میں انگوروں کو نچوڑ کر رس نکال لیا۔ پھر آپ نے پاس جو خشک روٹی تھی، وہ لے کر رس میں ڈال دی تاکہ وہ نرم ہو جائے تو کھالیں۔

پھر آپ دیوار سے پاؤں لگا کر چرت لیٹ گئے۔ آپ کی نظر چھت پر پڑی۔ دیکھا کہ چھت تو قائم ہے لیکن اس کے نیچے زندگی گزارنے والوں کی صرف بوسیدہ ہڈیاں موجود ہیں۔ تب فرمایا۔

ترجمہ: اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟

(البقرہ 2/259)

یہ شک کے طور پر نہیں بلکہ تعجب کے طور پر فرمایا تھا اللہ تعالیٰ نے موت کا فرشتہ بھیجا۔ اس نے آپ کی روح قبض کر لی اور آپ سو سال تک فوت شدہ حالت میں رہے۔ اس ایک صدی کی مدت میں بنی اسرائیل

کو طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔

جب سو سال گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف ایک فرشتہ بھیجا۔ اس نے آپ کا دل پیدا کیا تاکہ آپ سمجھ سکیں اور آنکھیں پیدا کیں تاکہ سب کچھ دیکھ کر سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ پھر آپ کے دیکھتے دیکھتے آپ کا جسم مبارک مکمل کیا گیا۔ ہڈیوں پر گوشت پوست اور بال بن گئے، پھر جسم میں روح ڈالی گئی اور آپ یہ سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ جب آپ اٹھ کر بیٹھ گئے تو فرشتے نے آپ سے کہا۔

"آپ کتنا عرصہ یہاں رہے؟"

آپ نے فرمایا، "ایک دن ٹھہرا ہوں یا اس سے بھی کم۔"

کیونکہ دوسرے پہلے یہاں رکے تھے اور جب اٹھے تو شام کا وقت تھا۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔

فرشتے نے کہا۔

"آپ یہاں ایک سو سال رہے ہیں۔ اپنے کھانے پینے کو دیکھیے!"

یعنی وہ خشک روٹی اور انگور کا رس دیکھا تو وہ دونوں چیزیں اسی طرح تھیں۔ رس خراب نہیں ہوا تھا اور روٹی ابھی تک خشک تھی نرم نہیں ہوئی۔

اسی لیے فرمایا۔ "بالکل خراب نہیں ہوا۔" یعنی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انجیر اور انگور بھی تازہ حالت میں تھے۔ آپ کے دل میں خیال آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، "تو فرشتے نے کہا۔

"اپنے گدھے کی طرف دیکھیے!"



دیکھا تو اس کی صرف بوسیدہ ہڈیاں بڑی تھیں۔ فرشتے نے ہڈیوں کو آواز دی تو وہ ہر طرف سے اٹھ کر آ گئیں۔ فرشتے نے انہیں عزیر علیہ السلام کے سامنے اپنے اپنے مقام پر جوڑا۔ پھر ان پر رگیں اور پٹے لگائے پھر ان پر گوشت آگیا۔ پھر جلد اور بال پیدا ہو گئے۔ پھر فرشتے نے چھوٹک ماری تو گدھا آسمان کی طرف سر اور کان اٹھا کر بولنے لگا۔ وہ سمجھا کہ قیامت آ گئی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ترجمہ۔ ”اور اپنے گدھے کو بھی دیکھ! ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بناتے ہیں اور تو دیکھ! ہم ہڈیوں کو کس طرح جوڑتے ہیں؟ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں؟“

یعنی گدھے کی ہڈیوں کو دیکھ کس طرح ایک دوسری کے ساتھ جڑتی چلی جا رہی ہیں۔ جب پورا ڈھانچا بن گیا تو فرمایا۔

اب دیکھ! ہم اس پر کس طرح گوشت چڑھاتے ہیں۔“ جب یہ سب ظاہر ہو چکا تو آپ کہنے لگے۔

”میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔“ آپ گدھے پر سوار ہو کر اپنے محلے میں آئے تو لوگوں نے آپ کو نہ پہچانا اور آپ کو بھی کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ آپ کو اپنے گھر کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ چلتے ہوئے کسی اور طرف نکل گئے آخر اپنے گھر پہنچے تو دیکھا وہاں ایک اندھی لپانچ بڑھیا بیٹھی ہوئی ہے جس کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔ وہ آپ کی لونڈی تھی۔ جب آپ گھر سے نکلے تھے تو وہ بیس سال کی تھی۔ آپ نے اس کو پہچان لیا۔ آپ نے اس سے

”اللہ کی ہندی! کیا عزیر کا گھر یہی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”ہاں! یہی عزیر علیہ السلام کا گھر ہے!“ یہ کہہ کر وہ بڑی پھر بولی۔

”مذتوں سے کسی نے عزیر علیہ السلام کا نام بھی نہیں لیا۔ لوگ انہیں بھول گئے۔“ آپ نے فرمایا۔ ”میں ہی عزیر ہوں۔ اللہ نے مجھے سو سال مرہ حالت میں رکھنے کے بعد دوبارہ زندگی دی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”سبحان اللہ! عزیر علیہ السلام تو سو سال سے لاپتہ ہیں۔ ہمیں ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“ آپ نے فرمایا ”میں ہی عزیر ہوں۔“

وہ بولی ”عزیر تو محتاج الدعوات تھے۔ ان کی دعا سے بچاؤں کو شفا ہو جاتی تھی لہذا آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تجھے آنکھیں دے دے تاکہ آپ کی زیارت کر سکیں۔ اگر آپ واقعی عزیر علیہ السلام ہیں تو میں آپ کو پہچان لوں گی۔“

آپ نے دعا کر کے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

”اللہ کے حکم سے اٹھ کر کھڑی ہو!“

اللہ نے اس کی ٹانگیں درست کر دیں۔ وہ تندرست ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آپ کے چہرہ مبارک پر نظر ڈالی اور بولی۔

”میں گوانی دیتی ہوں کہ آپ عزیر علیہ السلام ہی ہیں۔“

وہ بنی اسرائیل کے چوپال اور ان کی مجلس میں گئی۔ مجلس میں عزیر علیہ السلام کا ایک بیٹا موجود تھا جو ایک سو اٹھارہ سال کا بوڑھا تھا۔ آپ کے پوتے جو مجلس میں موجود تھے وہ بھی سب بوڑھے تھے۔ اس نے انہیں پکار کر کہا۔

”یہ دیکھو! عزیر علیہ السلام تشریف لے آئے ہیں۔“ انہیں یقین نہ آیا۔ اس نے کہا۔

”میں تمہاری فلاں لونڈی ہوں۔ عزیر علیہ السلام کی دعا سے مجھے بصارت مل گئی اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو سو سال کے بعد زندہ کر دیا ہے۔“

لوگ اٹھ کر آپ کے پاس آئے اور دیکھنے لگے۔ آپ کے بیٹے نے کہا۔

”اباجان کے کندھوں کے درمیان ایک تل تھا۔“ آپ نے کندھوں سے کپڑا ہٹایا تو وہ علامت موجود تھی۔

لوگوں نے کہا۔

”اگر یہ قوم میں عزیر علیہ السلام کے سوا کسی کو

توریت زبانی یاد تھیں تھی۔ تحریری نسخہ بخت نصر نے نذر آتش کر دیا۔ اب کسی کسی آدمی کو توریت کے تھوڑے تھوڑے اجزا یاد ہیں۔ آپ ہمیں دوبارہ توریت لکھ دیں۔“

حضرت عزیر علیہ السلام کے والد نے بخت نصر کے زمانے میں توریت ایک محفوظ مقام پر چھپا دی تھی جس کا علم عزیر علیہ السلام کے سوا کسی کو نہ تھا۔ آپ لوگوں کو دہاں لے گئے اور وہ نسخہ نکلوایا۔ اس کے درجے بوسیدہ ہو گئے تھے اور الفاظ مٹ گئے تھے۔

آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ بنی اسرائیل آپ کے آگے گرد جمع تھے۔ آسمان سے دو شاہب آئے اور آپ کے پیٹ میں داخل ہو گئے۔ فوراً آپ کو یوری توریت یاد ہو گئی اور آپ نے نئے سرے سے لکھ کر بنی اسرائیل کو دی۔ اسی لیے بنی اسرائیل نے آپ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ یہ واقعہ سواد (عراق) کے علاقے میں دیر حزقیل کے مقام پر پیش آیا۔ آپ کی وفات ساڑے آدھیں ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق قرآن پاک میں۔ اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشانی بنائیں۔“

میں ”لوگوں“ سے مراد ہے ”بنی اسرائیل“ کیونکہ جب آپ اپنے بیٹوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے آپ تو جوان ہوتے تھے اور آپ کے بیٹے بوڑھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جب فوت ہو گئے تھے تو آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ پھر جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کیا تو آپ کی حالت وہی جوانی والی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ بخت نصر کے زمانے کے بعد زندہ ہوئے۔

**حضرت عزیر علیہ السلام کا زمانہ نبوت**

مشہور قول کے مطابق عزیر علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی تھے اور آپ کا زمانہ حضرت داؤد و سلیمان علیہ السلام اور زکریا و یحییٰ علیہ السلام کے درمیان کا ہے۔ بنی اسرائیل میں کسی کو توریت یاد نہیں تھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللہ کے ذریعے

سے توریت سکھادی اور آپ نے حرف بہ حرف لکھوا دی۔

ابن عباس رحمۃ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کیوں قرار دیا؟ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کا توریت زبانی لکھنے کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا۔ ”بنی اسرائیل کہتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ہمارے پاس بغیر لکھے کتاب (توریت) نہ لاسکے، عزیر علیہ السلام بغیر تحریر کے توریت لے آئے۔ اس لیے بعض لوگوں نے انہیں ”اللہ کا بیٹا“ کہہ دیا۔ اسی لیے بعض علماء نے فرمایا کہ توریت کا قاتر عزیر علیہ السلام کے زمانے میں منقطع ہو گیا۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام اور بخت نصر ایک ہی دور میں تھے۔ صحیح بخاری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”ابن مریم علیہ السلام کے ساتھ سب سے قریبی تعلق میرا ہے۔ انبیائے کرام ایک باپ کی اولاد ہیں۔ میرے اور ان (عیسیٰ) کے درمیان کوئی بی نہیں۔“

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔ ”حضرت عزیر علیہ السلام کا زمانہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ایک نبی کسی دوخت کے نیچے ٹھہرے۔ انہیں ایک چوٹی نے کاٹ لیا۔ آپ نے ان چوٹیوں کو نکلا کر آگ سے جلوا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ ”کیوں نہ ایک ہی چوٹی کو سزا دی؟“

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام کا ہے۔ (واللہ اعلم)

✽





## موم کے پکوان

خالہ جیلانی

### بھیل پوری

آدھا کلو  
ایک پاؤ  
ایک پاؤ  
آدھی کھجور  
چار عدد  
دو کپ  
چار کھانے کے چمچے  
چھ عدد

اجزا :  
آلو  
سیو  
بھنی چنے کی دال  
ہرا دھنیا  
ہری مرچ  
اے لے کا پی پنے  
لیموں کا رس  
پاڑی  
ترکیب :

دش میں سیو، چنے کی بھنی ہوئی دال، اے لے ہوئے  
کالی چنے اور آلو (اہل کرچو کو کٹ لیں) ڈالیں۔  
پاڑی کو چورا کر کے ڈال دیں، پھر ہرا دھنیا اور ہری  
مرچیں کتر کر ڈالیں اور لیموں کا رس ملا کر چمچے سے  
خوب اچھی طرح مکس کریں۔

ایک کپ دہی میں ایک چائے کا چمچ چینی، آدھا  
چائے کا چمچ لٹا ہوا زیرہ اور حسب ذائقہ نمک ملا کر  
چھنی تائیں۔  
ایک کپ اہلی کے گوڑے میں ایک چائے کا چمچ  
چینی، آدھا چائے کا چمچ کٹی ہوئی مرچ اور حسب ذائقہ  
نمک ملا کر اہلی کی چھنی تائیں۔  
ان دونوں چھنیوں کو بھیل پوری کے اوپر ڈال کر ہلکے  
ہاتھ سے مکس کریں اور مزے دار بھیل پوری سے  
لطف اٹھائیں۔

### ملکھی ملائی ہانڈی

اجزا :  
چکن  
لسن اور ک پیسٹ  
پیاز بڑی  
کریم  
کھن  
سفید مرچ پاؤڈر  
ایک کلو  
دو کھانے کے چمچے  
تین عدد  
ایک کپ  
چار کھانے کے چمچے  
دو چائے کے چمچے

اجزا :  
چکن  
لسن اور ک پیسٹ  
پیاز بڑی  
کریم  
کھن  
سفید مرچ پاؤڈر

ایک کھانے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچے  
آدھی کھجور  
حسب ذائقہ  
ایک کپ

ترکیب :

بغیر ہڈی کے چکن میں زیرہ، آدھی کریم، آدھا دہی،  
سفید مرچ، لسن اور ک پیسٹ، لیموں کا رس، ہری  
مرچ (کٹ کر) اور ایک چوتھائی کپ تیل ڈال کر مکس  
کریں اور دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب یا تو اسے سب  
پر چڑھا کر کوئلے پر سینک لیں یا اسی تیل میں فرائی  
کر کے کوئلے کا دم دے دیں۔  
الگ پتیلی میں باقی تیل گرم کریں۔ پیاز کو پیس کر  
بھونیں، پھر بقیہ دہی، نمک، ایک چمچ سفید مرچ ڈال کر  
فرائی چکن بھی ڈال دیں۔ تیل الگ ہو جائے تو کریم  
مکس کر کے پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ  
دیں۔

دش میں نکالتے وقت کھن ڈال دیں اور کٹری  
ہوئی ہری مرچ اور ہرے دھنیے سے سجاوٹ کر کے پیش  
کریں۔

### خوبانی کا میٹھا

آدھا کلو  
آدھا پاؤ  
ایک چوتھائی چائے کا چمچ  
حسب مرضی

اجزا :  
خوبانی  
انجیر  
الائیچہ پاؤڈر  
فریش کریم  
ترکیب :

خوبانی اور انجیر میں دو کپ پانی اور الائیچہ پاؤڈر ڈال کر  
آدھے گھنٹے تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ ٹھنڈا ہونے پر  
میش کریں۔ دش میں نکال کر فریش کریم سے سجاوٹ  
کریں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔  
(گرم کھانے کی صورت میں کریم نہ ڈالیں)

فالے کا مشورت

اجزا :  
فالے  
چینی  
کالا نمک  
لیموں کا رس  
پودینے کے پتے  
ترکیب :

آدھا کلو  
ایک پاؤ  
ایک چائے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچے  
چند عدد

فالے دھو کر آدھے گھنٹے کے لیے پانی میں بھگو  
دیں۔ پھر پانی سے نکال کر میش کریں اور بیج الگ  
کریں۔ گوڑے میں کالا نمک اور چینی ڈال کر گرائنڈ  
کریں۔ پانی ملا کر ایک بار اور گرائنڈ کریں، پھر گلاسوں  
میں نکالنے سے قبل لیموں کا اس بھی شامل  
کریں۔ پیش کرتے وقت پودینے کے پتوں سے  
سجاوٹ کریں۔  
گرمیوں کا فرحت بخش مشروب تیار ہے۔  
ڈبل روٹی کا حلوہ

اجزا :  
بڑی ڈبل روٹی  
چینی  
بادام پستے  
سبز الائچی  
سکھش  
2 عدد  
3 پاؤ  
حسب ضرورت  
8 عدد  
آدھی پیالی  
1 پیالی

چینی میں ایک لیٹر پانی ڈال کر خوب جوش دیں تاکہ  
ایک تار کا قوام بن جائے، پھر ٹھنڈا کر لیں۔ ڈبل  
روٹی کو توڑے پر ہلکا سا سینک کر باریک ٹکڑے کر لیں۔  
ایک کڑا ہنی میں کھجور گرم کریں۔ الائیچہ کٹے ہوئے  
بادام پستے اور سکھش ڈال دیں۔ جب سکھش پھول  
جائے تو ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈال دیں۔ سرخ ہو  
جائیں تو شیرہ ڈال دیں۔ شیرہ اتنا ہونا چاہیے کہ ڈبل  
روٹی ڈوب جائے۔ چمچے سے خوب مکس کریں اور  
چاندی کے ورق لگا کر پیش کریں۔





ادارہ

## حصولِ عرصہ

موسموں کی تبدیلی اور شدت ہماری صحت اور مزاج پر خاصی اثر انداز ہوتی ہے۔ خاص طور پر ہماری جلد نازک ہونے کے باعث موسم کے اثرات بہت جلدی قبول کرتی ہے۔ لہذا موسم کو مد نظر رکھتے ہوئے جلد کی مناسب دیکھ بھال بے حد ضروری ہے۔

موسم گرمیاں دھوپ اور گرم ہوا میں جلد کو سنولا دیتی ہیں۔ اس موسم میں سن بلاک کا استعمال لازمی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ سن بلاک صرف گھر سے باہر نکلتے وقت ہی لگایا جائے۔ تاہم یہ درست نہیں۔ آپ گھر میں ہوں یا باہر، موسم کی حدت جلد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لہذا دن کے وقت روزانہ سن بلاک ضرور لگائیں۔ گھریلو خواتین خاص طور پر چولے کے پاس جانے سے پہلے سن بلاک لازمی لگائیں۔

ذیل میں سن بلاک اور گھر میں آسانی سے تیار ہونے والے چند ماسک بتائے جا رہے ہیں، جن کا استعمال آپ کی جلد کو موسم گرمیاں بھی شگفتہ اور تروتازہ رکھے گا۔

☆ ایک چھوٹے ٹماٹر کا گودا نکال کے چرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ یہ عمل روزانہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سے دھوپ اور گرمی سے جھلی ہوئی جلد نکھر جاتی ہے۔

☆ جو کا آٹا، دی اور ٹماٹر کا گودا برابر مقدار میں لے کر پیسٹ بنالیں۔ چرے پر لگائیں اور پھر بیس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ یہ ماسک دھوپ سے سنولائی ہوئی جلد کی رنگت بحال کرتا ہے۔

☆ صندل پاؤڈر اور تھوڑے سے عرق گلاب کا ہلکا پیسٹ بنا کر چرے پر لگوان اور جلد کے تمام کھلے حصوں پر لگائیں۔ یہ پیسٹ بہترین سن بلاک کا کام دے گا۔

☆ پودینے کی تازہ پتیاں پیس کر چرے پر لگائیں۔ چند روزہ منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ جلد کی رنگت کھل اٹھے گی۔

☆ پودینے کی تازہ پتیاں چار گلاس پانی میں ابل لیں۔ ٹھنڈا کر کے ایک بڑی اسپرے بوتل میں بھریں۔ سارا دن تھوڑی تھوڑی دیر بعد چرے پر اسپرے کرتی رہیں۔ جلد نکھری نکھری نظر آئے گی۔ چاہیں تو بوتل کو فریج میں رکھ لیں، ورنہ کسی بھی ٹھنڈی جگہ رکھ سکتی ہیں۔

☆ کھیرے کا رس، لیموں کا رس، ایلو ویرا کا گودا، کھانے کا ایک ایک چمچ لے کر اس میں چائے کا ایک چمچ شہد بھی شامل کر دیں۔ اچھی طرح ملا کر چرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ جلد صاف شفاف اور ہموار نظر آئے گی۔

☆ تھوڑی سی ہلدی، لیموں کے رس میں ملا کر چرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد ہلکے ہاتھوں سے رگڑ کر اتار لیں اور پھر چہرہ سادہ پانی سے دھو لیں۔ رنگت نکھر جائے گی۔

☆ پودینے کی پتیاں یا صندل پاؤڈر یا صنوبر یا تھام کے پتوں میں سے کوئی ایک چیز اپنے غسل کے پانی میں ڈال لیں۔ اس پانی سے غسل آپ کو ایک فرحت بخش احساس عطا کرے گا۔

☆ تھوڑی سی دی میں ہلدی ملا کر چرے پر لگائیں۔ خشک ہو جائے تو ہاتھ کیلے کر کے نرمی سے رگڑتے ہوئے اتار لیں۔ پھر سادہ پانی سے چہرہ دھو لیں۔ یہ عمل جلد کو صاف شفاف کرتا ہے۔

☆